
فیض احمد فیض نمبر
ماہنامہ
کراچی
قیمت ۲۰ روپے



ترقی
ہماری ساری توانائی کا مصرف ہماری ساری توجہ کا مرکز
نیشنل
فاسفیرز
انسٹی
بایوٹکس
اتحاد
کیمیکلز
راوی ایسٹ
پاک ڈائز
اینڈ کیمیکلز
راوی انجینیرنگ
راوی ریان
پاکستان
پی وی سی
سوات
سرامکس
خرم
کیمیکلز
نوشہرہ پی وی سی
سوات
ایلونریشن
سیکا
نوشہرہ
کیمیکلز
سندالکالیز
اتحاد
پیسٹی سائیڈ
فیڈرل کیمیکل اینڈ
سرامکس کارپوریشن لمیٹڈ
FCCCL



فیض نمبر



آہنگ

دورِ ۱۹۸۵ء (اشاعت خصوصی)

شمارہ ۱۲،۵ جلد ۱۰

قیمت : ۲۰ روپے

مدیرہ
راشدہ طلعت

ایسوسی ایٹ ایڈیٹر
ارشد علی مرزا

نائب مدیرہ
درشاہین

اہتمام و انصرام
خیام صدیقی

شعبۂ اشتہارات
عامر علی

قانونی مشیران
ایم ایل شاہانی، شفیع محمدی

ناشر
عزیز الرحمان

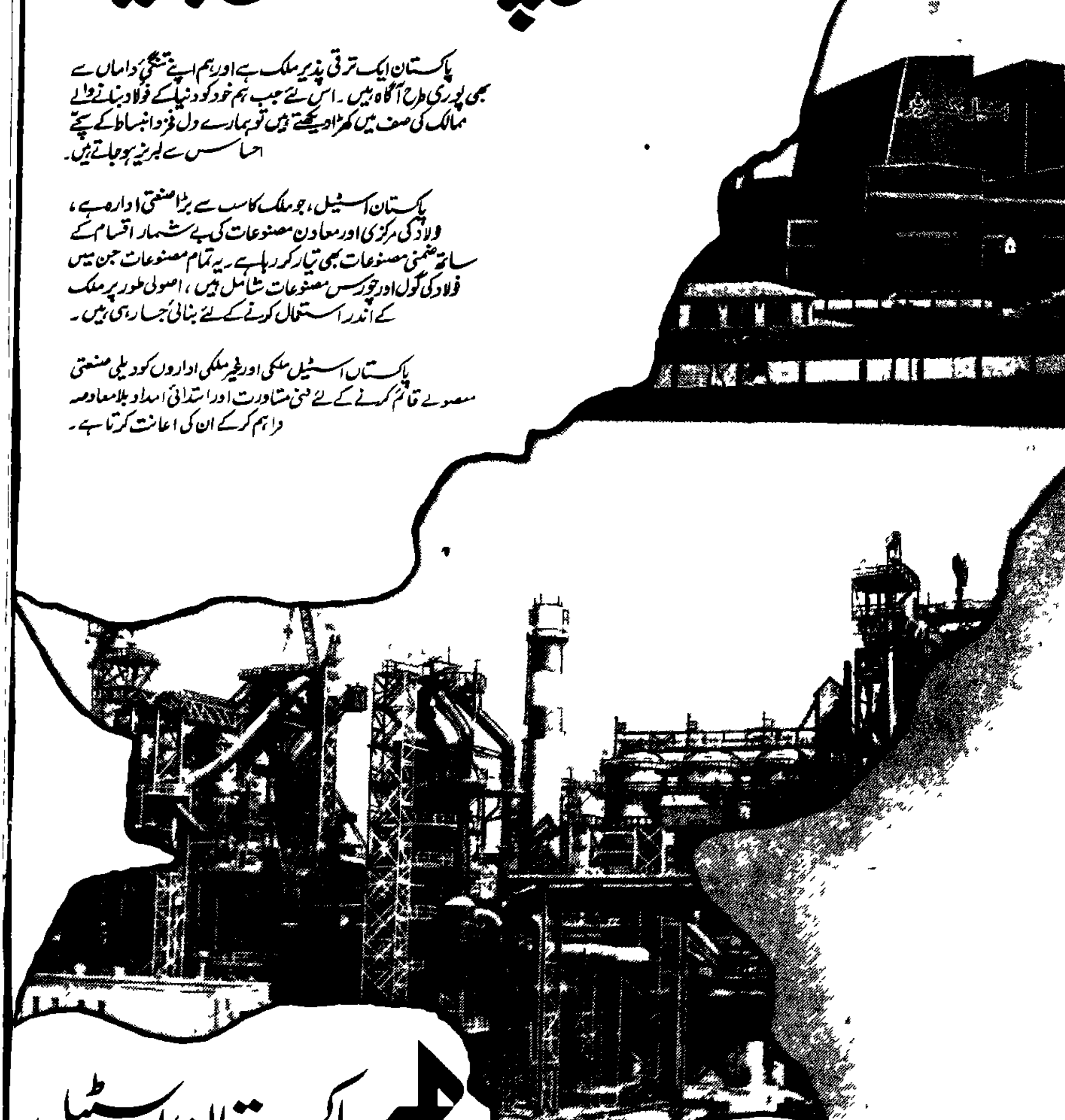
طابع
فیض الحق حقی

حقی آرٹ پرنٹنگ پریس
لیاقت آباد ۔ کراچی

مقام اشاعت
۵/۶۹ ڈی ۔ رسری
پی ای سی ایچ ایس، کراچی
فون ۴۳۱۵۸۷









نیا ورق

نصف صدی سے کچھ زیادہ عرصہ تک برصغیر پاک و ہند کے عوام فیض احمد فیضؔ سے امن و آزادی، انسان دوستی اور محبت کے نغمے سنتے رہے۔ وہ زنداں کی اداس شام ہو، محبت دلبراں ہو یا محفل اہل جنوں، فیض کی دلنوازی نے ہر جگہ رجائیت کے نئے باب کھولے۔ ظلمت کدوں میں دم توڑتی ہوئی خواہشات ان کے جلو میں نئے جذبوں سے ہمکنار ہوئیں۔

وہ جدوجہد کے ایسے پیامبر تھے جنہوں نے امید اور عرضِ تمنا کا دروازہ کبھی بند نہ کیا ہر کوئے جفا میں اُن کی جہد مسلسل کی داستاں دہرائی جاتی رہے گی۔

ان کا خیال نغمہ و شعر میں ڈھلے یا فکر ادب و فن کو نئے قالب عطا کرے۔ فیض کا اپنا رنگ اور خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ بھینی بھینی سی ٹھہری ہوئی اپنی تمام تر گھمبیرتا سے آہستہ آہستہ دلوں میں اترتی ہوئی آنکھوں میں نئے منظروں کو جنم دیتی ہے۔

بیروت کی بارود سے مکدر فضا ہو یا زنداں کی بیزار کن رات ان کے مسکراتے ہوئے سخن نے ہر جگہ نئے چاند اُتار دیئے۔

آج تک جو بھی لفظ اُن کے لب تک آیا یا پھر کاغذ پر سجا یا کسی دوست، کسی چاہنے والے یا پھر کسی دانشور نے اُن کے بارے میں کچھ کہا، کچھ سنا۔ ان سب کلفتوں، خوشیوں اور تنہائیوں کو ایک جگہ سمیٹ کر یہ انتخاب فیض نمبر کی صورت میں یکجا کرنے کی سعی کی گئی ہے جو کچھ بھی اس میں پیش کیا گیا ہے وہ صدق دل سے اس عقیدت کا اظہار ہے جو لاکھوں دلوں کے جلو میں فیض کی مدد کر رہے ہیں۔

فیض کیا تھے۔ جو کچھ بھی تھے۔ وہ سب کچھ نہیں تھے۔ جس طرح کہ آج ان کی تصویر کشی وہ لوگ کر رہے ہیں جو ان کی زندگی میں اُن کے بارے میں کوئی کلمہ دعائیہ کہنے سے کسی وجہ سے قاصر رہے۔

لیکن چند ایک احباب ایسے بھی ہیں جو ہر دور میں ان کے ہمرکاب رہے۔ وہ آج اس کاوش میں ہمارے ساتھ ہیں شاید ان کے لئے ہی فیض نے کہا تھا ؎

تم جو واقف ہو بتا دو کوئی پہچان میری

فیض احمد فیضؔ نمبر کی تیاریاں دسمبر ۱۹۸۴ء سے ہی شروع کر دی گئی تھیں۔ برادرم الطاف احمد قریشی اس کے محرک تھے۔ انہوں نے لاہور سے مضامین بھجوائے اور اس طرح کام باقاعدہ شروع ہو گیا لیکن اس نمبر کی ترتیب کے دوران ایسے مراحل بھی درپیش آئے کہ احباب کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو اس کی اشاعت میں نہ صرف تاخیر ہوتی بلکہ یہ اس قدر مستند دستاویز نہ ہوتی۔ ان احباب کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ فرداً فرداً تذکرہ کرنا ممکن نہیں تاہم ان کی سب کی شکر گزار ہوں اور بالخصوص برادرم اشفاق سلیم مرزا کی انتہائی ممنون ہوں کہ انہوں نے اس نمبر کی ترتیب میں نہ صرف اپنے مفید اور فاضلانہ مشوروں سے نوازا بلکہ رات دن اس کی تدوین میں مصروف رہے۔

میں ایک بار پھر اس نمبر کی ترتیب، اشاعت اور تدوین میں ادارے کی سرپرستی کرنے والے تمام کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اجازت چاہوں گی۔

(راشدہ طلعت)





Axminster & Wilton
CARPETS

Enliven homes in five continents

PURE NEW WOOL

United Carpets Limited has the distinction of receiving from the International Wool Secretariat, London, Pakistan's first ever "WOOL MARK" for their Axminster and Wilton Woollen Carpets made of 100% Pure New Wool

UNITEX Axminster Wilton

The hallmark of one of the best international standards of weaves in all wool Axminster and Wilton carpets Available in plain designed and centre piece carpets admired in five continents where their demand excels supply

Made in Pakistan only by

United Carpets Ltd.

HEAD OFFICE Chartered Bank Chambers, I I Chundrigai Road, Karachi (Pakistan)
Phone 221741, Telegrams 'UNICARPETS" Telex No KR 2743
SHOWROOM Sea Breeze Plaza, Opp Aisha Bawany Academy Shahrah e Faisal Phone 523269 522546
Al Haroon Chambers, Garden Road, Karachi Phone 726029 726121
FACTORY E/15 A SITE Karachi 16 Phone 294315/6



نقد فيض
نظر فيض



فیض صاحب کی اچانک وفات پر ملک کے گوشے گوشے میں اور دوسرے ملکوں میں بھی جس گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا وہ ان کے دشمنوں کے لئے باعث حیرت ہو تو ہو گا [illegible] برطانیہ، کینیڈا، امریکہ، فرانس، مشرقی اور مغربی جرمنی، ہالینڈ، سویڈن [illegible] ہندوستان غرضیکہ شاید ہی کوئی خطہ ہو جہاں فیض صاحب کا سوگ منایا گیا ہو۔ تعزیتی جلسوں میں جو تقریریں ہوئیں جو مقالے پڑھے گئے اور اس دوران اخباروں اور رسالوں میں ان کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر جو توصیفی اور تاثراتی مضامین شائع ہوئے ہیں اُن سب کو اگر یکجا کیا جائے تو کئی دفتر تیار ہو سکتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ان حلقوں کو بھی [illegible] فیض صاحب کو خراج عقیدت پیش کرنا پڑا جو اُن کے مسلک سے سخت مخالف ہیں۔



فیض کا آدرش

سید سبط حسن

فیض صاحب کی اس بے پناہ مقبولیت کا اصل سبب یوں تو اُن کا کلام ہی ہے جس نے ایک عالم کو اُن کا گرویدہ بنا لیا لیکن اُن کی ہر دلعزیزی میں اُن کی شخصیت کی مقناطیسیت بھی شامل ہے اور وہ خدمات بھی جو فیض صاحب نے ہماری تہذیب کی اصلاح اور ترقی کی خاطر سرانجام دیں۔ اُن کے مزاج کی نرمی اور مٹھاس، اُن کا دھیما لہجہ، اُن کی مسکراہٹ، اُن کی شائستگی، دوسروں کی دل آزاری اور عیب جوئی سے پرہیز، اُن کا پروقار ضبط و تحمل، اُن کی کسر نفسی اور ملنساری، ظلم و جبر کی سختیوں کو ہنس ہنس کر برداشت کرنے کی قوت اور اپنے اصولوں کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی کا جذبہ، اُن کے وہ اوصاف تھے جن کی وجہ سے ہر طبقے، ہر فرقے کے لوگ اُن کی عزت کرتے تھے۔

فیض صاحب کی شخصیت بڑی پہلودار تھی۔ اُنہوں نے شعر و شاعری کے علاوہ اور بہت سے کام بھی کئے اور جس کام میں ہاتھ ڈالا اُس کو ایسے سلیقے سے سرانجام دیا کہ اُن کی جگہ پھر کبھی پُر نہ ہوئی۔ اُنہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کالج میں انگریزی پڑھانے سے کیا۔ پہلے امرتسر میں، پھر لاہور میں اور آخر میں ہارون کالج کراچی میں۔ وہ نہایت مشفق استاد تھے اور اپنی لیاقت اور حسنِ اخلاق کے باعث اساتذہ اور طلبا میں یکساں مقبول تھے۔ جس وقت فیض صاحب ہارون کالج کراچی کے پرنسپل ہوئے تو کالج پر نزع کا عالم طاری تھا۔ عمارت خستہ حال اور بے سر و سامان اور لیاری کے نہایت پس ماندہ علاقے کے نادار اور بے یار و مددگار غریب طلبا۔ نہ اُن میں تحصیل علم کا شوق نہ اساتذہ میں تدریس کی لگن مگر فیض صاحب نے تھوڑے ہی عرصے میں اپنی محنت اور ذہانت سے کالج کا نقشہ ہی بدل دیا اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کالج ایک زندہ اور فعال ادارہ بن گیا۔

فیض صاحب نے جب اخبار نویسی شروع کی اور پاکستان ٹائمز کے اڈیٹر مقرر ہوئے تو اُن کے جوہر اور کھلے۔ اُن کے اداریے صائب رائے کے علاوہ ادبی شہ پارے بھی ہوتے تھے جن کو ہر شخص مزے لے لے کر پڑھتا تھا۔ اُنہوں نے اپنے حسنِ سلوک سے صحافیوں کی ایک ایسی ٹیم اپنے گرد جمع کر لی تھی جو اخبار کی صوری اور معنوی خوبیوں کی دُھن میں دن رات لگی رہتی تھی۔ فیض صاحب نے اپنے زمانے میں صحافتی اخلاق کا جو معیار قائم کیا تھا اور جس جرأت سے وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے اُس کو لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں۔ وہ فلمی صنعت سے وابستہ ہوئے تو اُن کی نگرانی میں ایسی لاجواب فلمیں بنیں کہ ہر جگہ اُن کی دھوم مچ گئی۔ انہوں نے الحمرا کا نظم و نسق سنبھالا تو جس ویرانے میں اُلّو بولتے تھے اس کے در و دیوار رقص و ساز کی آوازوں سے گونجنے لگے اور الحمرا لاہور کا سب سے سرگرم تہذیبی مرکز بن گیا۔ اب جس فنکار، جس ادیب کو دیکھو الحمرا کی طرف کھنچا چلا جا رہا ہے۔ کسی کمرے میں ڈرامے کی ریہرسل ہو رہی ہے، کسی گوشے سے گانے کی آوازیں آ رہی ہیں اور کسی ہال میں تصویروں کی نمائش لگی ہوئی ہے۔

اُن کو عوامی تہذیب کی روایتیں بھی بہت عزیز تھیں چنانچہ انہیں کی کوششوں سے اسلام آباد میں عوامی تہذیب کے نوادروں کے تحفظ کے لئے پہلی بار ایک ادارہ قائم ہوا اور فیض صاحب اس کے سربراہ مقرر ہوئے۔ انہوں نے اپنے مختصر دور میں دیہات کے ہزاروں گیت اور گانے ریکارڈ کروائے، دیہاتی ساز جمع کئے، ملک کے ہر خطے کی دیہی دستکاریوں اور گھریلو صنعتوں کے نادر نمونے اکٹھا کئے اور اُن کی نمائش کی۔ اسی دوران ملک کے تہذیبی



مسائل پر غور کرنے کے لئے انہوں نے ایک کمیٹی تشکیل دی اور اس کی رپورٹ جو بڑی محنت سے تیار کی مگر اس رپورٹ کی تجویزوں پر عمل کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی اور آخر کار رپورٹ کا وہی حشر ہوا جو سرکاری رپورٹوں کا عموماً ہوتا ہے۔ فیض صاحب نے ٹی وی پر تہذیبی اُمور پر مذاکروں کا ایک سلسلہ بھی شروع کیا تھا مگر تہذیب دشمن افسروں کے حکم سے بند ہو گیا۔

فیض صاحب کا شمار پاکستان میں ٹریڈ یونین تحریک کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ وہ کئی برس تک ڈاک اور تار کے ملازمین کی انجمن کے صدر بھی رہے۔ اُن کے گھر پر اور بعض اوقات پاکستان ٹائمز کے دفتر میں مزدور کارکنوں کا ہجوم رہتا تھا اور وہ اخبار میں ان کے مطالبات کی حمایت میں اداریے لکھا کرتے تھے۔ انہوں نے دو ایک بار بین الاقوامی کانفرنسوں میں مزدوروں کی نمائندگی بھی کی انہیں کی دوڑ دھوپ کا نتیجہ تھا کہ حکومت پاکستان نے آئی ایل او کی بہت سی تجویزوں کو منظور کر لیا۔ اب تو نہ فیض صاحب رہے نہ وہ تحریریں

آج کل تو وہ حکومتیں بھی امن کی دہائی دیتے نہیں تھکتیں جو دن رات جنگی تیاریوں میں مصروف رہتی ہیں بلکہ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب سامراج نواز ملکوں میں امن کا نام لینا جرم سمجھا جاتا تھا۔ اسی قدغن کے باوجود جنگی تیاریوں کو رد کرنے اور دنیا کو ایٹمی ہتھیاروں کی ہلاکت خیزیوں سے محفوظ رکھنے کی عالمگیر مہم جب شروع ہوئی اور دوسرے ملکوں کی مانند پاکستان میں بھی امن کمیٹی بنی تو فیض صاحب ہی اُس کے صدر چنے گئے۔ وہ امن کمیٹی کی سرگرمیوں میں بڑی شدت سے شریک ہوتے اور لاہور، اوکاڑہ، گوجرانوالہ، لائل پور غرضیکہ جہاں کہیں امن کمیٹی کا جلسہ ہوتا اس میں تقریر کرتے اور لوگوں کو بتاتے کہ پاکستان کی آزادی، بقا اور ترقی کے لئے امن کیا ضروری ہے کیونکہ ان کے بقول "امن گندم کے کھیت ہیں اور سفیدے کے درخت، دلہن کا آنچل ہے اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ، شاعر کا قلم ہے اور مصور کا موقلم"

ان کا کہنا تھا کہ پرانے زمانے کی جنگوں اور آج کل کی جنگوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پرانے زمانے میں جب لوگ تلوار بندوق سے لڑتے تھے تو تباہی ضرور آتی تھی لیکن اس کا دائرہ بہت محدود ہوتا تھا اور آبادی کا بہت ہی مختصر حصہ اس سے متاثر ہوتا تھا۔ جس فریق نے میدان جنگ میں شکست کھائی وہ تاج و تخت سے محروم ہوا۔ ملک کی جان اقتدار فاتح کے قبضے میں آ گئی اور زندگی بدستور پرانے ڈگر پر چلنے لگی۔ لیکن آج امن کے معنی ہیں نوعِ انسان کی بقا اور ایٹمی جنگ کے معنی ہیں کرۂ دنیا ملبے کا ڈھیر ہو جائے اور انسان، جانور، برگ و شجر کسی کا سرے سے وجود ہی باقی نہ رہے اور جنگی تیاریوں اور اسلحوں کی اس دوڑ میں فائدہ کس کو ہوتا ہے۔ اسلحہ بنانے والی بڑی بڑی کمپنیوں کا اور اُن کی حکومتوں کا۔ ایسی ہی طاقت کے بل پر دوسرے ملکوں پر غلبہ حاصل کرتی ہیں لہٰذا فیض صاحب کے بقول امن کی جدوجہد اور آزادی کی جدوجہد ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ جو امن کا دوست ہوگا وہ لامحالہ آزادی کو بھی عزیز رکھے گا اور جو امن کا دشمن ہوگا وہ آزادی کا بھی دشمن ہوگا ترقی یافتہ ملکوں کا تو ذکر ہی کیا افسوس اس کا ہے کہ پسماندہ اور ترقی پذیر ملک بھی اسلحوں کی اس دوڑ میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں حالانکہ یہی رقم اگر فلاحی کاموں پر صرف ہو تو علم کی روشنی سے ہر اندھیر گھر نور ہو جائے، بے گھروں کو سر چھپانے کا آرام سے رہنے کی سہولتیں میسر ہوں اور دوا علاج کیلئے ترستے ہیں ان کی بیماریاں دور ہو جائیں

فیض صاحب کی شاعری پر غور کرتے وقت ان کے شوق وابستگی کے ان پہلوؤں کو ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے کیونکہ ان کے محسوسات کا خمیر انہیں تجربوں سے اٹھا ہے

۲

اردو زبان خوش قسمت ہے کہ اُس نے معاشرتی زندگی کے ہر اہم موڑ پر ایسے صاحب کمال پیدا کئے جو اپنے عہد کی پہچان اور روحِ عصر کے ترجمان ثابت ہوئے۔ ولی دکنی اور نظیر اکبر آبادی، میر تقی میر اور مرزا سودا، غالب اور سر سید احمد خان، علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی سب نے یہ تاریخی خدمت سر انجام دی۔ فیض احمد فیض دورِ حاضر میں دُکھی انسانیت کے ضمیر کی آواز ہیں۔ ایسی آواز جو نغمہ بھی ہے، للکار بھی، جس میں سوز یقین بھی ہے اور غمِ زمانہ کا درد بھی، جہد و انقلاب کی گھن گرج بھی ہے اور حُسن و جمال کی شیرینی بھی

فیض صاحب نے شعر کہنا یوں تو کالج کے زمانے ہی میں شروع کر دیا تھا لیکن اُن کے فکر و فن میں انقلابی تبدیلی ۱۹۳۵ء میں آئی۔ انسانی تاریخ کا وہ بڑا پُرآشوب اور ہیجانی دور تھا۔ عالمی کساد بازاری نے دنیا کو شدید اقتصادی بحران میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس بحران کی وجہ سے ہندوستان کی نوآبادیاتی معیشت کی حالت اور بھی دگرگوں تھی۔ چنانچہ فیض صاحب کے بقول "کالج کے بڑے بڑے لڑکے تیس مار خاں تلاشِ معاش میں گلیوں کی خاک پھانکنے لگے۔ یہ وہ دن تھے جب یکایک بچوں کی ہنسی بجھ گئی، اُجڑے ہوئے کسان کھیت کھلیان چھوڑ کر شہر میں مزدوری کرنے لگے اور اچھی خاصی بہو بیٹیاں بازار میں آ بیٹھیں" ملک کا یہ حال تھا اور یورپ میں فاشزم کا عفریت آگ اور خون کی ہولی کھیل رہا تھا۔ ہٹلر نے جرمنی میں برسرِ اقتدار آتے ہی جمہوریت پسند سیاستدانوں اور روشن خیال ادیبوں، مفکروں، موسیقاروں اور سائنس دانوں سب پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ جو دار و رسن سے بچے اُن کو بھاگ کر سوویت روس اور امریکہ میں پناہ لینی پڑی۔ ارنسٹ ٹولر، آئن سٹائن، رونگ، تھامس مان اور ہنرک مان، برانڈ اور آئن سٹائن سب ملک بدر ہوئے۔ اسی اثنا میں مسولینی نے حبش پر حملہ کر دیا۔ اس جارحانہ اقدام پر مجلس اقوام میں بہت شور مچا لیکن مسولینی کو برطانوی اور فرانسیسی حکومتوں کی پشت پناہی حاصل تھی لہٰذا مشرق کے ایک بے بس ماندہ ملک کی فریاد کا کوئی اثر نہ ہوا اور اٹلی نے حبش پر قبضہ کر لیا

ان واقعات نے دنیا بھر کے حریت پسند ادیبوں کو چونکا دیا اور ان کو محسوس ہونے لگا کہ آزادی اور جمہوریت کے دشمنوں کا اگر جم کر مقابلہ نہ کیا گیا تو پھر درستی لوح و قلم کے امکانات باقی نہ رہیں گے۔ فیض صاحب جیسے حساس شاعر کا ان حالات سے متاثر ہونا قدرتی بات تھی چنانچہ انجمن ترقی پسند مصنفین سے اپنی وابستگی کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"جب ہم ۱۹۳۵ء میں امرتسر (ایم اے او کالج) میں پڑھاتے تھے تو ہمارے ساتھ ایک ہمارے رفیق کار تھے رام پور کے جن کا نام تھا صاحبزادہ محمود الظفر اور ان کی بیگم تھیں ڈاکٹر رشیدہ جہاں۔ محمود الظفر نے ہم سے کہا کہ ہم نے لندن میں ایک ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی ایسوسی ایشن قائم کی ہے اور اب ہم چاہتے ہیں کہ یہ تنظیم ہندوستان میں بھی قائم ہو جائے کیا تمہیں اس میں کچھ دلچسپی ہے تو ہم نے کہا ہاں! ہم ضرور اس میں کام کریں گے۔ یہ ہمارے شباب کا دور تھا اور مرضِ عشق بھی لاحق تھا۔ رشیدہ جہاں نے کہا



محبوب وہ ماشوق کے حکم وغیرہ یہ سب فضول باتیں ہیں دنیا کے دکھ درد میں ان کی نوعیت
زیادہ سنگین ہے یہ تمہارا عاشق کا چھوٹا سا معاملہ ہے اور اسی لئے ہمیں سکھایا کہ اپنا
غم دنیا کے مقابلے میں بہت معمولی سی چیز ہے دنیا بھر کے دکھ دیکھ اور اپنے لوگوں اور اپنی قوم
اور اپنے ملک کے اُن کی بہبود کے بارے میں سوچنا چاہئے کہ اپنے لئے ہی سوچتے رہو گے

یہ تو خود غرضی ٹھہری۔ ہمارا یہ شعر اسی زمانے کی یادگار ہے:

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

وہ سوچتے ہیں یہ دنیا "صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم" میں کیوں گرفتار ہے، یہاں
کوچہ و بازار میں جسموں کی خرید و فروخت کیوں ہوتی ہے اور:

یہ حسین کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لئے ان میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے

لیکن وہ ترک عاشقی پر ہرگز آمادہ نہیں۔ ہجر و فراق کی گھڑیاں اُن پر اب بھی
گراں گزرتی ہیں:

ویراں ہے میکدہ، خم و ساغر اُداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

شاعر بالآخر اس ذہنی کشمکش کا حل تلاش کر لیتا ہے اور اس پر
یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ غم ذات غم زمانہ ہی کا ایک رُخ ہے لہٰذا "کیوں نہ
جہاں کا غم اپنا لیں۔" وہ جانتا ہے کہ اس راہ میں "دل پڑے گا، سر پھوٹیں گے، خون
بہے گا، مگر" پاپ کے پھندے، ظلم کے بندھن ٹوٹیں گے اور "خون میں غم بھی بہہ جائیں
گے" کیونکہ جو قوتیں غم ذات کا سبب ہیں وہی معاشرے کی گرد دل کا سنگ گراں بھی ہیں
غم ذات نے جب غم زمانہ کا امرت پی لیا تو شاعر کا عشق دو آتشہ ہو گیا۔

اس عشق نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل پہ بجز داغ ملامت

۳

فیض صاحب حُسن و محبت کے شاعر ہیں اُن کی آدرش دنیا میں حسن و محبت
کی فرماں روائی ہے زندگی کے حُسن سے لطف اندوز ہونے کا جذبہ، غم ذات اور غم زمانہ
سے اُن کا گہرا لگاؤ، اُن کی انسان دوستی اور حب الوطنی اُن کی انقلاب پسندی اور
آرزو مندی سب درد عشق ہی کے استعارے ہیں اور عشق جو اُن کے طرز فکر و احساس کی روح
ہے اور جس کی بدولت وہ اپنے دل کی جانب ویرانی کو حسن دو عالم کے جلووں سے معمور کرتے ہیں
مگر دیکھنا یہ ہے کہ فیض صاحب کا تصور حُسن و محبت صوفیائے کرام کے روایتی تصور
ہی کا پرتو ہے یا اُس کے عوامل اور مضمرات سماجی ہیں وہ ادب برائے ادب کے پیغمبر اور
وجودی فلسفی کیرکے گارڈ کے اس قول سے اتفاق نہیں کرتے کہ جمالیاتی اور سماجی قدریں
جدا جدا ہوتی ہیں شاعر کیٹس کے اس مشہور مقولے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہ
حسین شے مسرت جاوداں ہے فرماتے ہیں کہ "شاعر کیٹس کچھ ہی کہے حسن سے صحیح راحت
جبھی ہم پہنچ سکتی ہے جب وہ خلاق ہو۔ یعنی وہ اپنے وجود سے دیکھنے والے کے
جذبے، خیال یا عمل میں مزید حسن کا اضافہ کرے ایک پتنا لی گل داں جو کسی نظم کا موضوع
پیدا نہ کرے اپنے حُسن کے باوجود محض ایک ٹھیکرا ہے مٹی کا۔" گویا فیض صاحب کی نظر
میں حُسن کی کسوٹی اُس کی خلاقیت ہے حُسن جمالیاتی ہی نہیں سماجی اور اخلاقی قدر بھی ہے

شمع نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں
کسی کا درد ہو کرتے ہیں تیرے نام رقم
گلہ ہے جو بھی کسی سے ترے سبب سے ہے
غم جہاں ہو رخ یار ہو کہ دست عدو
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا

فرماتے ہیں کہ "ہر وہ چیز جس سے ہماری زندگی میں حسن یا لطافت یا رنگینی پیدا
ہو جس کا حسن ہماری انسانیت میں اضافہ کرے، جس سے تزکیۂ نفس ہو، جو ہماری روح
کو مترنم کرے، جس کی لَو سے ہمارے دماغ کو روشنی اور جلا حاصل ہو صرف حسین ہی
نہیں مفید بھی ہے"

اس میں چشم و لب یار کے حسن کی قید نہیں بلکہ ہر وہ شے جو انسان کی قوت
تخلیق کی مظہر ہو انسان کی تخلیقی اور جمالیاتی صلاحیتوں کو اُبھارے حسین کہلانے
کی مستحق اور محبت کی متقاضی ہے

فیض صاحب کا فلسفۂ محبت ان کے فلسفۂ حُسن ہی کی تفسیر ہے ان کو حافظ کا
وہ شعر بہت پسند تھا جس میں لسان الغیب نے محبت کو حقیقت جاوداں کا رتبہ دیا ہے
اس شعر کی تکرار ہم کو فیض صاحب کی نظموں میں بھی ملتی ہے اور اُس تقریر میں بھی جو
انہوں نے لینن انعام قبول کرتے وقت کی تھی انہوں نے تقریر ختم کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ
مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمنوں سے کبھی ہار نہیں کھائی اب بھی
فتح یاب ہو کر رہے گی اور آخر کار جنگ و نفرت اور ظلم و کدورت کے بجائے ہماری زندگی
کی بنیاد ہی ٹھہرے گی جس کی تلقین اب سے بہت پہلے فارسی شاعر حافظ نے کی تھی

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

اور وہ دعا کرتے ہیں کہ:

آیئے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی
ہم جنہیں رسم دعا یاد نہیں
ہم جنہیں سوز محبت کے سوا
کوئی بت، کوئی خدا یاد نہیں

یہ سوز محبت کوئی انسانی کیفیت نہیں بلکہ دور کا وہ رشتہ ہے جو اُفق تا اُفق پھیلا ہوا ہے
ان کی انسان دوستی ملک و ملت نسل و رنگ کے تعصبات سے پاک ہے انسانیت کا خون جہاں
کہیں ہوتا ہے فیض صاحب تڑپ اٹھتے ہیں وہ وطن کی آزادی پر قربان ہونے ایرانی طلبا
سے پیار کرتے ہیں جن کے "میٹھے نور اور کڑوی آگ سے ظلم کی اندھی رات میں پھوٹا صبح
بغاوت کا گلشن" وہ افریقی حریت پسندوں کا ترانہ گاتے ہیں جنہوں نے "ڈھول سے ماتھا



اٹھالیا ہے اور غم کی چھال آنکھوں سے چھیل دی ہے اور بیکسی کے حال کو نوچ کر پھینک دیا ہے اور امریکی جلاد جب ایتھل اور جولیس روزن برگ کو سنگ سنگ کے حرم میں سولی پر چڑھاتے ہیں تو فیض صاحب ان شہیدان وفا کی یاد میں ایسا مرثیہ یا انقلابی رجز لکھتے ہیں جس کی نظیر اردو کیا دنیا کی شاید ہی کسی زبان میں ملے

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے
لیکن اس انقلاب شان سے کہ، ؎
لب پہ حرف غزل دل میں قندیل غم
اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی
گر ماتوس اور دل شکستہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ
قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے

فیض صاحب نے کہا تھا کہ شاعری مشاہدہ ہی نہیں مجاہدہ بھی ہے اور "اس جدوجہد میں سے توفیق زندگی کا تقاضہ ہی نہیں فن کا تقاضہ بھی ہے" اس تقاضے کو انہوں نے مجاہدین فلسطین کی صف میں شامل ہو کر پورا کیا اور گولوں گولیوں کی بارش میں عرب شاعروں کی پرانی روایت کو از سر نو زندہ کیا۔ فرماتے ہیں کہ ؎

پھر برق فروزاں ہے سر وادیٔ سینا
پھر رنگ پہ ہے شعلۂ رخسار حقیقت
پیغام اجل دعوت دیدار حقیقت
اب صدیوں کے اقرار اطاعت کو بدلنے
لازم ہے کہ انکار کا فرماں کوئی اترے

فلسطین فیض کا دوسرا وطن تھا جس کا ذکر وہ بڑے دکھ اور پیار سے کرتے ہیں ؎

میں جہاں پر بھی گیا ارض وطن
تیری تذلیل کے داغوں کی جلن دل میں لئے
تیری حرمت کے چراغوں کی لگن دل میں لئے

اور

جس زمیں پر بھی کھلا میرے لہو کا پرچم
لہلہاتا ہے وہاں ارض فلسطیں کا علم
تیرے اعدا نے کیا ایک فلسطیں برباد
میرے زخموں نے کئے کتنے فلسطیں آباد

"زمیں اپنے وطن سے محبت سو فیض صاحب کو کسی سرکار دربار سے سند درکار نہیں۔

انہوں نے لیلائے وطن کو جس طرح چاہا ہے [illegible] اس پر تو قیس عامری کو بھی رشک آتا۔ اُن کی حب الوطنی کی سب سے بڑی شہادت اُن کا کلام اُن کی زندگی ہے اور سب سے بڑی سند عقیدت کے وہ سدا بہار پھول ہیں جو قوم ان پر نچھاور کر رہی ہے ہم نے دنیا کو اور کچھ نہ سہی ایک شاعر ضرور دیا جس نے وطن کی لاج رکھ لی

فیض صاحب کے فلسفۂ حسن محبت کا مثبت پہلو آپ نے دیکھ لیا مگر اس کا نہایت اہم ایک منفی پہلو بھی ہے چنانچہ فیض صاحب کی نظر میں ہر وہ شے گھناؤنی، بدصورت اور سزاوار نفرین و ملامت ہے جو زندگی کے حسن کو مجروح کرے حسن کے محبت کا خون ہوتا ہو اور حسن کے باعث انسان کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے کا مناسب موقع نہیں ملتا سامراجی طاقتوں کی تخریب کاریاں اور اس سوریاں سرمایہ داری نظام کی لوٹ کھسوٹ، جلاوطن تحصیل ذات اور تربیت ذات کے حق میں زہر قاتل ہے " انسانی وقار کی بے حرمتی استبداد اور آزادی نطق و قلم کی محرومی، متاع لوح و قلم کی زباں بندی اُن کے نزدیک حسن و محبت کی قدروں کی نفی کرتے ہیں فیض صاحب کی شاعری فرد اور جمعیت کی ان زبوں حالیوں کے خلاف احتجاج ہے

یوں تو ہمارے شاعروں کے شہر آشوب بھی احتجاج ہی کی ایک شکل تھے اور کبھی کبھی ان کی غزلوں میں بھی برہمی کا انداز جھلک اٹھتا تھا بلکہ غالب کا سا دیدہ ور تو گلشن نا آفریدہ کی جانب بھی اشارہ کر دیتا تھا لیکن ۱۹ویں صدی کے آخر تک ہماری شاعری کی مصائب پر تیز آہ و فغاں کا غلبہ رہا شاعر عہد رفتہ کی عظمتوں کو بڑی حسرت سے یاد کرتے ہیں مگر اندھی گلی میں ان کو جب آگے بڑھنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تو وہ لامحالہ مڑ مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھنے لگتے۔

"دور حاضر کے احتجاجی ادب کی نوعیت اس سے بالکل مختلف ہے ہماری نئی احتجاجی شاعری جس کے موجد علامہ اقبال ہیں حالات زیست کی نقش گری ہی نہیں کرتی بلکہ ان سماجی قوتوں کی نشاندہی بھی کرتی ہے جو ہمارے زوال و انحطاط کا سبب ہیں اور ان حالات کو برقرار رکھنے میں کوشاں ہیں جدید احتجاجی شاعری ان حالات کو بدلنے اور فیض صاحب کے بقول "دست قاتل کو جھٹک دینے" کا حوصلہ عطا کرتی ہے وہ شکست قبول نہیں کرتی کیونکہ اس کو یقین ہے کہ یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسار سحر اور یہی خزاں آمد بہار کی نوید ہے ؎

آتے آتے یونہی پل بھر کو رکی ہوگی بہار
جاتے جاتے یونہی دم بھر کو خزاں ٹھہری ہے

نئے احتجاجی ادب جس کی سب سے بڑی خوبی اس کی رجائیت ہے ۲۰ویں صدی کے سماجی شعور اور سیاسی بیداری کا فنی اظہار ہے کیونکہ ملک میں اور اقصائے عالم میں آزادی کی جو تحریکیں اٹھیں اور جو انقلاب آئے اُن سے ہمارے ادیبوں شاعروں کا متاثر ہونا قدرتی بات تھی جنگ جاپان و روس میں زارشاہی کی شکست، سودیشی اور ترک موالات کی تحریکیں جنگ طرابلس اور جنگ بلقان میں برطانوی کردار ایران میں مشروطیت کی تحریک، ترکی میں نوجوان ترکوں کے ہاتھوں سلطان کی برطرفی، پہلی جنگ عظیم، خلافت اور سول نافرمانی کی ملک گیر تحریک اور پھر انقلاب روس ایسے اہم واقعات تھے جو احتجاجی ادب کا موجب ہی نہیں ہے بلکہ انہوں نے احتجاج کا رخ بھی متعین کر دیا احتجاجی ادب میں رفتہ رفتہ انقلابی لہریں بھی اٹھنے لگیں۔

فیض صاحب دور حاضر کے احتجاجی شاعری کے بڑے سچے نمائندہ ہیں لیکن ان کے



کلام میں انقلابی رنگ آہستہ آہستہ اُبھرا۔ ان کو 'غریبوں کی حمایت' کا احساس اور نادار مزدوروں کے 'گوشت' کی خرید و فروخت کا غم ابتدا ہی سے تھا لیکن وہ اس ترسناک صورتِ حال کو 'اجداد کی میراث' تصور کر کے دل کو تسلی دے لیتے تھے۔ اُن کو یقین تھا کہ

اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

مگر جب سلطنتِ اساسی میں آزادی کی صبح طلوع ہوئی تو شاعر نے دیکھا کہ

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل

تب شاعر پر یہ عقدہ کھلا کہ مداوائے غم کے لئے سیاسی آزادی کافی نہیں بلکہ [illegible] دیدۂ و دل کی کھڑکی تب آسودگی [illegible] ہم اُن ناسوروں سے نجات حاصل کریں گے جو معاشرے کے جسم میں پرورش پا رہے ہیں

تیرے آزار کا چارہ نہیں نشتر کے سوا
اور یہ سفاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی روح کے قبضے میں نہیں
ہاں مگر تیرے سوا، تیرے سوا، تیرے سوا

شاعر کی نسبت حسن صاحب کے "بقول" کارخانوں کے مزدور کے جیالے اور بادشاہ جہاں والی ماسوا "نائب اللّٰہ فی الارض دہقاں" اور "افسردہ حال کلرک" اور "کتاب و قلم" کے پاسباں اور دوسرے تمام محبانِ وطن مل جل کر ادا کر سکتے ہیں۔ یعنی صاحب نے ایک نصب العین [illegible] انہیں کے نام کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ حق و باطل کی اس جنگ میں [illegible] کے ہونے کا

ہاں تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے

لیکن یہ دل سیر کی امداد کام آئے گی نہ کوئی ماورائی طاقت ہماری التجا سنے گی کیونکہ

الم نصیبوں، جگر فگارو
کی صبح افلاک پر نہیں ہے
جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن افق یہی ہے
یہیں پہ غم کے شرار کھل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں پہ قاتل دکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار کرنوں
کے آتشیں ہار بن گئے ہیں
یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

نمودِ سحر کا یہی یقین ان کا آدرش تھا۔ ان کو یقین تھا کہ

اُٹھے گا جب جمِ سرفروشاں
پڑیں گے دار و رسن کے لالے
کوئی نہ ہوگا کہ جو بچا لے
جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی
یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں سے اٹھے گا شورِ محشر
یہیں پہ روزِ حساب ہوگا

سلطانیِ جمہور کا مژدہ سناتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

غرورِ سرو و سمن سے کہہ دو کہ پھر وہی تاجدار ہوں گے
جو خار و خس والیٔ چمن تھے عروجِ سرو و سمن سے پہلے

ہر معاشرہ اپنے فنکاروں کا، اپنے دانشوروں کا محاکمہ کرتا ہے۔ ان سے پوچھتا ہے کہ تم ہماری تہذیب کے خزانے کے لئے کیا تحفہ لائے ہو؟ تم نے ہمارے نظامِ فکر و احساس میں، ہمارے ادراک و آگہی میں، ہمارے جمالیاتی ذوق میں کیا اضافے کئے ہیں؟ ان سوالوں کے جواب تو وقت دے گا جو بڑا بے رحم محتسب ہے البتہ ہم اتنا جانتے ہیں کہ دورِ حاضر کا شاید ہی کوئی شاعر، کوئی ادیب ہو جو فیض صاحب کی شخصیت اور شاعری سے متاثر نہ ہوا ہو اور شاید ہی کوئی ذی فہم ہو جس کے شعور کی سطح ان کا کلام سن کے بلند نہ ہوئی ہو۔ فیض صاحب نے ہم کو ستم سہنے کا سلیقہ سکھایا، افکار کی جرات عطا کی، زنجیر کو زباں دی اور ستم گری سے نبرد آزمائی میں ہماری ہمت افزائی کی۔ انہوں نے مشاہدۂ حق کی گفتگو میں حسن کی لطافتوں کا رنگ بھر کر گفتگو کو زیادہ بامعنی، دلکش اور پُراثر بنا دیا یہاں تک کہ اُن کے بے شمار اشعار ضرب المثل بن گئے۔ انہوں نے اپنی اچھوتی علامتوں، تشبیہوں، اصطلاحوں اور ترکیبوں سے ادب کے خزانے کو مالا مال کر دیا اور وہ ہمارے یقین کو یہ کہہ کر اور مستحکم کر گئے کہ

ہم جیتیں گے
حقا ہم اک دن جیتیں گے
بالآخر اک دن جیتیں گے

افسوس ہے کہ انقلاب کا یہ نقیب غرورِ سرو و سمن کا سر نیچا ہوتے نہ دیکھ سکا اور نہ حیات کی صبح اُس کے جیتے جی طلوع ہوئی اور وہ یہ کہتا ہم سے رخصت ہو گیا کہ

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم



فیض
نظریات کا شاعر

احمد ندیم قاسمی

فیض نے اپنے عصر کی اتنی بلیغ اور اتنی جمیل ترجمانی کی ہے کہ اس کی ذات اس کی زندگی میں ایک تحریک، ایک ادارہ اور ایک روایت کا مرتبہ اختیار کر گئی۔ بیسویں صدی میں اقبال اور جوش کے بعد شاید ہی کسی شاعر نے معاصرین اور اپنے قارئین کو اس شدت اس گہرائی سے متاثر کیا ہو۔ فیض انسانی معاشرے میں ایک مثبت انقلاب کا داعی تھا تاکہ ایک معاشرہ تشکیل پذیر ہو سکے جس کی بنیاد عدل و انصاف، مساوات اور انسانی وقار پر ہو۔ اس انقلابی اُمنگ کے باوجود اس کے ہاں انقلابیوں کی سی گھن گرج کے بجائے ایک مترنم سرگوشی کا سا انداز ہے۔ اس انداز نے زندگی کو سب ہی کے لئے نامی اور بھرپور اور خوبصورت بنانے کے لئے شاعری کو ایک ذریعہ قرار دیا مگر مجال ہے اس کے ہاں کہیں بھی پند و موعظت کی نحوست راہ پا سکے۔ اس کی شاعری پھول کی پتیوں پر شبنم کے اترنے کی مثال ہے مگر اس کے باوجود اس کی کاٹ آہنی ہے۔ دراصل فیض کی سرگوشی قاری اور سامع کے اندر ایک انقلاب برپا کر دیتی ہے۔ انقلاب کے حوالے سے جو شور بلند ہونا چاہیئے وہ فیض کی شاعری میں نہیں بلکہ اس کے اثرات میں پوشیدہ ہے۔ جبکہ فیض کی نغماتی سرگوشی کو اپنے اندر اتار لینے والے کے باطن میں جو قیامت برپا ہوتی ہے اسی کو فیض کی مثبت انقلاب کی شروعات سمجھنا چاہیئے۔ فیض کی شاعری کا آغاز رومان اور وجدان میں لپٹا ہوا ہے لیکن جلد ہی زندگی نہایت کڑے اور سخت حقائق اس خول کو جھنجھوڑ دیتے ہیں اور وہ ذاتی دکھ کے ساتھ ہی عالم انسانیت پر مسلط دوسرے بے شمار دکھوں کی جلن بھی اپنے اندر محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس کے فن میں محبت اور حقیقت کا یہ امتزاج وہ وہ جادو جگاتا ہے اور وہ وہ طلسم کاری کرتا ہے کہ اردو شاعری کے کم ہی بڑے نام اس خصوصیت میں فیض کے مقابل لائے جا سکتے ہیں۔ ان دو بڑی قوتوں کا امتزاج ہی فیض کا اسلوب قرار پاتا ہے۔ یہ امتزاج اتنا ہموار ہے کہ نہ تو فیض کو محبت کرتے ہوئے انقلابی نظریات کی قربانی دینی پڑتی ہے اور نہ ہی اس نے انقلابی موضوعات پر نظمیں لکھتے ہوئے اس نوع کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹوں پر سے نظریں ہٹا لینے کے گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ اسے عشق اور انقلاب دونوں بیک وقت محبوب رہے اور یوں فیض کا نہ صرف اپنا اسلوبِ خاص صورت پذیر ہوا بلکہ اس نے اپنے زمانے کے شاعروں کا بھی ایک اسلوب معین کر دیا۔ ماضی میں ساحر لدھیانوی اور حال میں احمد فراز اس کی خوبصورت اور بلیغ مثالیں ہیں۔

فیض کے ڈکشن کو دیکھئے کہ جس طرح غالب نے اپنے عہد میں اردو غزل کی زبان سراسر بدل ڈالی اور جس طرح جوش نے اردو شاعری پر زبان کے معاملے میں بھی متعدد حجاب کھول دیئے اسی طرح کا ڈکشن فیض کے ڈکشن میں ہے۔ صحیح موسیقی اپنی طلسم کاری سے یہاں بھی باز نہ آیا۔ اس نے اردو شاعری اور خاص طور پر اردو غزل کی مروجہ روایتی لفظیات کو اس سلیقے کے ساتھ اور ایسے تیوروں کے ساتھ استعمال کیا کہ ان لفظوں کے آفاق پھیل گئے ان کے دامانِ معانی میں وسعتیں پیدا ہو گئیں اور وہ مروجہ روایتی مفہوم دینے کے بجائے فیض کے لہجے سے تروتازگی حاصل کر کے نئے مفاہیم سے لد گئے۔ قاتل اور بسمل اور عدو اور قفس اور رسن و بہار وغیرہ وغیرہ ایسے الفاظ ہیں کہ وہ گھس گھسا کر اور پٹ پٹا کر بے معنی ہو رہے تھے مگر فیض کے سحر کا لمس نے انہیں نئی زندگی بخش دی

تعجب ہے فیض نے خواجہ حافظ شیرازی کی ڈکشن کو اپنی غزلوں میں اتنا استادانہ مہارت سے برتا کہ فارسی کی یہ ساری ترکیبیں سبھی علامتیں اور تشبیہیں اور استعارے اور IMAGES اور پیکر اردو سرمایہ بن گئے اور آج قریب قریب اسی ڈکشن، فیض ہی کی ڈکشن میں شاعری ہو رہی ہے۔ فیض نے اپنے کمال فن سے یہ بھی ثابت کر دکھایا کہ ایک خاص نقطۂ نظر، ایک خاص موقف، ایک خاص نظریہ کی شاعری بھی بلکہ شاعری ہی شاہ پارۂ فن ہوتی ہے۔

فیض کو سامراج سے نفرت ہے سرمایہ داری اور جاگیرداری سے نفرت ہے غلامی اور محکومی سے نفرت ہے انسانوں کے ہاتھوں کروڑوں انسانوں کے معاشی استحصال سے نفرت ہے۔ اتنی بہت سی نفرتیں جب اظہار پاتی ہیں تو شعروں میں چیخوں اور فریادوں سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی مگر فیض کے ہاں شعری کوئی کیفیت ہے ہی نہیں۔ دراصل ان سب نفرتوں پر فیض کی بنی نوع انسان سے محبت آسمان کی طرح چھا گئی ہے۔ یہ ساری نفرتیں فیض کی ہمہ گیر انسان دوستی کی لپیٹ میں آ گئی ہیں اور یوں فیض کی مقصدی شاعری اس اعلیٰ معیار کی شاعری ہے جس کے علاوہ اور کوئی معیار ابھی تک انسانی ذہن کو سوجھا ہی نہیں۔

فیض اپنا حصہ بھی سرمایہ نسلوں کے سپرد کر گیا ہے وہ اتنا گراں بہا ہے کہ آئندہ صدیوں تک فیض کے فن کی نوع بہ نوع توجیہات ہوتی رہیں گی اور پڑھنے والے اس کے کلام کے مطالعے سے کچھ زیادہ مہذب، کچھ زیادہ منصف مزاج اور باطنی لحاظ سے کچھ زیادہ ہی خوبصورت ہوں گے۔ فیض کے صرف لہجے، صرف زبان اور صرف انداز پر درجنوں کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ نقادوں کو صرف اپنے ذاتی اور غیر جانبدارانہ اور غیر متعصبانہ مطالعے کے نتائج کو سمیٹنے کی ضرورت ہے۔ وہ فیض کو سنبھل کر اور رُک رُک کر پڑھیں گے تو محسوس ہوگا کہ ان مترنم لفظوں کے عقب میں ہمارا پورا ماضی بول رہا ہے

فیض نے پاکستان کو اور تیسری دنیا کو بلکہ پوری دنیا کو فن اور رجائیت اور انسان کے روشن مستقبل پر اعتماد کی صورت میں بہت کچھ دیا ہے اس کے باوجود میں فیض کی رحلت کے بعد اب تک بار بار کہہ چکا ہوں کہ فیض کی رخصت سے ہم تہذیبی اور ثقافتی اور ذہنی لحاظ سے غریب ہو گئے۔ غریبی کا یہ احساس اس وقت شدت اختیار کر لیتا ہے جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ فیض اگر دو چار سال اور زندہ رہتے تو ہماری تہذیب کچھ زیادہ پرمایہ ہو جاتی اور ہمارا ادبی افق کچھ زیادہ روشن ہو جاتا۔ فیض کے زیر خاک چلے جانے سے ہمیں اپنے غریب ہو جانے کا احساس ہوتا ہے ورنہ فیض تو اپنا بہت کچھ لٹا کے ہمیں تہذیبی لحاظ سے بہت امیر، بہت ثروت مند بنا کر رخصت ہوا ہے۔





فیض کا نظریۂ سخن

محمد صفدر میر

ہمارے عہد کا ادبی شعور اپنے گرد و پیش پر کہاں تک گرفت رکھتا ہے جو ہمارے
روایتی ادب کی ذہنی فضا سے بہت مختلف ہے، اور کئی پہلوؤں سے متضاد بھی۔ جدید
اور قدیم ادب کی بحث ایک عرصے سے جاری ہے اس کا تعلق ان صاف ستھرے اور
سیدھے سادے مباحث سے نہیں جتنا دو ادوار کی ذہنی فضاؤں کے اختلاف سے ہے

بیسویں صدی سے پہلے کا معاشرہ ہماری تمام زبانوں اور کلاسیکی اور روایتی
ادب کا پس منظر ہے۔ اس معاشرے کے عناصر ترکیبی میں سب سے زیادہ اہمیت اس
جمود کی یا محدود دائرے میں متحرک معاشی سیاسی نظام کو ہے جسے فیوڈل یا جاگیرداری
نظام کا نام دیا جاتا ہے۔ اس معاشی سیاسی نظام کی بنیادوں پر استوار معاشرتی
ماحول اپنے مخصوص ادارے رکھتا ہے، اور ان سے ہم آہنگ فکری، اخلاقی
مذہبی عقائد، اقدار اور مسلّمات کا ایک طے شدہ سلسلہ ہے۔ یہی عقائد، اقدار
مسلّمات اس دور کی ذہنی فضا کو متعین کرتے ہیں اور معاشرے کے ہر فرد اور
ہر گروہ کے طرزِ عمل کی کسوٹی کا کام دیتے ہیں۔ یہ اپنے آپ میں ایک مکمل اور
محدود فکری کائنات ہے۔ اس کائنات کے اندر رہنے والوں کے لئے اس کے
باہر کوئی کائنات ہے اور نہ ہو سکتی ہے

تیرہویں اٹھارویں صدی کے مسلم ہندوستان کی خانہ جنگیوں، بیرونی حملوں
متواتر قتل و غارت، معاشی اور سیاسی بحرانوں کی وجہ سے معاشرہ ایک ہمہ گیر
شکست و ریخت سے دوچار ہوا لیکن اس کی مخصوص ذہنی فضا اپنی جگہ قائم رہی
اسی عالمگیر تباہی کے زمانے میں اردو کا بیشتر کلاسیکی ادب پیدا ہوا اور اپنے
نقطۂ عروج کو پہنچا، اور اسی بات سے ہمیں حیرانی ہوتی ہے

اس مخصوص بے صبری کے کارن لیے ہوئے کبھی ہم اپنے بنے سیکھے ہوئے
معیاروں کے مطابق اس کلاسیکی ادب کو جانچتے ہیں اور فتوے لگاتے ہیں کہ
اس زمانے کے شاعر اپنے ماحول سے بے خبر تھے، وہ ایک بے معنی دنیا میں رہا کرتے تھے حق
کو یہ ماننے کی طرف کھلنے والی کھڑکی بھی بند رکھا کرتے تھے پھر کبھی ہم ان کے کلام کی ایسی سیاسی توجیہیں کرنے
لگتے ہیں کہ ان کے زمانے کے ہر چھوٹے بڑے واقعے کے اثرات غزل کے ہر شعر سے اشعار
میں سے برآمد کر ڈالتے ہیں جیسے وہ شاعر نہ ہوں وقائع نویس ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے کے شاعروں کی تخلیقات میں ان کے بکھرتے
ہوئے معاشرتی نظام کے زوال کا احساس بہت کم ملتا ہے بلکہ ایسا لگتا ہے جیسے
ان کو اپنے ماحول میں ہونے والی کسی بڑی تبدیلی کا احساس تک نہ ہو جیسے ان کے
لئے اپنے شیرازہ بند نظامِ حیات و کائنات کے قائم و دائم رہنے کے بارے میں
شک و شبے کا کوئی شائبہ تک ہو۔ ان کی ذہنی فضا میں ویسا ہی ٹھہراؤ، توازن،
سکون اور یک جہتی نظر آتی ہے جو ازمنۂ وسطیٰ کے عروج کے زمانے کے ان مسرور
فارسی شعرا کے یہاں ملتی ہے اگر کہیں آشوبِ زمانہ اور گردشِ لیل و نہار کی شکایت
بھی ہے تو اسے روایتی فکری اور معاشرتی ماحول کے تناظر میں اور اس کے محدود
دائرے کے اندر ہی اسی قائم و دائم معاشرتی سانچے کے مطابق جس کے علاوہ
اور کوئی معاشرتی سانچہ ان کی نظر میں ممکن ہی نہ تھا

اس محدود معاشرتی ماحول اور اس کے محدود ممکنات کے دائرے میں انسان
کی زندگی ازل سے ایک لامتناہی گردش میں سفر کر رہی ہے اور ابد تک اسی طرح
گردش کرتی رہے گی۔ اس کے نشیب و فراز، اس کے بہار و خزاں، اس کے اندرونی
تضادات کے بارے میں مختلف شاعروں کا رویہ متنوع ہو سکتا ہے، کوئی اسے
نور و ظلمت کی کشمکش سے عبارت کرے، یا کفر و اسلام کے تضاد سے، یا ان دونوں
سے ماورا اسے جہاں کی محکم بنیاد خالقِ ارض و سما عجب یہ رکھے۔ جہانِ معنی سب کا
ایک ہی ہے۔ امیر خسرو، عرفی، نظیری، محمد قلی قطب شاہ، ولی، میر، سودا، وارث شاہ،
شاہ لطیف، رحمٰن بابا سب ایک ہی دنیا کے باشندے ہیں اس کے باہر، اس کے علاوہ
یا اس کے برعکس کوئی اور دنیا ممکن ہی نہیں۔ اس مکمل اور محدود، بے تغیر، تصورِ
کائنات پر ایمان ہمارے کلاسیکی ادب کی ذہنی فضا کا خاصہ ہے جو ہمارے اپنے
زمانے کے ادبی شعور کی مضطرب، ہیجانی، ہر دم متغیر اور لامحدود امکانات کی حامل
کیفیت سے نوعی طور پر مختلف ہے۔

غالب کی شاعری شاید پہلی بار اپنے کسی کلاسیکل شاعر کے یہاں اپنے معاشرے
کے روایتی تصورِ حیات و کائنات اور اس کے بنیادی مسلّمات کے بارے میں تشکیک
کا اتنا گہرا تاثر ملتا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ اس کی ذہنی فضا اپنے پیشروؤں سے کچھ مختلف ہو۔ اس کے
معتقدات، اس کا نقطۂ نظر، اس کے جہانِ معنی کے مسلّمات بالکل وہی ہیں۔
لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے یہاں اس بات کا بھی شدید احساس ہے کہ ان کا
اس زندگی کے حقیقی ماحول سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ غالب فیوڈل ہندوستان کی
پرانی دنیا اور نوآبادیاتی سرمایہ داری نظام کی نئی دنیا کے سنگم پر کھڑا ہے۔ اپنے
شعری شعور میں اس فکری اور اخلاقی بحران کا اظہار کرتا ہے جو مختلف معاشرتی
دنیاؤں کے تخالف اور ٹکراؤ سے پیدا ہوا۔ اس میں ایک نئی دنیا کی تخلیق اور اس کے
لئے موزوں تصوراتی پیکروں کی تشکیل کے بارے میں بھی کچھ اشارے ہیں اور
امکانات کی ایک نئی کائنات کا خیال بھی۔ لیکن اس کی روایتی ذہنی فضا کے دائرے
میں اس خیال کی کسی واضح صورت کی تعیین گری ممکن نہ تھی۔ اس کام کے لئے کسی
ایسے شاعر کی ضرورت تھی جو دونوں ٹکراتی ہوئی دنیاؤں کی مادی، معاشرتی اور
فکری بنیادوں سے واقف ہوتا۔ اور ان کے سارے تضادات کو اپنے نفس میں
جذب کر کے، اپنے تخیل کو متصادم قوتوں کے پُرہول جدل کا میدان بنا کر ان کے
اجزا سے ایک نئی ترکیبِ معنوی اور ایک نئے جہانِ تمنا کی تخلیق کر سکتا ہے۔



یہ کام اقبال کے لئے ممکن ہوا، اور فکر و کلام کی اسی بلند سطح پر جہاں سے غالب نے اس کے امکان کی جھلک سی دیکھی تھی۔ اقبال کا طرزِ احساس غالب سے اس قدر ہم آہنگ ہے کہ کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے غالب ہی کی روح نے اقبال کے پیکر میں دوبارہ جنم لیا ہو، تاکہ اس کے لئے اپنی تشنۂ تکمیل خواہش کو پورا کر سکے۔

یہ محض شعری روایات کی ہم آہنگی کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ ہم منصب شاعرانہ شخصیتوں اور ان کے عزائم کی مماثلت کا بھی، اور اس کے ساتھ ہی کسی قوم کی روح کے زمانی تسلسل کا، کیونکہ جس طرح اقبال میں غالب کی معنوی صورت کی جھلک نظر آتی ہے اسی طرح غالب میں عرفی اور نظیری کے پیکروں کی جھلک ملتی ہے۔ معاشرتی ماحول کے فرق اور زمانے کے بعد کے باوصف ان مختلف زمانوں کے شاعروں کے درمیان طرزِ احساس کی یہ حیرت ناک مماثلت اور فکری اسلوب کا یہ تسلسل، اتفاقی امر نہیں ہے۔ شاید یہ بھی اس پُراسرار حقیقت کا ایک مظہر ہے جسے قومی شخصیت کہتے ہیں جو کسی قوم کی زندگی کے مختلف ادوار پر حاوی ہوتی ہے اور جو صدیوں تک عہد با عہد ہر زمانے میں روحِ عصر کے ساتھ منتقل اور متحد ہو کر از سرِ نو جواں اور تازہ دم ہوتی رہتی ہے۔

قومی شخصیت اور روحِ عصر کا یہی نقطۂ اتصال کسی عہد کے منفرد اور نمائندہ شاعروں کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور یہی مختلف ادوار کے شاعروں کو ان کے مخصوص و منفرد شعری تجربوں اور شدید جو ہر کر بت کے باوجود ایک دوسرے کا آئینہ بنا دیتا ہے اور سب کو ایک ہی رشتے میں پروتا چلا جاتا ہے۔

اقبال کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے ہمارے زمانے کے مواد، اس کی ساخت ہماری قوم کے ظاہر و باطن، اس کے عزائم ... میں بنیادی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ اگر غالب فیوڈل عہد کے تمام ... اور ... کے سنگم پر کھڑا تھا تو اقبال ایک ایسے زمانے میں ... جب نو آبادیاتی سرمایہ داری عہد اپنے انتہائی کمال تک پہنچ کر زوال آمادہ ہو چکا تھا اور تاریخ ایشیا میں حکمت کے نئے دور کا آغاز ہو رہا تھا۔ اقبال کی شاعری کا بڑا حصہ اپنے زمانے کے انہی عظیم معاشرتی انقلابات کی تفسیر ہے۔

غالب اور اقبال کی شاعری کا موازنہ کرتے وقت بعض اصحاب ان دو مثالی شاعروں کے کلام اور شخصیت میں تفریق و تخصیص اس بنا پر کرتے ہیں کہ ایک میں داخلیت ہے اور دوسرے میں خارجیت، یا ایک میں احساسات اور جذبات کا ارتکاز ہے اور دوسرے میں منطقیت اور استدلال کی فراوانی، ایک دروں بینی اور خود نمائی میں محو ہے اور دوسرا دنیا اور کائنات کے رموز کو آشکار کرنے میں مصروف ہے، ایک کا شعر خود اپنا مقصد آپ ہے اور دوسرے کا شعر اپنے آپ سے الگ اور ماورا ایک اخلاقی اور معاشرتی مقصد کا ذریعہ ہے۔

ان دو حیرت ناک حد تک مماثل شاعروں میں اتنی واضح اور دو ٹوک تفریق و تخصیص کی نشاندہی ایک نصابی اور مدرسانہ ضرورت کی تکمیل کا ذریعہ تو ہو سکتی ہے لیکن سخن کی اس روایت کو سمجھنے میں ہماری مدد نہیں کر سکتی جس کا یہ دونوں حصہ ہیں۔ اور وہ روایت ہے فکری شاعری کی، جس کا اوّل و آخر مقصد حیات و کائنات کو سمجھنا اور سمجھانا ہے۔ اس روایت میں داخلیت اور خارجیت کی کیفیات متضاد ہونے کے باوجود باہم پیوست، یک آہنگ اور متحد ہوتی ہیں اور رہی ہیں۔ تمام شاعروں میں ان کے اجزا مختلف مقداروں میں بصد رجوع ... طرف ... پائے جاتے ہیں، انہیں الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ غالب کے شعر میں تو ایک اندوہ گہیں ٹھہراؤ ایک سنگ سنگ کہ راکھ ہوتے جانے کی کیفیت ہے، وہ محض شخصی یا ذاتی یا اندرونی نہیں ہے بلکہ اس کے زمانے، اس کے گردو پیش کی ٹھہری ہوئی معاشرتی صورتِ حال کا عکس ہے، اتنا ہی خارجی جتنا کہ داخلی۔ اقبال کے یہاں اس کے برعکس ایک پُر امید حرکت اور شعلۂ جوالہ کی کیفیت، اس کے اپنے زمانے، اپنے ماحول اور اپنے معاشرے کی سچائی ہے، اور یہاں بھی داخلیت اور خارجیت باہم پیوستہ و متحد ہیں۔ اقبال اور غالب دونوں کے یہاں جزو میں کل اور کل میں جزو دیکھنے اور دکھانے کی بات ہے جس کی طرف غالب نے اشارہ کیا ہے، اور اسے غایتِ سخن بتایا ہے۔ اسی قدرِ مشترک سے دونوں کے کلام کی ہم رنگی، دونوں کے خیال، جذبے اور احساس کی ہم آہنگی، دونوں کے شعری تجربے کی شدت اور ان کا زخم لیتے ہیں اور ان کو ہمارے شعر کی اس روایت کا حصہ مانتے ہیں جس کا تعلق اصلاً فکر سے ہے محض ذاتی اور لمحاتی غموں اور خوشیوں سے نہیں ہے۔

• ہمارے زمانے میں اس روایت کا سب سے مکمل اظہار فیض کی شاعری میں ملتا ہے۔ یوں تو ترقی پسند ادب کی ساری تحریک ہی اسی روایت کے نصب العین کو اپنانے کا دعویٰ کرتی ہے لیکن فیض میں جس طرح ایک مسلسل اور صبر آزما ریاضت اور شدید ذاتی مجاہدے کے ساتھ اس روایت سے منسلک رہنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے، وہ کہیں اور مشکل ہی سے پائی جاتی ہے۔ فیض، غالب اور اقبال کے سلسلے کا شاعر ہے، یہ تو سبھی جانتے ہیں اور اکثر اس سلسلے میں اس کی کلاسیکیت کا بھی ذکر کیا جاتا ہے اور اس کو بہت حد تک اس کے روایتی استعاراتی انداز، اس کے لفظ کے جواز اور اس کے ظاہری اسلوب سے عبارت سمجھا جاتا ہے۔ معاملہ اس سے ذرا گہرا ہے۔ معاملہ یہ ہے کہ فیض کا بطور شاعر کے بنیادی مسئلہ، اس کی زندگی کا محور اس کے لئے اعزاز و سرمایہ کا ہیانہ، یہ رہا ہے کہ اردو کی شاعرانہ روایت میں داخل ہونے والا جدید عہد کا شاعر کیا اور کس طرح کا ہونا چاہیے اور وہ جو مثالی کردار کو کس طرح ادا کرے۔ یہ ایک بہت ہی مشکل معیار ہے جو اس نے اپنے لئے، اور اپنے عہد کے لئے قائم کیا تھا اور اس پر قائم رہنے کے لئے محض غزل کی تکنیک سے واقفیت اور اپنے عہد کے واقعات پر تبصرہ کرنے کی صلاحیت ہی کافی نہیں اور بھی بہت کچھ درکار ہے۔

دستِ صبا کے دیباچے میں فیض نے جو اس 'بہت کچھ' کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے عہدہ برا ہوتے رہنے کی اس نے اپنی پوری زندگی میں



کوٹ کوٹ کر بھری ہے، اور جس نے اس کی لستا "قلیل مقاطع سخن کے ایک ایک لفظ میں جادو بھر دیا ہے اور اس کے مصرعوں اور ترکیبوں کو اپنے زمانے، اپنی قوم اور دیار کے اردو والوں کے لئے ضرب المثل کی حیثیت دے دی ہے، اور خود اس کو ہمارے عہد اور زمانے کے شاعر کا استعارہ اور آرکی ٹائپ بنا دیا ہے۔ فیض کی عالمگیر مقبولیت اور اس کے کلام کی پُر اسرار کیفیت اسی سے پیدا ہوتی ہے۔

اس میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ فیض نے اس فن کو دل لگی یا بیکار کا کام سمجھ کر اختیار نہیں کیا۔ وہ کہتا ہے "فن سخن زمانہ کوئی اور یں، بچوں کا کھیل نہیں ہے ... محض سنجیدگی یا خلوص بے شک کا مسئلہ نہیں بلکہ اس کا تعین کرنا ہے کہ کس عمل کی بابت جا رہی ہے۔ فن سخن بچوں کا کھیل نہیں ہے ... کا اندازہ مثالی کا کلی نہیں اس لئے کافی نہیں کہ شاعر ... کو قطرے میں دجلہ دیکھنا ہی نہیں دکھانا بھی ہوتا ہے"

تو اصل ... قطرے میں دجلہ دیکھنے اور دکھانے کا ہے، اور یہیں سے ... کا ... کار مختلف اور منفرد ہو جاتا ہے۔ دجلہ سے فیض کی کیا مراد ہے وہ ... بیانات میں درج ہے

دوردراز ... دشوار گزار پہاڑیوں پر برفیں پگھلتی ہیں، چشمے ابلتے ہیں ... ایسے بھرے ہوؤں کو جمع کر چٹانوں کو کاٹ کر آپس میں ہم کنار ہوتے ہیں، اور یہ دریائی تک پہنچتا، وادیوں جنگلوں اور میدانوں میں سمٹتا اور پھیلتا چلا جاتا ہے ... بالکل اسی طرح انسانی تاریخ میں ... زندگی کے ... مراحل میں دیکھے اس سے ... کا ... دیکھا پھر شاعری کی نگاہ ان کے ... اور ... معانی ... تک پہنچی بھی گئی، لیکن ان کی ... طرح ... ساتھ ساتھ ... ہی ... کی ... منزل تک پہنچنے کے لئے جسم و جان ... کی ... ہر ... تو بھی شاعر سے ... پوری طرح سرخرو نہیں" تو دجلہ دراصل انسانی زندگی کی کلیت اور اس کی تاریخ کا استعارہ ہے۔ یہ اور سوال ہے کہ غالب نے اس سے کیا کیا مراد لی تھی لیکن فیض کی اپنی لغت میں اس سے انسانی تاریخ ہی عبارت ہے ایک اور جگہ استعارے کی مدد لئے بغیر اس نے اس آدرش کو یوں پیش کیا ہے

صحیح معنوں میں ایک تخلیقی فن کار کا فرض ہے کہ وہ اپنے فن کی حدود میں اپنی ذات، اپنی قوم، اپنے عہد کے ماضی، حال اور مستقبل کو معلوم و محسوس کرے اور اس کے مطابق علم و احساس کی قدر و قیمت معین کرے اور اس کی تفسیر و تشہیر کرے۔ یہ آدرش شاعر کے کام کو بیک وقت ایک مؤرخ، ایک سائنس، اور ایک فلسفی کی سطح پر بلند کر دیتا ہے اور اس کام کو ان سب کے مجموعی کام سے زیادہ پیچیدہ اور دشوار بنا دیتا ہے کیونکہ محض خیال کو کسی نہ کسی طرح شعر کا قالب دینے کا نام نہیں بلکہ اس سارے تجربے کو مٹھی میں سما کر، صاف کر کے، چھان پھٹک کے، منظر کرکے تصویری اور معنوی پیکر دینے کا نام ہے اور پھر اتنا بھی کافی نہیں کہا ہے۔

"اگر غالب کے دجلہ سے زندگی اور موجودات کا نظام مراد لیا جائے تو ادیب خود بھی اس دجلہ کا ایک قطرہ ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے ان گنت قطروں سے مل کر اس دریا کے رخ، اس کے بہاؤ، اس کی نہست اور اس کی گہرائی کے تعین کی ذمہ داری بھی ادیب کے سر آن پڑتی ہے۔ یوں کہئے کہ شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے کہ وہ گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے اُسے دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر، اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر ... یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جد و جہد چاہتے ہیں"

فیض کی شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لئے اس کے شاعرانہ آدرش کی ان تمام تفاصیل سے آگاہ ہونے کی ضرورت نہیں لیکن فیض کی شخصیت کی پہچان اور اس کے لفظ لفظ کے پُر اسرار جادو کی سمجھ کے لئے ان باتوں سے بڑی مدد ملتی ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمارے جدید ادب اور اس میں ترقی پسند ادب کا سوال ہے، کے آئینے میں، سطحیت اور پائیداری کی وجہ سے معلوم ہو جاتی ہے اور یہ بھی کہ اقبال کے شاعروں میں سے جو فیض کو چھوڑ کر اور کوئی بھی کلاسیکل کے مرتبے پر کیوں نہ پہنچ سکا۔

جدید ادب کے ابھار کا زمانہ تیسری اور چوتھی دہائی کا وہ زمانہ ہے جو عالمگیر سرمایہ داری کے ایک شدید ترین بحران، اس نظام کو بچانے کے لئے فاشزم کے تخلیق اور پھیلاؤ، اور فاشزم کے وسیلے سے سوشلسٹ نظام اور سوشلزم کو جنگ کے ذریعے نیست و نابود کرنے کی کوشش سے عبارت ہے۔ معاشرتی نظاموں کے ٹکراؤ، اور ایک عالمگیر نئی معاشرتی قلب ماہیت سے پیدا ہونے والے اخلاقی اور روحانی تضادات کے عروج کا زمانہ ہے

شاعری کی حیثیت سے اس کی آدرش کو متعین کرنے کے بعد ہم بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں کہ فیض اس نئی معاشرتی قلب ماہیت کے عمل سے کس طرح ہم آہنگ ہوا دوسرے اکثر شاعر اس زمانے میں اپنی کاوش اور وقت مشقی اور اسلوبیاتی تجربوں پر صرف کر رہے تھے اس طرح انہوں نے اردو شعر کے اسلوب میں ایک انقلاب کی بنیاد رکھی۔ فیض نے بھی اس کام میں بھرپور حصہ لیا لیکن اس کی اصل جد و جہد کا میدان اور تھا اس نے اپنے آپ کو پورے طور پر اس عظیم معاشرتی انقلابی عمل سے پیدا ہونے والی اخلاقی اور روحانی کشمکش اور کیفیات کو سمجھنے سمجھانے کے لئے وقف کر دیا جو ساری دنیا میں ظہور پذیر ہو رہا تھا

البتہ نہیں کہ دوسرے جدید شاعروں کے یہاں اس عالمگیر معاشرتی صورت حال کا شعور ہی نہیں تھا فرق یہ ہے کہ جہاں ان کی شاعری میں یہ شعور بالواسطہ، فردی اور ہنگامی ہے، فیض کے یہاں یہ براہ راست، نفس الامری اور اندرونی ہے یہی اس کے شعری تجربے کی اساس ہے اور اس کا حقیقی موضوع سخن وہ ان کیفیات اور واردات کی نقش گری کرنا ہے جو ایک معاشرتی انقلاب کے طوفان کے دوران انسانوں پر گزرتی ہیں



فیض — انقلاب اور عوامی حوصلوں کا مغنی

ڈاکٹر قمر … جنرل سیکریٹری انجمن ترقی پسند مصنفین، بھارت

ہمارے عہد کی، ہماری زبان کی سب سے شیریں، سب سے معتبر، سب سے انقلابی آواز خاموش ہو گئی، وہ آواز جو نصف صدی تک ہمارے دلوں کی دھڑکن سی رہی، وہ سنہری آواز جس میں حسن و عشق کی وارفتگی بھی تھی اور ظلم و استبداد کی طاقتوں سے سرکشی بھی، جس میں دل گداز نرمی بھی تھی اور باغی روح کی کج کلاہی بھی، جو انسانی دکھوں سے بوجھل اور انسانی حوصلوں سے معمور تھی۔ آوارہ جو فن کار کی ذات کا نغمہ اور بیدار ہوتے ہوئے آفاق کا رزمیہ تھی جو بیسویں صدی کے اس سفر کی ہر منزل کا استعارہ تھی جو تیسری دنیا کے محنت کش انسانوں نے آزادی، انصاف اور ایک بھرپور فارغ زندگی کی تلاش میں اختیار کیا اور جو آج بھی جاری ہے۔

دلی اپنے دلوانے کی آواز سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئی۔ لاہور کا عاشق اس لحد میں سو گیا۔ فیض صاحب کے انتقال سے ٹھیک بارہ دن پہلے ممتاز ترقی پسند فن کار اور اس تحریک کا ایک معمار راجندر سنگھ بیدی بھی رخصت ہو چکا تھا۔ ابھی اس کی جدائی کا زخم تازہ تھا کہ ایک اور مینار کے گرنے سے اردو شعر و ادب کی دنیا دہل گئی۔ فیض اور بیدی دونوں اقبال کے وطن سیالکوٹ کی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے۔ دونوں کا زمانہ تعلیم اور عہد شباب کا بیشتر حصہ لاہور میں گزرا۔ دونوں ابتداً سے ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن رہے۔ آزادی کے بعد فیض پاکستان کی سیاست اور صحافت سے وابستہ ہو گئے اور راجندر سنگھ بیدی نے بمبئی کی فلمی دنیا کو روزگار کا سہارا اپنایا۔ لیکن دونوں نے اپنے فن کو اعلیٰ تخلیقی معیاروں سے گرنے نہیں دیا۔

آزادی کے بعد فیض پاکستان میں پراگریسو پیپرس لمیٹڈ کے زیر اہتمام شائع ہونے والے اخبارات، پاکستان ٹائمز، امروز اور لیل و نہار کے چیف اڈیٹر کی خدمات انجام دینے لگے۔ یہ زمانہ نہ صرف برصغیر میں بلکہ ساری دنیا میں اہم اور بنیادی سیاسی تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔ سامراجی طاقتیں پاکستان اور دوسری نو آزاد ملکوں کو اپنے اثر و اقتدار میں لانے کی بھرپور سازشیں کر رہا تھا۔ فیض اپنے اخباروں میں ان گھناؤنی ریشہ دوانیوں کے پردے بیرحمی سے چاک کر رہے تھے، اس کے ساتھ ساتھ وہ ڈاک، تار اور ریل کرمچاریوں کی ٹریڈ یونینوں کی سربراہی بھی کر رہے تھے سجاد ظہیر پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم کے کام میں لگے تھے اور فیض اس کے کاموں میں بھی مدد کر رہے تھے

یہ عوامی اور انقلابی تحریکیں نہ صرف پاکستان کے برسر اقتدار طبقوں کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں، بہ ان منصوبوں کو روبہ عمل لانے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھیں۔ فیض بار بار اخبارات کے اداریوں میں پاکستانی عوام کو سامراجی منصوبوں سے متنبہ کر رہے تھے ایشیا اور افریقہ کے دوسرے ملکوں میں آزادی کی جو امنگ اور بیداری پیدا ہو رہی تھی جو عوامی تحریکیں سر اٹھا رہی تھیں۔ فیض ان کی بھرپور حمایت کرتے تھے۔ لغرض یہ زمانہ فیض کی سیاسی سرگرمیوں کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا جب اچانک ۹ مارچ ۱۹۵۱ء کی صبح کو انہیں گرفتار کر کے قید تنہائی میں ڈال دیا گیا۔ راولپنڈی سازش کیس میں وہ چار سال اور ایک ماہ تک وہ سرگودھا، منٹگمری، حیدرآباد، کراچی اور لاہور کی جیلوں میں قید و بند کی اذیتیں برداشت کرتے رہے موت کی شمشیر ان کے سر پر رقص کرتی رہی اور وہ شعر لکھ کر اپنے وطن عزیزوں اور ساری دنیا کے دکھی انسانوں سے اپنے رشتے استوار کرتے رہے کیمونسٹ سازش کے الزام میں تو بری ہو گئے

فیض احمد فیض کو دوسری بار سیفٹی ایکٹ کے تحت ۱۹۵۸ء میں گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا گیا۔ رہائی کے بعد انہوں نے زیادہ وقت لندن، ماسکو اور دنیا کے دوسرے ملکوں کی سیاحت میں صرف کیا۔ ایفرو ایشیائی ادیبوں کی تنظیم کے وہ ممتاز رکن اور اس کے 'لوٹس' کے وہ مدیر اعلیٰ تھے، فلسطین کے مہاجرین اور افریقی عوام کی تحریک آزادی سے ان کا گہرا رشتہ تھا

بین الاقوامی شہرت

گذشتہ بیس سال کے عرصہ میں فیض نے بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی تھی انگریزی، روسی، ترکی، جرمن، چک اور دوسری اہم زبانوں میں ان کی شاعری کے مجموعے چھپ چکے تھے۔ گذشتہ جولائی میں لندن یونیورسٹی اور فیض کلچرل اکیڈمی نے مل کر ان کی شاعری پر ایک بین الاقوامی مذاکرہ کیا جس میں وہ خود بھی شریک تھے۔ فیض اکیڈمی کے صدر مجاہد ترمذی جو لندن کے ممتاز بیرسٹر ہیں فیض کو نوبل انعام دلانے کی باقاعدہ مہم چلا رہے تھے۔ سوشلسٹ دنیا کا سب سے بڑا ایوارڈ لینن انعام انہیں پہلے ہی مل چکا تھا



الغرض فیض اگر جہاں گرد تھے تو ان کی فکر جہاں پیما اور شہرت جہانگیر تھی۔
ن کا نام سرحدوں، قوموں اور عقیدوں کی ساری سرحدیں پار کر کے ہمہ گیر مقبولیت کی زندہ علامت بن چکا تھا ان کے ذریعے جدید اردو شاعری نے بین الاقوامی شناخت حاصل کی یہی وہ نام ہے جو گذشتہ پانچ سال سے دل کو چھو لینے والے انقلابی نغموں، حسن و عشق کے مدھر گیتوں اور جبر و استحصال کی طاقتوں کے خلاف احتجاجی ترانوں سے پہچانا جاتا ہے جو اپنے عہد کی انسانیت اور اس کے ضمیر کی موثر آواز بن چکا ہے۔

اکثر لوگ سوچتے اور سوال کرتے ہیں کہ فیض کی شاعری میں یہ تاب، فکر میں ایسا حسن، یہ سوز اور استقامت کہاں سے آئی دراصل اس کا سرچشمہ کردار و عمل ۔۔۔ اور ۔۔۔ وہ ۔۔۔ مطالعہ ہے جو اردو کے بہت کم شاعروں کے حصے میں آئی ہے فیض ۔۔۔ انقلاب کے ہر تصور سے پیمان وفا باندھا تھا اس کی فتح ۔۔۔ انسانوں کی ۔۔۔ تہذیب میں دور تک پھیلی ہوئی تھیں وہ اس انقلاب ۔۔۔ کیا ۔۔۔ اور ۔۔۔ ہاتھ مارتے ہوئے سمندر میں ۔۔۔ محسوس کرتے تھے ۔۔۔ دکھی انسانوں سے ۔۔۔ محسوس کرتے تھے اس ۔۔۔ میں بھی ان کے ۔۔۔ ولہجہ کو متاثر ۔۔۔ اس کا اندازہ ان چند اشعار سے کیا جا سکتا ہے ۔

یہ دل کے داغ تو دکھتے تھے یوں بھی پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے ہجران یار کا موسم
یہی جنوں کا یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر یہی اختیار کا موسم
قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتش گل کے نکھار کا موسم

۔۔۔ جب پاکستان کا حکمراں طبقہ قومی زندگی کے قافلے کو جن ۔۔۔ راہوں سے تباہی کی اتھاہ گہرائیوں کی طرف لے رہا تھا، دست صبا اور زنداں نامہ کے اشعار میں اس کے نقوش آسانی سے دیکھے جا سکتے ہیں فیض نے ۔۔۔ شاعری میں پاکستان کے جابر حکمرانوں کی جن الفاظ اور علامتوں کی تنائیں بیان کی ہیں وہ دیوڈل ہندیب کی ترجمان ہونے کے باوجود ان کے گھناؤنے وجود پر چیت اطراف ہیں جیسے انہیں فیض کی شدید احساس نے پگھلا کر موزوں سا دیا ہو حرف دست صبا میں اس عیار اور سفاک طبقہ کے لئے انہوں نے واعظ، شیخ، محتسب، ناصح، عدو، مدعی، اہل ستم، اہل حکم، اغیار، رقیب، صیاد، گلچیں، اہل ہوس، رہزن، فقیہ شہر، اہل حرم، بیداد گر، قاتل، بے داد گر اور جلاد جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں وطن کے حال زار کی ترجمانی صرف چند اشعار دیکھئے

چمن میں غارت گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

نوائے مرغ کو کہتے ہیں اب زیان چمن
کھلے نہ پھول اسے انتظام کہتے ہیں

سیاسی شاعری

فیض کی سیاسی شاعری میں ان کی مشہور اور مترنم غزل کا

دربار وطن میں جب اک دن
سب جانے والے جائیں گے

اور وہ دل گداز نظم جس کا عنوان ہے ۔

نثار میں تیری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں اکا ذکر بیجا نہ ہوگا یہ دونوں تخلیقات اردو شاعری میں وطن پرستی کا ایسا حرف ہیں جس کی آب و تاب کبھی ماند نہ ہوگی نظم کے آخری بندوں میں شاعر نے طبقاتی آدرش کا ذکر جس انداز سے کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی دردمندانہ فکر آزادی اور غلامی کی قوتوں کے درمیان برپا ہونے والے ان معرکوں کو بھی دیکھ رہی تھی جن کا میدان ایشیا اور افریقہ کے دور دراز کے ملک تھے اس کے بعد کی اہم نظم ستیسوں کا مسیحا کوئی نہیں میں یہی طبقاتی پیکار ایک انقلابی آہنگ کے ساتھ تیسری دنیا کی ساری قوموں پر محیط ہو جاتی ہے ۔

ان دونوں میں رن پڑتا ہے
بت لستی بستی نگر نگر
ہر بستے گھر کے سینے میں
ہر چلتی راہ کے ماتھے پر

سب ساغر شیشے لعل و گہر — اس بازی میں بار جاتے ہیں
اٹھو سب خالی ہاتھوں کو — اس رن سے بلاوے آتے ہیں

اس نظم کی اکثر علامتیں دوسری نظموں سے مختلف ہیں۔ اس کی داخلی فضا زیادہ تہہ دار ہے۔ یہاں ساغر شیشے لعل و گہر محنت کش انسانوں کی آرزو مندیوں خوابوں محرومیوں اور ان سے پیدا ہونے والے انقلابی حوصلوں کی علامت بن جاتے ہیں

فیض کے کلام کی بے لاگ موسیقی، ان کی انسان دوستی، دردمندی اور رجائیت ہیں جن کے بارے میں خاصا لکھا جا چکا ہے۔ لیکن ایک ممتاز ترقی پسند دانشور اور ملند قامت انسان کی حیثیت سے بھی ان کا رتبہ کسی سے کم نہیں ہے۔
ان کا اخلاص، انکساری اور عوام دوستی محض نمائشی نہیں تھی یہ ان کی شخصیت کے کلیدی اوصاف تھے۔

جشن فیض ۱۹۸۲ء لندن کے دوران ایک بار مجھ سے کہنے لگے میرے قدرشناس بہت ہیں لیکن اس بار جتنی خوشی مجھے ڈی سی ایم کے اس مزدور کی داد سے ہوئی جو مجھ سے ہوٹل میں ملنے آیا تھا اور جس کو میری کئی نظمیں یاد تھیں، اتنی خوشی کسی اور کی قدر افزائی سے نہیں ہوئی۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں ایسی چمک آگئی تھی جیسے سچ مچ انہیں اپنی زندگی بھر کی فنی ریاضت کا صلہ پا لیا ہو۔ جیسے انہیں ایسا وہ قاری مل گیا ہے جس کی انہیں تلاش تھی۔


"ٹریٹ پلاٹینم
کو آپ اتنا ہی اچھا پائیں گے
جتنا آپ کا موجودہ اسٹین لیس بلیڈ
بلکہ اس سے بھی بہت بہتر"
ٹریٹ پلاٹینم
کو میں نے ہر اسٹین لیس بلیڈ
سے بہتر پایا ۔ آپ بھی آزمائیے
Treet PLATINUM
SUPER STAINLESS BLADES
MADE IN U.S.A
5 BLADES
Treet PLATINUM
Treet
PLATINUM SUPER STAINLESS
ٹریٹ پلاٹینم
سپر اسٹین لیس بلیڈ
امریکہ میں بنا ہوا
PRESTIGE TCL 812 1 83



کچھ یادیں فیض کی

ظفر اللہ پوشنی

اگر آپ ادیب ہیں، شاعر ہیں، مصور ہیں، اہل علم و فن ہیں اور پاکستانی ہیں اور آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے بعد آپ کے متعلق مضامین لکھے جائیں تو آپ کی مدت عمرانی اچھی خاصی ہونی چاہیئے یعنی اس جہان فانی سے کوچ کرنے میں جلدی نہ کیجئے۔ پچھلے تیس چالیس برس میں آپ حضرات کے متعلق جو کچھ لکھا گیا تھا اس سے کہیں زیادہ چند مہینوں میں کہا جاتا ہے کا۔

فیض احمد فیض کی وفات پر بھی یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک دو ہفتوں تک ملک کے قومی اخبارات اور رسائل کے صفحات کو مزین کیا اور بار بار لوگوں نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر فیض کے ساتھ اپنی دوستی اور عقیدت کا چرچا کیا اور ریڈیو پاکستان ٹیلیویژن نے بھی ایک دن کے لئے فیض کے کلام کو ٹیکسٹ بک بنا کر اور اپنی وابستگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک گھنٹہ کے پروگرام کے ذریعہ فیض صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا۔

مجھ سے کئی لوگوں نے کہا کہ میاں آپ بھی کچھ لکھیں لیکن عقیدتوں کے اس سیلاب میں میں اپنی وابستگی کی یاد کو کیا کرتا، خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ یہ مضمون بھی صرف اس لئے لکھ رہا ہوں کہ ارشاد راؤ دھرنا مار کر بیٹھ گئے ہیں کہ آپ کو لکھنا ہی پڑے گا یہاں تک کہ یہ حضرات میرے گھر پر ٹیلیفون کر کے مجھے تنگ کرتے رہتے ہیں۔

فیض صاحب سے میری پہلی ملاقات اس محفل میں ہوئی جو سازش کیس کے نام سے مشہور ہے۔ یہ میٹنگ میجر جنرل اکبر خان کے گھر پر ۱۹۵۱ء کے اوائل میں منعقد ہوئی اور جو بعد میں راولپنڈی سازش کیس کی بنیاد بنی۔ اس میٹنگ میں جنرل صاحب نے حکومت کا تختہ الٹنے کی جو اسکیم پیش کی تھی اس کو حاضرین نے کئی گھنٹوں کے مباحثے کے بعد مسترد کر دیا تھا لیکن بعد میں جب حکومت نے مقدمہ پیش کیا تو وعدہ معاف گواہوں سے یہ جھوٹی گواہی دلوائی گئی کہ میٹنگ میں شامل حضرات اور ان کے بعض دوسرے ساتھی حکومت کا تختہ الٹنے کی اسکیم پر متفق ہو گئے تھے۔ قانون کے مطابق سازش کی تعریف میں آنے کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ کسی غیر قانونی سرگرمی پر اہل سازش متفق ہوں اگر متفق نہ ہوں تو سازش کا جرم ثابت نہیں ہوتا اس لئے وعدہ معاف گواہوں سے یہ جھوٹ بلوایا۔ استغاثہ کے لئے ضروری تھا۔ سو ایسا ہوا۔

بہرکیف یہ ذکر تو یونہی آ گیا، بات ہو رہی تھی فیض صاحب کی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے زندگی میں پہلی بار ان کو اس محفل میں دیکھا اور آپ حیران ہوں گے کہ پہلی ملاقات کے وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ شخص کون ہے۔ میٹنگ میں فیض صاحب نے لاتعداد سگریٹ پیئے اور بہت کم گفتگو کی۔ جب جنرل اکبر کی پیش کردہ اسکیم مسترد ہو گئی تو لنچ کھایا گیا۔ لنچ کے دوران بھی فیض صاحب بیشتر وقت خاموش رہے۔

فیض صاحب سے دوسری ملاقات حیدرآباد پولیس کی گاڑی میں ہوئی یعنی جب یہ خبر ملی کہ ہم تمام سازشیوں کو پولیس اسپیشل ٹرین کے ذریعے لاہور سے حیدرآباد لایا گیا۔ علیحدہ علیحدہ ڈبوں میں۔ جب ٹرین سے اتر کر پولیس کی بس میں بیٹھے اس وقت میں تھا، مرحوم کیپٹن خضر حیات تھے اور کرنل نیاز محمد ارباب تھے۔ دفعتاً جیل مرکزی دروازے کے باہر ہم ادھر ادھر دیکھ ہی رہے تھے کہ پولیس والے فیض صاحب کو لے آئے اور انہیں بھی ہماری بس میں بٹھا دیا گیا۔ ہمیں دیکھ کر فیض صاحب بہت خوش ہوئے کیونکہ ہمارے برعکس انہیں مہینوں سے قید تنہائی میں رکھا گیا تھا اور وہ انسانوں کی صحبت کو ترسے ہوئے تھے۔

لیکن خوش ہونے کے باوجود اپنی روایتی کم گوئی ترک نہ کر سکے۔ ہم نے بات چیت کی کوشش بھی کی لیکن فیض صاحب چپ بیٹھے رہے۔۔۔ مسکراتے رہے، سگریٹ پر سگریٹ پیتے رہے۔ میں نے اسی دن فیصلہ کیا کہ اس مرد خدا کو دوسرے بندوں سے گفتگو کرنے پر مجبور کیا جائے گا آخر جیل میں ایسے ساتھی کا کیا فائدہ جو ہر وقت اپنے خول ہی میں رہے۔

جب ہم نے حیدرآباد سنٹرل جیل میں مستقل قیام کر لیا تو رفتہ رفتہ ہم لوگ ایک دوسرے سے مانوس ہو گئے۔ ہم گیارہ فوجی تھے، تین سویلین۔ فیض صاحب فوج میں لیفٹیننٹ کرنل رہ چکے تھے لیکن اس وقت وہ سید سجاد ظہیر اور محمد حسین عطا کے ساتھ سویلین ہی گردانے گئے، اور ایک خاتون تھیں یعنی بیگم نسیم اکبر جو بعد میں رہا کر دی گئیں۔ جیل کی فضا میں عہدے (RANK) کا فرق تو بہت ہی جلد ختم ہو گیا، جرنیل اور کپتان برابری سے ایک ہی سطح پر آ گئے لیکن عمر اور علم کی قدر باقی رہی۔ فیض صاحب اور سید سجاد ظہیر عمر میں بھی ہم سے بڑے تھے اور علم و دانش میں بھی، اس لئے ہم سب نوجوان فوجی افسر ان کی عزت کرتے تھے، گو ہنسی مذاق بھی جاری رہتا تھا اور (مرحوم) میجر اسحاق محمد



اکثر فیض صاحب کو "سادے منڈیا سیالکوٹیا" کہہ کر آواز دیا کرتے تھے۔

فیض صاحب نے رفتہ رفتہ کم گوئی ہی کی اور اہل زنداں سے کافی گھل مل گئے۔ کیونکہ ہمارے گروپ میں بیشتر حضرات ذہنی طور پر کافی حساس تھے اس لئے جیل میں ہر موضوع پر گرما گرم مباحث ہوا کرتے تھے۔ بعض دوست مثلاً محمد حسین عطا اور میجر اسحاق ان بحثوں میں کبھی کبھی صبر کا دامن چھوڑ دیتے اور گالی گلوچ پر اتر آتے۔ جس پر فیض صاحب ان کو "سنٹ اپ اوذا احمق" کہہ کر چپ کراتے۔ جیل کی طویل اسیری میں تقریباً ہر ایک نے کبھی نہ کبھی کسی دوسرے سے لڑائی جھگڑا کیا، سوائے دو حضرات کے جن میں سے فیض صاحب اور سید سجاد ظہیر، ان دونوں بزرگوں کو ایک دفعہ بھی غصے میں آتے یا کسی سے لڑتے نہیں دیکھا۔ نہایت ہی شریف، نرم مزاج اور روادار کمیونسٹ تھے!

آجکل ہمارے ملک میں جس طرح کا ماحول بن گیا ہے اس میں کسی کو کمیونسٹ کہنا گالی کے مترادف ہے فیض صاحب کے انتقال کے بعد جو مضامین چھپے ہیں ان میں بعض کو پڑھنے سے یوں لگتا ہے گویا فیض احمد فیض کوئی صوفی یا مومن تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ فیض صاحب ساری عمر راسخ العقیدہ کمیونسٹ رہے اور ان کا ایمان تھا کہ سائنٹیفک سوشلزم کی فتح کے بغیر دنیا بھر کے اور خاص طور پر تیسری دنیا کے عوام کے بنیادی مسائل کو حل نہیں کیا جا سکتا

ع گلوں میں رنگ بھرے باد نوبہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

ہمارے معاشرے میں کمیونسٹوں کے متعلق عجیب و غریب خیالات پائے جاتے ہیں کمیونسٹ ایک بھیانک اور خونخوار درندے کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے اسے وطن دشمن، غدار اور نہ جانے کیا کچھ کہا جاتا ہے۔ فیض صاحب کا کہنا تھا کہ کمیونسٹ سب سے پہلے محب الوطن ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ محب الوطن نہیں ہے تو وہ کمیونسٹ ہو ہی نہیں سکتا اسی لئے فیض صاحب کے ایک ایک شعر میں وطن کی محبت موجزن ہے

نثار میں تیری گلیوں پہ اے وطن کے جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

فیض صاحب کمیونسٹ خیالات کے حامل ہونے کے باوجود دریا شاید اسی کی بدولت پاکستانی معاشرے کی بہترین قدروں میں رچے ہوئے تھے جیل میں صبح اٹھ کر شیو کرنے کے بعد صاف ستھرا لباس عموماً تنگ پاجامہ کرتہ اور واسکٹ پہن لیتے اور خوشبو بھی لگاتے خوشبو کے متعلق استفسار کیا تو فرمایا میاں یہ تو سنت ہے۔ عرض کیا قبلہ آپ کمیونسٹ وغیرہ سے کیا مطلب، تو جواب ملا کہ مطلب کیوں نہیں ہے کیا ہم لوگ اسلامی تہذیب کا حصہ نہیں ہیں؟ مجھ جیسے لوگوں کو جنہوں نے انگریزی اسکولوں میں تعلیم پائی اور اٹھارہ سال کی عمر میں برٹش انڈین آرمی کے فرنگیانہ ماحول میں داخل ہو گئے فیض صاحب ٹامی (TOMMY) سمجھتے تھے اور اس خاکسار کو کئی دفعہ "ٹامی" کہہ کر مخاطب کیا۔ نظریات کے لحاظ سے وہ مجھ جیسوں کو لیفٹ لبرل (LEFT LIBERAL) سے آگے کا درجہ دینے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے اور غالباً ان کا تجزیہ صحیح بھی تھا بہرکیف کیونکہ راولپنڈی سازش کیس کے اسیروں میں عمر کے لحاظ سے میں سب سے چھوٹا تھا

اس لئے فیض صاحب مجھ سے ہمیشہ شفقت سے پیش آتے تھے مجھے انگریزی کے فحش فوجی گانوں پر کافی عبور تھا جو میں جیل میں کبھی کبھار فیض صاحب اور دیگر رفیقوں کو سناتا ان کو سن کر بہت ہنستے اور مجھے "پاجی" یا (IDIOT) کہہ کر داد دیا کرتے۔

ہم ۱۹۵۱ء میں جیل خانے میں پہنچے، اس وقت تک انگریزی دور کی بیشتر رسومات برقرار تھیں، جن میں آفیسرز میس کی روایات سرفہرست تھیں ان روایات میں ڈنر نائٹ، گیسٹ نائٹ وغیرہ کی تقریبات اور ان تقریبات میں شراب نوشی، یہ سب کچھ نہایت جائز بلکہ ضروری سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے راولپنڈی سازش والے فوجی افسروں میں تین چار صوفیوں کو چھوڑ کر باقی سب وقتاً فوقتاً وہسکی یا بیئر سے لطف اندوز ہو لینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے ایک صاحب لیفٹیننٹ کرنل ضیا الدین تو بڑے باقاعدہ پینے والے تھے اور روز شام کو چسکی لگاتے تھے فیض صاحب شراب کو گناہ صغیرہ گردانتے تھے، کہتے تھے قرآن مجید میں کئی جرائم کی سزا ہے، لیکن اللہ نے اپنی کتاب میں شراب پینے کی کوئی سزا نہیں رکھی

آئے کچھ ابر کچھ شراب آئے
اس کے بعد آئے جو عذاب آئے

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہم تمام پینے والے لوگ چار سال تک جیل میں رہے لیکن کسی نے بھی شراب کی کمی محسوس نہیں کی شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم میں سے بیشتر باقاعدہ پینے والے نہیں تھے اس دور میں فیض صاحب بھی اتنے ریگولر نہیں تھے جیل سے رہائی کے بعد رفتہ رفتہ ان کی شراب نوشی میں اضافہ ہو گیا، البتہ انتقال سے ایک سال پہلے انہوں نے سگریٹ اور شراب دونوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی حیدرآباد جیل کے زمانے میں صرف ایک کرنل ضیا الدین ملاوٹ تھے لیکن حیرت ہے کہ انہوں نے بھی جیل پہنچ کر تشنگی کا واویلا نہیں کیا۔

بحیثیت ایک شاعر فیض صاحب قدرتی طور پر حسن پرست تھے لیکن بوالہوس ہرگز نہیں تھے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فیض صاحب شاید کوئی "ڈان وان" یا اپلے لوٹے قسم کی چیز تھے لیکن یہ خیال بالکل صحیح نہیں ہے فیض صاحب خواتین کی صحبت کو پسند کرتے تھے اور کیوں نہ کرتے؟ لیکن اس سے یہ مطلب تو نہیں لینا چاہیئے کہ وہ عورتوں کے پیچھے بھاگتے رہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ خواتین کا پیچھا کریں خواتین ان کا پیچھا کرتی تھیں! فیض صاحب اس شعبہ زندگی میں ہمیشہ اعتدال کی حدود کے اندر ہی رہے، بہرکیف ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ فیض صاحب خود تو چھوٹے تھے لیکن طویل قامت خواتین کی بہت مدح سرائی کرتے تھے ان کی بیگم صاحبہ ایلس بھی قد میں فیض صاحب سے لمبی تھیں ملکہ ہیں، خدا انہیں سلامت رکھے

فیض صاحب میں غرور یا خود پسندی نام کو نہیں تھی۔ اگر دوست یار ان کی شاعری کی عظمت کے گن گاتے تو فیض صاحب کو میں نے کئی دفعہ یہ کہتے سنا، چھوڑو یار، ہم کچھ بھی نہیں ہیں، غالب، اقبال، میر ۔ وہ لوگ شاعر تھے ہم کیا ہیں، چند نظمیں اور چند غزلیں لکھ کر کونسا تیر مار لیا" یہ فقرہ وہ روایتی کسر نفسی کے طور پر نہیں بلکہ نہایت سنجیدگی اور خلوص سے کہتے تھے غالب کو تو وہ شاعری کا بادشاہ سمجھتے تھے ایک دفعہ جیل میں



دوستوں نے پوچھا کہ فیض صاحب یہ بتائیے کہ اردو شاعری میں سب سے بہترین غزل کون سی ہے۔ فیض صاحب نے کچھ دیر سوچا پھر کہنے لگے "میاں یہ کہنا تو بہت ہی مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے کہ بہترین غزل کون سی ہے میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ذاتی طور پر سب سے زیادہ پسند غالب کی وہ غزل ہے

ع مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

فیض صاحب کے پاس نظیر اکبر آبادی کا مجموعہ کلام بھی تھا وہ نظیر صاحب کو پہلا عوامی شاعر گردانتے تھے اور بہت تعریف کرتے تھے ایک دن میں نے کہا کہ فیض صاحب کیا بات ہے نظیر کی "آدمی جیتی کھیلیں میٹھے سے سنگا کھلی" تو ہنس کر بولے بات تو ٹھیک ہی کہتا ہے

میں نے فیض احمد فیض کے ساتھ حیدرآباد جیل میں تقریباً ڈیڑھ سال گزارا یعنی اس دوران ہم مقدمہ کے پندرہ ملزمین اسی جیل میں رہے عدالت میں جب ہمیں سزائیں سنائی گئیں تو اس کے چند دن بعد حکومت نے مقدمہ کے ملزمان کو حکم نامہ معاف رہا ہوگئیں ... اور میجر جنرل ... عدالت کی سزا کاٹ کے رہا کر دئے گئے تھے، ملک کی مختلف جیلوں میں بھیج دیا گیا ... جیل میں میجر جنرل اکبر خان، ... کے ساتھ ... اور فیض احمد فیض کو منٹگمری جیل بھیج دیا گیا ... س

کے بعد کبھی کبھار کسی خط کی وساطت سے فیض صاحب کو کوئی تازہ غزل یا نظم ہم تک پہنچ جاتی تھی، جسے ہم تبرک کے طور پر سنبھال کر رکھ لیتے تھے اور بار بار پڑھا کرتے تھے

جیل سے رہائی کے بعد ہر شخص اپنی بکھری ہوئی زندگی کو دوبارہ سمیٹنے کی تگ و دو میں مصروف ہو گیا اور ایام اسیری کی فرصت آزادی کی بے ساری میں تبدیل ہو گئی

ع سرسری ان سے ملاقات ہے گاہے گاہے
محفل غیر میں گاہے سر راہے گاہے

فیض صاحب اب اس دنیا میں نہیں ہیں ہم پندرہ اسیران راولپنڈی کیس میں سے اب صرف سات باقی رہ گئے ہیں پہلے جنرل نذیر گئے پھر سید سجاد ظہیر، پھر کیپٹن خضر حیات، میجر اسحاق محمد، ائیر کموڈور جنجوعہ، میجر حسن خان، بیگم نسیم اور اب عظیم ترین انسان فیض احمد فیض بھی رخصت ہو گئے پیارے پیارے لوگ چلے جاتے ہیں، یادیں باقی رہ جاتی ہیں فیض صاحب کے ساتھ گزارے ہوئے ایام ایک قیمتی یادگار ہیں جو زندگی بھر ساتھ رہیں گے ع

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ، کل ہماری باری ہے



فیض سے آخری ملاقات

ڈاکٹر قمر رئیس

فیض احمد فیض کی المناک ناگہانی موت نے لندن میں ان سے آخری ملاقات کی یاد تازہ کر دی۔ اس وقت یہ گمان بھی نہیں تھا کہ اردو کے اس عظیم اور ہر دلعزیز فنکار سے ہماری وہ ملاقاتیں آخری ملاقاتیں ثابت ہوں گی ۸ جولائی ۱۹۸۴ء کو جب انہیں علم ہوا کہ میں اور ڈاکٹر محمد حسن لندن پہنچ گئے ہیں تو وہ خود ملنے کے لئے شام کو ہماری قیام گاہ پر آئے ہمارے میزبان اور فیض کلچرل اکیڈمی کے صدر مجاہد ترمذی صاحب نے ان کے لئے شراب کا اہتمام کیا تو بولے "بھائی میں (الیس ریوی) سے نظر بچا کر آیا ہوں اب ان کی نگرانی سخت ہو گئی ہے میں نے بھی پینا ترک ہی کر دیا ہے لیکن اب اتنی دور سے آئے ہوئے دوستوں سے ملاقات کی تقریب تو منانا ہی ہوگی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بیٹھے رہے۔ دلی کے دوسرے دوستوں کا احوال پوچھتے رہے اپنی اور اپنی بیگم ایلس کی بیماری اور دونوں کے علاج کا حال بڑے دلچسپ انداز میں سناتے رہے۔ بولے "میری بیوی تو سیر و سیاحت کے لئے ماسکو گئی تھیں لیکن وہاں روسی ڈاکٹروں نے معائنہ کر کے ان سے کئی بیماریاں برآمد کر لیں اور علاج بھی شروع کر دیا" اس پر مجھے یاد آیا کہ اگست ۸۳ء میں ماسکو کے ایک مضافاتی اسپتال میں کیفی اعظمی صاحب زیر علاج تھے میں ان کو دیکھنے گیا تو معلوم ہوا کہ وہ تو اچھے بھلے ہیں لیکن ان کی بیگم شوکت صاحبہ کا آپریشن ہوا ہے۔ کیفی صاحب بولے "یہ تو مجھ سے کچھ ملنے آئی تھیں ان کی سنئے"

دوسرے دن فیض سمپوزیم کے اجلاسوں میں فیض صاحب بہت خوش تھے لندن یونیورسٹی کا سمینار روم حاضرین سے بھر گیا تھا۔ لیکن ایک دو کو چھوڑ کر سب ہندوستانی یا پاکستانی تھے اس میں سے بہت سے حضرات چھٹی لے کر اپنے محبوب شاعر کے بارے میں اس مذاکرہ میں شرکت کے لئے آئے تھے فیض صاحب ہم لوگوں سے کہنے لگے منتظمین نے یہ اچھا کیا کہ زبان کی کوئی قید نہیں رکھی

لندن یونیورسٹی میں فیض صاحب پر یہ مذاکرہ ان کی شاعری کی بین الاقوامی اہمیت اور مقبولیت کا اعتراف تھا لندن یونیورسٹی کی تاریخ میں یہ پہلا سمپوزیم تھا جو ہند و پاک کے کسی شاعر کے بارے میں ہوا ایسی جہانگیر مقبولیت اردو کے کسی دوسرے شاعر کا مقدر نہ بن سکی فیض صاحب کو بھی یقیناً اس حقیقت کا احساس ہوگا لیکن اس سے ان کی درویشی اور فقیری میں کوئی فرق نہیں آیا وہ ہر چھوٹے بڑے سے اسی مدھم مسکراہٹ کے ساتھ اسی پیار سے مل رہے تھے جو ان کی مومنی شخصیت کے دائمی حسن کا ایک حصہ تھا انہیں ایک پل کو بھی خیال نہیں آتا تھا کہ ایک لوح زماں اردو کی تخلیقی روایت اور عظمت کو انہوں نے ساری دنیا سے روشناس کر کے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا تھا آج وہ ہم میں نہیں ہیں تو خیال آتا ہے کہ اقبال کی موت پر انہوں نے جو اشعار کہے تھے وہ خود ان کی جدائی پر ان کے لاکھوں پرستاروں کے دلوں پر رحالی کہہ رہے ہیں

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گزر گیا
سنسان راہیں خلق سے آباد ہو گئیں
ویران میکدوں کا نصیبہ سنور گیا
اب دور جا چکا ہے وہ شاہ گدا نما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اداس ہیں
چند اک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص
دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے
اور اس کی لے سے سینکڑوں لذت شناس ہیں

فیض نے اردو ادب کو کیا دیا ہے اس کا اندازہ تو آنے والی صدیوں میں لگایا جاتا رہے گا لیکن اس میں شاید ہی دو رائیں ہوں کہ بیسویں صدی میں اردو نظم اور غزل دونوں کو بیک وقت امارت اور عظمت سے ہمکنار کرنے والے اقبال کے بعد فیض ہی ہیں معاصرین اور نئی نسل کے شاعروں پر بھی فیض کا اثر سب سے زیادہ رہا ہے۔



فیض کا آخری سفر

امنگ رپورٹ

ہسپتال سے فیض صاحب کا جسدِ خاکی لاہور کے ماڈل ٹاؤن ایچ بلاک کے بنگلہ نمبر ۹ میں لایا جا چکا ہے، اداسی اور خاموشی کی فضا ہر طرف طاری ہے لان میں فیض صاحب کے جنازے کے گرد ان کے عزیز و اقارب، احباب اور خواتین کی ایک بھیڑ ہے ——— کبھی کبھی سرگوشیوں، سسکیوں کی آواز اس دکھ بھرے سناٹے میں شگاف ڈال دیتی ہے

آج فیض صاحب کو پسند کرنے، ان کی تعریف کرنے، ان پر تنقید کرنے اور انہیں ناپسند کرنے والے سر آنکھوں پر ہیں، وہ اس مکان میں ہمیشہ کسی مسافر کی مانند رہے انہوں نے اسی مکان سے اپنے بیرونِ ملک اور اندرونِ ملک کے کئی سفر شروع کئے اور واپس لوٹ آئے

لیکن آج وہ آخری سفر پر روانہ ہونے والے ہیں جہاں سے واپس لوٹنے کی کوئی امید نہیں ٹھیک سوا گیارہ بجے کلمۂ شہادت کی آواز گونجی ہے، ہر زبان شہادت دے رہی ہے کہ اللہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔

کلمۂ شہادت کی اس تکرار کے ساتھ دوستوں اور عزیزوں نے فیض صاحب کے جنازے کو اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا ہے۔ زندگی کی شاہراہ پر جیسے رہبری کے نقشِ قدم چھوڑنے والا آج دوسروں کے شانوں پر اپنی آخری آرام گاہ کی طرف رواں ہے سسکیاں اور سرگوشیاں اشک، آہوں، چیخوں اور ہچکیوں میں بدل گئی ہیں، بہن اپنے ماں جائے کے لئے رو رہی ہے، بیوی شریکِ زندگی کے لئے ماتم کناں ہے اور بیٹیاں اپنے شفیق باپ کے لئے آنسو بہا رہی ہیں

لیکن وہ شخص جس نے اپنی زندگی میں کبھی دشمن کے آنسو بھی برداشت نہیں کئے آج وہ اپنے غمگساروں کے سینے پر تسلی والا ہاتھ رکھنے کے بجائے انہیں رلا کر جا رہا ہے۔

آج اپنے آخری سفر پر روانہ ہونے والے اس مسافر کے پاس آنے والوں میں وہ سب لوگ شامل ہیں جن کے درمیان وہ آخری لمحہ تک رہا ——— ان میں وہ بھی ہیں جو اس سے محبت کرتے رہے ——— اس کی تعریف کرتے رہے اور وہ بھی جو اس سے قدم قدم پر اختلاف کرتے رہے۔

آج فیض کے تمام حریف اور حلیف اس کی مغفرت کے لئے دعاگو ہیں ان میں مولوی بھی ہیں اور دانشور بھی، وکیل بھی ہیں اور سیاست دان بھی اخبار نویس بھی ہیں اور عزیز و اقارب بھی

اب جنازہ لان سے اٹھا کر کھلے میدان میں لا کر رکھ دیا گیا ہے سوگوار چہروں اور بھیگی ہوئی آنکھوں کے سامنے فیض کی زندگی کے ۷۳ برس، بے حس و حرکت اور بے روح پڑے ہیں۔

نمازِ جنازہ کے بعد لوگوں نے ان تاریخی اور قیمتی مہ و سال کو فیض کی جسدِ خاکی کی شکل میں اپنے شانوں پر اٹھا لیا ماڈل ٹاؤن کے ایچ بلاک سے قبرستان تک فیض صاحب کے چاہنے والوں اور ان کی جدائی پر رونے والوں کا ایک ہجوم ہے، بار بار کاندھا بدلتے لوگوں کا ایک سیلاب رواں ہے چہرے اداس ہیں، ہر شخص فیض کے اس شعر کی تصویر بنا ہے

لبوں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

اب فیض صاحب کا جنازہ ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں لایا گیا ہے یہ قبرستان [illegible] ہے حفیظ جالندھری کے مرقد سے چند قدم کے فاصلے پر فیض احمد فیض کے لئے بنائی گئی آخری آرام گاہ کے پاس ان کا جنازہ رکھ دیا گیا ہے۔

اب فیض کے چاہنے والے انہیں اس آرام گاہ میں اتار رہے ہیں، ہر شخص مٹھی مٹھی خاک ڈال کر اس مجاہد کے لئے دعا کر رہا ہے قبر پر عقیدت کے پھول چڑھائے جا رہے ہیں ان پھولوں میں گورنر پنجاب کی طرف سے بھیجے گئے پھول بھی ہیں اور تنظیم آزادیٔ فلسطین اور فلسطینیوں کی عقیدت کے پھول بھی۔ ٹریڈ یونین آف پاکستان کی طرف سے محمد ابراہیم ساتھیوں کے ساتھ سرخ پرچموں کے ساتھ فیض کو خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں

فیض کو خراجِ عقیدت پیش کرنے والوں میں قتیل شفائی بھی تھے انہوں نے فیض کی موت پر فی البدیہہ کہا۔

کتنا عظیم تھا کہ وہ مرنے سے پیشتر
اپنے وطن کی عالمی پہچان بن گیا
شاعر تھا فیض واعظ و مُلّا نہ تھا مگر
مجھ جیسے کافروں کا وہ ایمان بن گیا

اور ان تمام عقیدتوں، مغفرت کی دعاؤں، آنسوؤں اور سسکیوں کے باوجود فیض کے مداح، دوست، عزیز و اقارب انہیں منوں مٹی کے نیچے دفن کر کے تھکے تھکے قدموں سے واپس لوٹ رہے ہیں۔

فیض صاحب نے اپنی زندگی میں کہا تھا
"میں کس سے ناراض ہو جاؤں یہ سوچتا ہوں"

وہ ایسے سوئے ہیں کہ اب کبھی نہیں اٹھیں گے... خدا جانے وہ کس سے ناراض ہو کر اتنی گہری نیند سوئے ہیں







عمرِ گذشتہ کی کتاب





عہدِ طفلی سے عنفوانِ شباب تک

مرزا ظفر الحسن

ہمارے شعراء کو مستقلاً یہ شکایت رہی ہے کہ زمانے نے ان کی قدر نہیں کی۔ ناقدریٔ ابنائے وطن ہماری شاعری کا ایک مستقل موضوع ہے۔ ہمیں اس سے اُلٹ شکایت یہ ہے کہ ہم پر لطف و عنایات کی اس قدر بارش رہی ہے، ایسے دوستوں کی طرف سے ملنے والوں کی طرف سے اور ان کی جانب سے بھی جن کو ہم جانتے بھی نہیں کہ اکثر ندامت ہوتی ہے کہ اتنی محبت کا مستحق ہونے کے لیے جو تھوڑا بہت کام ہم نے کیا ہے اس سے بہت زیادہ ہمیں کرنا چاہیے تھا۔

یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے بچپن ہی سے اس قسم کا تاثر رہا ہے جب ہم بہت چھوٹے تھے اسکول میں پڑھتے تھے تو اسکول کے لڑکوں کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کے تعلقات قائم ہو گئے تھے خواہ مخواہ انھوں نے ہمیں اپنا لیڈر تسلیم کر لیا تھا حالانکہ لیڈری کی صفات ہم میں نہیں تھیں، یا تو آدمی بہت لٹھ مار ہو کر دُوسرے اس کا رعب مانیں یا وہ سب سے بڑا عالم ہو۔ ہم پڑھنے لکھنے میں ٹھیک تھے، کھیل بھی لیتے تھے لیکن پڑھائی میں ہم نے کوئی ایسا کمال پیدا نہیں کیا تھا کہ لوگ ہماری طرف متوجہ ہوں۔

بچپن کا میں سوچتا ہوں تو ایک یہ بات خاص طور سے یاد آتی ہے کہ ہمارے گھر میں خواتین کا ایک ہجوم تھا ہم تین بھائی تھے ان میں ہمارے چھوٹے بھائی (عنایت) اور بڑے بھائی (طفیل) خواتین سے الگ ہو کر کھیل کود میں مصروف رہتے تھے ہم اکیلے ان خواتین کے ہاتھ آ گئے اس کا کچھ نقصان بھی ہوا اور کچھ فائدہ بھی۔ فائدہ تو یہ ہوا کہ ان خواتین نے ہم کو نہایت شریفانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا۔ جس کی وجہ سے کوئی غیر مہذب یا اُجڈ قسم کی بات اس زمانے میں ہمارے منہ سے نہیں نکلتی تھی اب بھی نہیں نکلتی۔ نقصان یہ ہوا، جس کا مجھے اکثر افسوس ہوتا ہے کہ بچپن میں کھلنڈرے پن یا ایک طرح کے لہو و لعب کی زندگی گزارنے سے ہم محروم رہے۔ تماشا یہ کہ گلی میں کوئی پتنگ اُڑا رہا ہے، کوئی گولیاں کھیل رہا ہے، کوئی لٹو چلا رہا ہے، ہم بس کھیل کود دیکھتے رہتے تھے۔ اکیلے بیٹھ کر ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے کے مصداق ہم ان تماشوں کے صرف تماشائی بنے رہتے اور ان میں شریک ہونے کی ہمت اس لیے نہیں ہوتی تھی کہ اسے شریفانہ شغل یا شریفانہ کام نہیں سمجھتے تھے۔

اساتذہ بھی ہم پر مہرباں رہے۔ آج کل کی میں نہیں جانتا، ہمارے زمانے میں تو اسکول میں سخت پٹائی ہوتی تھی۔ ہمارے عہد کے اُستاد تو نہایت ہی جلاد قسم کے لوگ تھے صرف یہی نہیں کہ ان میں سے کسی نے ہم کو ہاتھ نہیں لگایا بلکہ ہر کلاس میں ہم کو مانیٹر بناتے تھے بلکہ (ساتھی لڑکوں کو) سزا دینے کا منصب بھی ہمارے حوالے کرتے تھے یعنی فلاں کو چانٹا لگاؤ، فلاں کو تھپڑ مارو۔ اس کام سے ہمیں بہت کوفت ہوتی تھی اور ہم کوشش کرتے تھے کہ جس قدر بھی ممکن ہو یوں سزا دیں کہ ہمارے شکار کو وہ سزا محسوس نہ ہو طمانچے کی بجائے گال تھپتھپا دیا یا کان آہستہ سے کھینچا وغیرہ۔ کبھی ہم پکڑے جاتے تو اُستاد کہتے یہ کیا کر رہے ہو زور سے چانٹا مارو۔

دو تأثر بہت گہرے ہیں ایک تو یہ کہ بچوں کی جو دلچسپیاں ہوتی ہیں ان سے محروم رہے۔ دُوسرے یہ کہ اپنے دوستوں، ہم جماعتوں اور اپنے اساتذہ سے ہمیں بے پایاں شفقت اور خلوص ملا جو بعد کے زمانے کے دوستوں اور معاصرین سے ملا اور آج بھی مل رہا ہے۔

صبح ہم اپنے ابا کے ساتھ فجر کی نماز پڑھنے مسجد جایا کرتے تھے۔ معمول یہ تھا کہ اذان کے ساتھ ہم اُٹھ بیٹھے، ابا کے ساتھ مسجد گئے، نماز ادا کی اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی سے جو اپنے وقت کے بڑے فاضل تھے، درسِ قرآن سنا، ابا کے ساتھ ڈیڑھ دو گھنٹے کی سیر کے لیے گئے، پھر اسکول۔ رات کو ابا بلایا کرتے خط لکھنے کے لیے۔ اس زمانے میں انہیں خط لکھنے میں کچھ دقت ہوتی تھی ہم ان کے سیکرٹری کا کام انجام دیتے تھے۔ انہیں اخبار بھی پڑھ کر سناتے تھے۔ ان مصروفیات کی وجہ سے ہمیں بچپن میں بہت فائدہ ہوا۔ اُردو انگریزی اخبارات پڑھنے اور خطوط لکھنے کی وجہ سے ہماری استعداد میں کافی اضافہ ہوا۔

ایک اور یاد تازہ ہوئی۔ ہمارے گھر سے ملی ہوئی ایک دکان تھی، جہاں کتابیں کرائے پر ملتی تھیں۔ ایک کتاب کا کرایہ دو پیسے ہوتا۔ وہاں ایک صاحب ہوا کرتے تھے جنہیں سب بھائی صاحب کہتے تھے۔ بھائی صاحب کی دکان میں اُردو ادب کا بہت بڑا ذخیرہ جمع تھا۔ ہماری چھٹی ساتویں جماعت کی طالب علمی میں جن کتابوں کا رواج تھا وہ آجکل قریب قریب مفقود ہو چکی ہیں جیسے طلسم ہوشربا، فسانۂ آزاد، عبدالحلیم شرر کے ناول وغیرہ۔ یہ سب کتابیں پڑھ ڈالیں اس کے بعد شاعروں کا کلام پڑھنا شروع کیا۔ داغ کا کلام پڑھا میر کا کلام۔ غالب تو اس وقت بہت زیادہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ دُوسروں کا کلام بھی آدھا سمجھ میں آتا تھا اور آدھا نہیں آتا تھا لیکن ان کا دل پہ اثر کچھ عجیب قسم کا ہوتا تھا۔ یُوں شعر سے لگاؤ پیدا



ہُوا اور ادب میں دلچسپی ہونے لگی۔

ہمارے ابا کے مُنشی گھر کے ایک طرح کے منیجر بھی تھے ہمارا اُن سے کسی بات پر اختلاف ہو گیا تو انھوں نے کہا کہ اچھا آج ہم تمھاری شکایت کریں گے کہ تم ناول پڑھتے ہو اسکول کی کتابیں پڑھنے کی بجائے چھپ کر اَنٹ شنٹ کتابیں پڑھتے ہو۔ ہمیں اس سے بہت ڈر لگا اور ہم نے ان کی بہت منت کی کہ شکایت نہ کریں مگر وہ نہ مانے اور ابا سے شکایت کر ہی دی۔ ابا نے ہمیں بُلایا اور کہا میں نے سُنا ہے تم ناول پڑھتے ہو۔ میں نے کہا جی ہاں۔ کہنے لگے ناول ہی پڑھنا ہے تو انگریزی ناول پڑھو اُردو کے ناول اچھے نہیں ہوتے۔ شہر کے قلعہ میں جو لائبریری ہے وہاں سے ناول لا کر پڑھا کرو

ہم نے انگریزی ناول پڑھنے شروع کیے ڈِکنس، ہارڈی اور نہ جانے کیا کیا پڑھ ڈالا۔ وہ بھی آدھا سمجھ میں آتا تھا اور آدھا پلّے نہ پڑتا تھا۔ اس مطالعہ کی وجہ سے ہماری انگریزی بہتر ہو گئی۔ دسویں جماعت میں پہنچنے تک محسوس ہُوا کہ بعض استاد پڑھانے میں کچھ غلطیاں کر جاتے ہیں۔ ہم ان کی انگریزی درست کرنے لگے اس پر ہماری پٹائی تو نہ ہُوئی البتہ وہ اُستاد کبھی خفا ہو جاتے اور کہتے اگر تمھیں ہم سے اچھی انگریزی آتی ہے تو پھر تم ہی پڑھایا کرو ہم سے کیوں پڑھتے ہو۔

اس زمانے میں کبھی کبھی مجھ پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی جیسے یکایک آسمان کا رنگ بدل گیا ہے۔ بعض چیزیں کہیں دُور چلی گئی ہیں دُھوپ کا رنگ اچانک حنائی ہو گیا ہے۔ پہلے جو دیکھنے میں آیا تھا، اس کی صُورت بالکل مختلف ہو گئی ہے۔ دُنیا ایک طرح کی پردۂ تصویر کے قسم کی چیز محسوس ہونے لگتی تھی۔ اس کیفیت کا بعد میں بھی کبھی کبھی احساس ہُوا ہے مگر اب نہیں ہوتا۔

مشاعرے بھی ہُوا کرتے تھے ہمارے گھر سے ملی ہُوئی ایک حویلی تھی جہاں سردیوں کے زمانے میں مُشاعرے کیے جاتے تھے۔ سیالکوٹ میں پنڈت راج نرائن ارمان، ہُوا کرتے تھے جو ان مُشاعروں کے انتظامات کرتے تھے۔ ایک بزرگ منشی سراج دین مرحوم تھے علامہ اقبال کے دوست سری نگر میں مہاراجہ کشمیر کے میر منشی وہ صدارت کیا کرتے تھے۔

جب دسویں جماعت میں پہنچے تو ہم نے بھی تُک بندی شروع کر دی اور ایک دو مشاعروں میں شعر پڑھ دیے۔ منشی سراج دین نے ہم سے کہا میاں ٹھیک ہے تم بہت تلاش سے شعر کہتے ہو مگر یہ کام چھوڑ دو۔ ابھی تو تم پڑھو لکھو اور جب تمھارے دل و دماغ میں پختگی آ جائے تب یہ کام کرنا۔ اس وقت یہ تضیعِ اوقات ہے۔ ہم نے شعر کہنا ترک کر دیا۔

جب ہم مرے کالج سیالکوٹ میں داخل ہُوئے اور وہاں پروفیسر یوسف سلیم چشتی اُردو پڑھانے آئے جو اقبال کے مُفسّر بھی ہیں تو انھوں نے مشاعرے کی طرح ڈالی اور کہا طرح پر شعر کہو۔ ہم نے کچھ شعر کہے اور ہمیں بہت داد ملی چشتی صاحب نے منشی سراج دین کے بالکل خلاف مشورہ دیا اور کہا فوراً اس طرف توجہ کرو شاید تم کسی دن شاعر ہو جاؤ۔

گورنمنٹ کالج لاہور چلے گئے جہاں بہت ہی فاضل اور مشفق اساتذہ سے نیاز مندی ہُوئی پطرس بُخاری تھے، اسلامیہ کالج میں ڈاکٹر تاثیر تھے، بعد میں صوفی تبسم صاحب آ گئے ان کے علاوہ شہر کے جو بڑے ادیب تھے امتیاز علی تاج تھے، چراغ حسن حسرت، حفیظ جالندھری صاحب تھے۔ اختر شیرانی تھے ان سب سے ذاتی مراسم ہو گئے۔ ان لوگوں اساتذہ اور طلباء کا رشتہ ادب کے ساتھ ساتھ کچھ دوستی کا سا بھی ہوتا تھا۔ کالج کی کلاسوں میں تو شاید ہم نے کچھ زیادہ نہیں پڑھا لیکن ان بزرگوں کی صحبت اور محبت سے بہت کچھ سیکھا۔ ان کی محفلوں میں ہم پر شفقت ہوتی تھی اور ہم وہاں سے بہت کچھ حاصل کر کے اُٹھتے تھے۔

ہم نے اپنے دوستوں سے بھی بہت کچھ سیکھا۔ جب شعر کہتے تو سب سے پہلے خاص دوستوں ہی کو سناتے تھے۔ ان سے داد ملتی تو مشاعروں میں پڑھتے۔ اگر کوئی شعر خود کو پسند نہ آیا یا دوستوں نے کہا نکال دو تو اسے کاٹ دیتے۔ ایم اے میں پہنچنے تک باقاعدہ لکھنا شروع کر دیا تھا۔

ہمارے ایک دوست ہیں خواجہ خورشید انور۔ ان کی وجہ سے ہمیں موسیقی میں دلچسپی پیدا ہُوئی۔ خورشید انور پہلے تو دہشت پسند تھے، بھگت سنگھ گروپ میں شامل۔ انھیں سزا بھی ہُوئی جو بعد میں معاف کر دی گئی۔ دہشت پسندی ترک کر کے وہ موسیقی کی طرف مائل ہُوئے۔ ہم دن میں کالج جاتے اور شام کو خورشید انور کے والد خواجہ فیروز الدین مرحوم کی بیٹھک میں بڑے بڑے استادوں کا گانا سنتے یہاں اس زمانے کے سب ہی اُستاد آیا کرتے تھے اُستاد توکّل حسین خاں، اُستاد عبدالوحید خاں، استاد عاشق علی خاں اور چھوٹے غلام علی خاں وغیرہ۔ ان استادوں کے ہم عصر اور ہمارے دوست رفیق غزنوی مرحوم سے بھی صحبت ہُوتی تھی رفیق لا، کالج میں پڑھتے تھے پڑھتے تو خاک تھے بس رسمی طور پر کالج میں داخلہ لے رکھا تھا۔ کبھی خورشید انور کے کمرے میں اور کبھی رفیق کے کمرے میں بیٹھک ہو جاتی تھی غرض اس طرح ہمیں اس فنِ لطیف سے حظ اندوز ہونے کا کافی موقع ملا۔

جب ہمارے والد فوت ہُوئے تو پتہ چلا کہ گھر میں کھانے تک کو کچھ نہیں ہے۔ کئی سال تک در بدر پھرے اور فاقہ مستی کی۔ اس میں بھی لُطف آیا اس لیے کہ اس کی وجہ سے تماشائے اہلِ کرم دیکھنے کا بہت موقع ملا۔ خاص طور سے اپنے دوستوں سے کالج میں ایک چھوٹا سا حلقہ بن گیا تھا۔ کوئٹہ کے ہمارے دو دوست تھے احتشام الدین اور شیخ احمد حُسین ڈاکٹر حمید الدین بھی اس حلقے میں شامل تھے۔ ان کے ساتھ شام کو محفل رہا کرتی۔ جوانی کے دنوں میں جو دُوسرے واقعات ہوتے ہیں وہ بھی ہُوئے اور ہر کسی کے ساتھ ہوتے ہیں۔

گرمیوں میں تعطیلات ہوتیں تو ہم کبھی خورشید انور اور بھائی طفیل کے ساتھ سری نگر چلے جایا کرتے اور کبھی اپنی ہمشیرہ کے پاس لائل پور پہنچ جاتے۔ لائل پور میں باری علیگ اور ان کے گروہ کے دُوسرے لوگوں سے ملاقات رہتی۔ کبھی اپنی سب سے بڑی ہمشیرہ کے ہاں دھرم سالہ چلے جاتے۔ جہاں مناظرِ قدرت دیکھنے کا موقع ملتا اور دل پر ایک خاص قسم کا نقش ہوتا۔ ہمیں انسانوں سے جتنا لگاؤ رہا اتنا قدرت کے مناظر اور مطالعۂ حُسنِ فطرت سے نہیں رہا پھر بھی ان دنوں میں نے محسوس کیا کہ شہر کے جو گلی محلے ہیں ان میں بھی اپنا ایک حُسن ہے جو دریا، صحرا، کوہسار یا سرو و سمن سے کم نہیں۔ البتہ اس کو دیکھنے کے لیے بالکل دُوسری طرح کی نظر چاہیے۔

مجھے یاد ہے ہم مستی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ ہمارا گھر بالائی سطح پر تھا۔ نیچے مدرو بستی تھی چھوٹا سا ایک صحن بھی تھا چار طرف مکانات تھے ایک رات چاند نکلا ہُوا تھا چاندنی بدرو اور اردگرد کے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پڑ رہی تھی چاندنی اور سائے یہ سب مل کر کچھ عجیب پُراسرار منظر بن گئے تھے۔ چاند کی عنایت سے منظر کی بدصورتی چھپ گئی





تھی اور کچھ عجیب ہی قسم کا حُسن پیدا ہو گیا تھا۔ جسے میں نے لکھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ ایک آدھ نظم میں منظر کشی کی ہے جب شہر کی گلیوں محلوں اور کٹڑیوں میں کبھی دوپہر کے وقت کبھی شام کے وقت کچھ اس قسم کا رُوپ آ جاتا ہے جیسے معلوم ہو کوئی پرستان ہے یہ "تہ بام، خود فراموشی" یام "دورِ خامشی کے بوجھ سے چور" وغیرہ اسی زمانے سے متعلق ہیں

ایم اے میں پہنچے تو کبھی کلاس میں جانے کی ضرورت ہوئی کبھی بالکل جی نہ چاہا۔ دُوسری کتابیں جو نصاب میں نہیں تھیں پڑھتے رہے۔ اس لیے امتحان میں کوئی خاص اعزاز حاصل نہیں کیا لیکن مجھے معلوم تھا کہ جو لوگ اوّل دوم آتے ہیں ہم ان سے زیادہ جانتے ہیں خواہ ہمارے نمبران سے کم ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ بات ہمارے اساتذہ بھی جانتے تھے جب کسی اُستاد کا، جیسے پروفیسر ڈکنسن یا پروفیسر ہرلیتھا چند کا پالیا تھے، لیکچر دینے کو جی نہ چاہتا تو ہم سے کہتے ہماری بجائے تم لیکچر دو ایک ہی بات ہے البتہ پروفیسر بخاری بڑے قاعدے کے پروفیسر تھے وہ ایسا نہیں کرتے تھے پروفیسر ڈکنسن کے ذمّے انیسویں صدی کا نثری ادب تھا مگر انھیں اس موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے ہم سے کہا دو تین لیکچر تیار کر لو۔ دوسرے جو دو تین لائق لڑکے ہمارے ساتھ تھے ان سے بھی کہا دو دو تین تین لیکچر تم لوگ بھی تیار کر دو۔ کتابوں وغیرہ کے بارے میں کچھ پُوچھنا ہو تو آ کے ہم سے پُوچھ لیا۔ یوں ہم استاد ہم اسی زمانے میں ہو گئے تھے۔

ابتدائی شاعری کے دوران میں یا کالج کے زمانے میں ہمیں کوئی خیال ہی نہ گزرا کہ ہم شاعر بنیں گے۔ سیاست وغیرہ تو اس وقت ذہن میں بالکل ہی نہ تھی۔ اگرچہ اس وقت کی تحریکوں، مثلاً کانگریس تحریک، خلافت تحریک یا بھگت سنگھ کی دہشت پسند تحریک کے اثرات تو ذہن میں تھے۔ مگر ہم خود ان میں سے کسی قصے میں شریک نہیں تھے

شروع میں خیال ہُوا کہ ہم کوئی بڑے کرکٹر بن جائیں کیونکہ لڑکپن سے کرکٹ کا شوق تھا اور بہت کھیل چکے تھے پھر جی چاہا استاد بننا چاہیے۔ ریسرچ کرنے کا شوق تھا۔ ان میں سے کوئی بات بھی نہ بنی۔ ہم کرکٹر بنے نہ تھا اور نہ ریسرچ کیا البتہ اُستاد ہو کر امرت سر چلے گئے۔

ہماری زندگی کا شاید سب سے خوشگوار زمانہ امرت سر ہی کا تھا اور کئی اعتبار سے ایک تو اس وجہ سے کہ جب ہمیں پہلی دفعہ پڑھانے کا موقع ملا تو بہت لُطف آیا۔ پہلے طلبا سے دوستی کا لطف۔ ان سے ملنے اور روزمرہ کی رسم و راہ کا لطف، ان سے کچھ سیکھنے اور انھیں پڑھانے کا لُطف۔ ان لوگوں سے دوستی اب تک قائم ہے۔ دُوسرے یہ کہ اس زمانے میں کچھ سنجیدگی سے شعر لکھنا شروع کیا۔ تیسرے یہ کہ امرت سر ہی میں پہلی بار سیاست میں تھوڑی بہت بصیرت ایسے کچھ رُفقا کی وجہ سے پیدا ہُوئی جن میں محمود الظفر تھے ڈاکٹر رشید جہاں تھیں، بعد میں ڈاکٹر تاثیر آ گئے تھے یہ ایک نئی دُنیا ثابت ہُوئی۔ مزدُوروں میں کام شروع کیا۔ سول لبرٹیز کی ایک انجمن بنی تو اس میں کام کیا ترقّی پسند تحریک شروع ہُوئی تو اس کی تنظیم میں کام کیا ان سب سے ذہنی تسکین کا ایک بالکل نیا میدان ہاتھ آیا

ترقّی پسند ادب کے بارے میں بحثیں شروع ہُوئیں اور ان میں حصّہ لیا ادبِ لطیف کی ادارت کی پیش کش ہُوئی تو دو برس اس کا کام کیا اس زمانے میں لکھنے والوں کے دو بڑے گروہ تھے ایک "ادب برائے ادب" والے، دُوسرے ترقّی پسند تھے۔ کئی برس تک ان دونوں کے درمیان بحثیں چلتی رہیں جس کی وجہ سے کافی مصروفیت رہی جو بجائے خود ایک بہت ہی دلچسپ اور تسکین دہ تجربہ تھا برصغیر میں ریڈیو شروع ہُوا ریڈیو میں ہمارے دوست تھے۔ ایک سید رشید احمد تھے جو ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر جنرل ہُوئے دُوسرے سوماناتھ چپ تھے، جو آجکل ہندوستان میں شعبۂ سیاحت کے سربراہ ہیں دونوں باری باری سے لاہور کے اسٹیشن ڈائرکٹر مقرر ہُوئے ہم اور ہمارے ساتھ شہر کے دو چار اور ادیب ڈاکٹر تاثیر، حسرت، صُوفی صاحب اور ہری چند اختر وغیرہ ریڈیو آنے جانے لگے اس زمانے میں ریڈیو کا پروگرام ڈائرکٹر آف پروگرامز نہیں بناتا تھا ہم لوگ مل کر بنایا کرتے تھے۔ نئی نئی باتیں سوچتے تھے اور ان سے پروگرام مرتب کرتے تھے۔ ان دنوں ہم نے ڈرامے لکھے، فیچر لکھے دو چار کہانیاں لکھیں یہ سب ایک مستقل مشغلہ تھا۔ رشید صاحب دلّی چلے گئے تو ہم دہلی جانے لگے۔ وہاں نئے نئے لوگوں سے ملاقاتیں ہُوئیں۔ دہلی اور لکھنؤ کے لکھنے والے گروہوں سے شناسائی ہُوئی۔ مجاز، سردار جعفری، جاں نثار اختر، جذبی اور مخدوم مرحوم سے ریڈیو کے توسّط سے رابطہ پیدا ہوا جس سے دوستی کے علاوہ بصیرت اور سُوجھ بُوجھ میں طرح طرح کے اضافے ہُوئے۔ وہ سارا زمانہ مصروفیت کا بھی تھا اور ایک طرح سے بے فکری کا بھی۔

دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں

ایک اِک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں

رقصِ مے تیز کرو، ساز کی لَے تیز کرو
سُوئے مے خانہ سفیرانِ حرم آتے ہیں

کچھ ہمیں کو نہیں احسان اُٹھانے کا دماغ
وہ تو جب آتے ہیں، مائل بہ کرم آتے ہیں

فیض احمد فیض



بچپن کی قرأت سے جوش کی بزرگی تک

عبادت بریلوی

عبادت : فیض صاحب آج میں آپ سے چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں ۔ آپ کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں ۔ سب سے پہلے تو آپ یہ بتائیے کہ آپ کی ولادت کب اور کہاں ہوئی اور وہ ماحول کیسا تھا جس میں آپ نے اپنی زندگی کے ابتدائی دن گزارے ؟

فیض : ولادت تو میری سیالکوٹ کی ہے ۔ تاریخ ولادت مجھے خود نہیں معلوم ۔ ایک ہم نے فرضی سی رکھی ہے لیکن ۔

عبادت : اچھا وہی بتا دیجئے ۔

فیض : ۷ ۔ جنوری ۱۹۱۱ء ہے ۔ لیکن یہ محض اسکول کے سرٹیفکیٹ سے نقل کی گئی ہے ۔ اور میں نے سنا ہے کہ اُس زمانے میں اسکول میں جو تاریخیں لکھی جاتی تھیں وہ سب جعلی ہوتی تھیں اِس لئے کہ وہ اِس حساب سے لکھی جاتی تھیں کہ فلاں عمر میں آدمی میٹرک پاس کرے گا ۔ اس کے بعد انگریزی سرکاری نوکری کے لئے عمر کم ہونی چاہئے ۔ تو بچپن میرا سیالکوٹ ہی میں گزرا ۔ اسکول میرا اسکاچ مشن اسکول تھا ۔ اِس کے ساتھ میرے استاد تھے شمس العلما مولوی میر حسن جن سے میں نے چھٹی جماعت میں عربی کی صرف و نحو پڑھی اور اُن سے زیادہ قریبی استاد تھے مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی بہت بڑے فاضل تھے ۔ ابتدا میں نے اُن سے پڑھی ، ابتدائی کتابیں اُن سے پڑھیں ۔ اِس کے بعد قرآن اور حدیث کا درس بھی اُن سے لیا برسوں ۔ تو بچپن تو وہیں گزرا ۔ اُس کے بعد ایف اے تک میں نے سیالکوٹ میں تعلیم پائی پھر لاہور چلا گیا ۔

عبادت : اچھا لاہور میں کون سے اساتذہ ایسے تھے جن سے آپ نے استفادہ کیا ؟

فیض : لاہور میں گورنمنٹ کالج کا طالب علم تھا ۔ وہاں پر ہمارے انگریزی کے دو استاد تھے جو اپنے زمانے میں مستند سمجھے جاتے تھے ۔ ایک پروفیسر ڈکنسن ۔ دوسرے پروفیسر ڈ ... جو آج کل یہاں پر ہیں ۔ میرے ہمارے بخاری صاحب تھے پطرس ۔ اِن کے علاوہ فلسفے میں پروفیسر حیدر تھے ، عربی میں ڈاکٹر صدرالدین مرحوم تھے ۔ اگرچہ میں فارسی کا طالب علم نہیں تھا لیکن قاضی فضل حق صاحب سے مراسم تھے اِس لئے کہ وہ ن

بزم سخن کے صدر بھی تھے ۔ اِن حضرات کے علاوہ اُن دنوں جو زیادہ معتبر اور بزرگ ادیب اور لکھنے والے تھے وہ بیشتر یک جا ہوا کرتے تھے تاثیر مرحوم کے گھر پر یا صوفی تبسم صاحب کے یہاں یا بخاری صاحب کے یہاں ۔ تو زیادہ تعلیم تو میں سمجھتا ہوں کہ کالج کے اندر نہیں ہوئی ۔ کالج کے باہر ہوئی ۔

عبادت : بے شک ان صحبتوں میں ضرور ہوئی ہوگی ۔

فیض : ہاں ان لوگوں کی صحبتوں میں ۔ خاص طور پر پروفیسر بخاری صاحب کے یہاں تو باقاعدگی سے ہر مہینے ایک محفل ہوا کرتی تھی جس کا نام انہوں نے " بزم اُردو " رکھا تھا جو بعد میں " بزم احباب " کے نام سے مشہور ہوئی ۔ دوسرے صوفی صاحب کا دیوان خانہ تھا جہاں ہم لوگ جمع رہتے تھے ۔ تیسرے تاثیر صاحب کا گھر تھا ۔ اُس زمانے کے بیشتر بزرگوں سے اِن ہی لوگوں کی بدولت گھروں پر ملاقات ہوئی ۔

عبادت : اچھا فیض صاحب یہ بتائیے کہ آپ نے شاعری کب شروع کی ؟

فیض : یہ تو مجھے یاد ہے کہ تُک بندی کیسے شروع ہوئی ۔ شاعری کب شروع کی یہ کہنا ذرا مشکل ہے جب ہم اسکول میں پڑھتے تھے تو ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کو خیال آیا کہ لڑکوں کا ایک مقابلہ کرنا چاہئے ۔ شاعری کا نہیں شعر سازی کا مقابلہ کہنا چاہئے ۔ کہا گیا کہ مصرع طرح پر آپ سب لوگ طبع آزمائی کریں تو انعام دیا جائے گا ۔ اِس قسم کا جو پہلا مقابلہ ہوا اس کے مُنصف اور جج تھے شمس العلما مولوی میر حسن صاحب ۔ اتفاق سے اِس مقابلے میں ہمیں انعام مل گیا ۔ انعام سے زیادہ وہ تمغہ تھا جو ہم نے پسند کیا ۔ اور انعام مجھے یاد ہے ایک روپیہ ملا تھا ۔

عبادت : بہت خوب !

فیض : اِس سے تھوڑا سا ہمیں مغالطہ ہو گیا کہ شاید ہم کچھ کہہ سکتے ہیں ۔ میرے گھر کے ساتھ ایک بہت بڑا مکان تھا ۔ حویلی تھی اُس پرانے زمانے کی ۔ وہاں پر باقاعدگی سے مشاعرے ہوا کرتے تھے ۔ ہمارے



فضاؤں کے قافلہ سالار!

پی آئی اے نے سبقت حاصل کی ہے مثال کے طور پر ہم پہلی ایشیائی فضائی کمپنی ہیں جس نے اپنے بیڑے میں جیٹ طیاروں کو شامل کیا یہ ۱۹۵۹-۶۰ کی بات ہے پھر ۱۹۶۴ میں ہمیں ایک منفرد اعزاز حاصل ہوا شہری ہوابازی کی تاریخ میں پہلی بار ہم نے ہی عوامی جمہوریہ چین سے تجارتی معاہدوں پر باقاعدہ فضائی رابطہ قائم کیا یہی نہیں قراقرم کی بلندیوں پر سے چین جانے کا تاریخی راستہ بھی ہماری دریافت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پی آئی اے پہلی غیر کمیونسٹ فضائی کمپنی ہے جس نے ماسکو کے راستے ایشیا اور یورپ کے درمیان فضائی سروس شروع کی۔

یہ فہرست بہت طویل ہے اور شہری ہوابازی کی دنیا میں ہماری ۳۰ سالہ کارکردگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ہم دنیا کی پہلی فضائی کمپنی ہیں جس نے ریل کا ٹرکو باقاعدہ سروس کے لئے استعمال کیا اور بین الاقوامی پروازوں میں جہاز کے اندر فلمیں دکھانے کا آغاز بھی ہم ہی سے ہوا۔ پاکستان کے اندر ہم پہلا قومی ادارہ ہیں جس نے کمپیوٹر ٹیکنالوجی کو متعارف کرایا ہمارے پاس چھوٹے کمپیوٹرز ہیں آئی بی ایم ۴۳ بھی ہے اور اب ہم پہلی ایشیائی فضائی کمپنی ہوں گے جو جدید ترین بوئنگ ۳۰۰-۳، طیارے استعمال کرے گی

ہمارا سفر جاری ہے۔ ہم ہمیشہ کی طرح آج بھی فضاؤں کے قافلہ سالار ہیں . . ماشاء اللہ ہم دنیا کے دور دراز شہروں کے درمیان فاصلے کم کر رہے ہیں اور دلوں کو قریب تر لا رہے ہیں۔



پی آئی اے۔ فاصلے گھٹائے قربتیں بڑھائے



PIA پی آئی اے
پاکستان انٹرنیشنل
باکمال لوگ لاجواب پرواز

PID (Islamabad)

IAL—IPP—58—84





شہر میں منشی سراج الدین آزاد دہلوی صاحب رہتے تھے۔ شاید آپ نے ان کا نام سنا ہو اس لئے کہ بعد میں وہ لاہور اٹھ آئے تھے۔

عبادت: جی ہاں۔

فیض: انہوں نے ایک محفلِ مشاعرہ قائم کر رکھی تھی — ہمارے گھر کے بالکل ساتھ — اس کے باقاعدگی سے مشاعرے ہوتے تھے اور ایک مرزا گم ہوا کرتے تھے منشی سراج دین مرحوم جو کہ علامہ اقبال کے دوستوں میں تھے ان کا ذکر بھی ہے علامہ کی تحریروں میں۔ منشی صاحب ہمیشہ صدارت کیا کرتے تھے۔ وہ کشمیر میں میر منشی تھے جب اُن کی رہائش سیالکوٹ میں آ جاتی تھی تو وہ بھی سیالکوٹ آ جاتے تھے اور اُن کے ساتھ مشاعرہ بھی آ جاتا تھا۔ یعنی تب میں شاعری کا بازار گرم رہتا تھا وہاں پر ہم بھی جایا کرتے تھے۔ مصرع طرح پر غزلیں پڑھی جاتی تھیں بہت دنوں تک تو خیر ہمیں جرأت نہ ہوئی کیونکہ منشی سراج دین صاحب بڑے نقاد آدمی تھے۔

عبادت: بہت خوب۔

فیض: جب کوئی دس برس کے تھے تو ایک شعر ان کو سنایا تو منشی صاحب نے اساتذہ کے دس بیس اشعار سنا دیئے

عبادت: واقعی مشکل چیز تھی۔

فیض: تو بہت دنوں کے بعد ہمیں ہمت ہوئی ہم نے ایک غزل پڑھ دی حلافِ توقع منشی صاحب نے داد دی۔ کہا برخوردار ہو جاؤ ہے لیکن یہ سب تک بندی کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد جب میں گورنمنٹ کالج میں گیا ہوں تو ایک دو سال میں محسوس ہوا کچھ کے لئے کچھ احوالِ دل بیان کرنے کے لئے شعر کہنے کی ضرورت پڑی۔

عبادت: وہ تو آپ کی نظموں سے پتہ چلتا ہے۔

فیض: تو بس جب ہی سے شاعری شروع ہوئی۔

عبادت: اچھا اُس زمانے کی وہی نظمیں ہیں جن میں رومانی رنگ و آہنگ ہے اور جو نقشِ فریادی کے پہلے حصہ میں شامل ہیں۔

فیض: جی ہاں نقشِ فریادی کی نظموں کا پہلا حصہ تو گورنمنٹ کالج ہی کے زمانے کا ہے۔

عبادت: یہ نظمیں آپ نے کب لکھیں؟

فیض: آپ یہ سمجھئے کہ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۴ء کا زمانہ ہے۔

عبادت: اس زمانے میں ترقی پسند تحریک اگرچہ باقاعدہ تو نہیں شروع ہوئی تھی لیکن اُس کے شروع ہونے کے آثار موجود تھے۔

فیض: ہاں ترقی پسند تحریک اصل میں کوئی تین چار برس بعد شروع ہوئی۔ اگرچہ اس زمانے میں کچھ کچھ فضا شروع ہو گیا تھا لیکن باقاعدگی سے ۱۹۳۶ء میں شروع ہوئی تھی۔

عبادت: غالباً ۱۹۳۵ء میں شروع ہوئی تھی۔

فیض: لیکن فضا میں اُس کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں جب میں نے تعلیم ختم کر کے امرتسر میں پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ ایم اے او کالج میں تو اُن ہی دنوں یہ تحریک ہوئی اور اُس کے ساتھ رابطہ پیدا ہوا۔

عبادت: آپ نے یہ جو نظمیں لکھی ہیں "رقیب سے"، "چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز" — یہ اُس تحریک کے اثر کے بعد کی ہیں؟

فیض: اُس کے بعد کی — دراصل یہ اُس وقت لکھی گئیں جب تھوڑا بہت سیاسی اور سماجی شعور پیدا ہوا۔ پہلی نظم تو ہے "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ"۔ آپ نے جن نظموں کا حوالہ دیا وہ اس کے بعد کی ہیں۔ یعنی ۱۹۳۵ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان کی ہیں۔

عبادت: اچھا فیض صاحب! یہ فرمائیے کہ کبھی علامہ اقبال سے بھی آپ کی ملاقات ہوئی؟

فیض: جی ہاں اُن سے کئی بار شرف نیاز حاصل ہوا۔ ایک تو وہ میرے ہم وطن تھے دوسرے وہ میرے والد کے دوست بھی تھے دونوں ہم عصر تھے۔ یہاں اور انگلستان میں بھی وہ ایک ساتھ رہے تھے۔ چنانچہ اُن سے پہلی ملاقات تو مجھے یاد ہے بہت بچپن میں ہوئی تھی جب کہ میری عمر کوئی چھ سات برس کی ہوگی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سیالکوٹ میں ایک انجمنِ اسلامیہ تھی اُس کا ہر سال جلسہ ہوا کرتا تھا۔ انجمنِ اسلامیہ کا اسکول بھی تھا۔ دو تین اور اسکول تھے اور وہاں پر کبھی کبھی علامہ اقبال اُن کے سالانہ جلسوں میں شرکت کے لئے آیا کرتے تھے پہلی دفعہ تو میں نے انہیں انجمنِ اسلامیہ کے جلسے میں دیکھا۔ مجھ کو اُس جلسے میں شرکت کا موقع اس لئے دیا گیا تھا کہ میں اسکول میں پڑھتا۔ اسلامیہ اسکول میں۔ مجھے قرأت سنانی تھی

عبادت: بہت خوب!

فیض: مجھے یاد ہے کہ کسی نے اٹھا کر مجھے میز پر کھڑا کر دیا تھا۔

عبادت: چنانچہ آپ نے کلام پاک کی تلاوت کی؟

فیض: جی ہاں۔ اُس کے بعد جب میں گورنمنٹ کالج میں داخلے کے لئے گیا تو علامہ ہی سے خط لے کے گیا تھا قاضی فضل حق صاحب کے نام اور اُس کا مجھے افسوس ہے کہ وہ خط قاضی صاحب نے ہتھیا لیا۔ جب انٹرویو ختم ہو گیا تو میں نے کہا وہ خط مجھے دے دیجئے۔ انہوں نے کہا نہیں یہ میرے پاس رہے گا۔

عبادت: اہم چیز تھی۔ کاش آپ کو وہ خط واپس مل جاتا! خدا جانے کہاں ضائع ہو گیا ہو گا؟



فیض: جی ہاں! وہ اتنے بڑے بزرگ شاعر تھے اور پھر ہمارے والد کے دوست تھے اس لئے ہمیں تو اُن کے پاس جانے میں کچھ جھجک ہوتی تھی۔ لیکن کالج سے نکلنے کے بعد کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے جب علامہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کر کے لندن سے واپس لوٹے تھے تو ہم نے گورنمنٹ کالج کی طرف سے اور بہت سی انجمنوں کی طرف سے ایک استقبالیہ دیا تھا۔

عبادت۔ علامہ کے اعزاز میں؟

فیض۔ جی ہاں۔ ایک اور بات یاد آئی۔ ہماری طالب علمی کے آخری دن تھے۔ گورنمنٹ کالج کے سالانہ مشاعرے میں پھر ایک مقابلہ ہوا تھا۔ موضوع دیا گیا تھا "اقبال" اس پر بھی ہمیں انعام ملا تھا۔ صوفی تبسم صاحب نے ہم سے کہا "تم بھی نظم سنا دو" تو ہم نے کہا تھا "علامہ اقبال کے سامنے تو ہم نظم نہیں سناتے" صوفی صاحب نے کہا "نہیں نہیں ٹھیک ہے بہت اچھی نظم ہے۔ پڑھ دو" چنانچہ وہ نظم ہم نے پڑھ دی۔ اس کے بعد پھر تاثیر صاحب، صوفی صاحب اور سالک صاحب کے ساتھ دو تین دفعہ حاضری کا موقع ملا۔

عبادت۔ فیض صاحب ایک بات میں آپ سے اور پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ اُردو شاعروں میں سے آپ نے کون کون سے شاعروں کا مطالعہ کیا ہے اور کون کون سے آپ کو زیادہ پسند ہیں؟

فیض۔ اصل میں مطالعہ جسے کہتے ہیں وہ تو میں نے ایک ہی شاعر کا کیا ہے یعنی غالب کا۔ اس کے بعد جیل جانے میں سودا کے ساتھ کچھ وقت گذرا اور کچھ نظیر کا اور دو ایک دوسرے شاعروں کا کلام پڑھا۔

عبادت۔ یہ تو اہم شاعر ہیں۔

فیض: یوں تو اپنی تدریس کے زمانے میں اور پھر ریڈیو وغیرہ کے سلسلے میں تو مجبوراً سب ہی کو پڑھنا پڑا لیکن اپنے شوق سے جن کو پڑھا ہے ان میں یہی ہیں۔ میر۔ غالب۔ سودا۔ نظیر۔ انیس۔

عبادت۔ جدید شاعروں میں سے آپ کس کو پسند کرتے ہیں؟ جدید شاعروں سے میرا مطلب ہے وہ شاعر جو علامہ اقبال کے بعد آئے اور آپ کے ہم عصر ہیں۔

فیض۔ اگر میں کہوں اپنے ہم عصروں میں مجھے فُلاں پسند ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے گا کہ باقی ناپسند ہیں۔

عبادت۔ نہیں نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کو کون سے ہم عصروں سے نسبتاً زیادہ مناسبت ہے؟

فیض: مجھے تو سب لوگ پسند ہیں لیکن زیادہ میں سمجھتا ہوں ایک تو راشد ہیں۔

عبادت۔ ن۔م۔ راشد؟

فیض۔ جی۔ دوسرے مجاز مرحوم تھے اور مخدوم ہیں علی سردار جعفری ہیں۔ ہمارے ساتھ کے جو لوگ ہیں ان میں یہ زیادہ پسند ہیں۔ یوں بہت سے اور بھی ہیں جن کی بہت سی چیزیں مجھے پسند ہیں۔

عبادت۔ جوش صاحب کی چیزیں آپ نے پڑھی ہیں؟

فیض: جی ہاں۔

عبادت۔ جوش صاحب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

فیض۔ جوش صاحب بزرگ ہیں ہمارے۔ بہت دنوں سے نیاز حاصل ہے اُن سے۔ اُن میں خاص قسم کا ایک زور اور ایک خاص قسم کی قدرتِ کلام ہے۔ اِس سے تو مرعوب ہوئے بغیر چارہ نہیں۔ لیکن وہ بہت پُرگو ہیں۔ غالباً قدرتِ کلام کی وجہ سے زیادہ لکھتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سب بڑے شاعروں کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اچھے اور بُرے اور بالکل خالص یا کہئے کم خالص تجربات میں زیادہ تمیز نہیں کرتے۔ اور احتیاط نہیں کرتے۔ تو جوش صاحب کا بھی یہ ہے کہ بہت اچھی چیزیں بھی ہیں اور بہت چیزیں ایسی ہیں کہ سطح تو اُن کی ہمیشہ قائم رہتی ہے لیکن اِس سطح میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو کہ خالص تجربے کی چیزیں ہیں لیکن بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو محض زورِ کلام میں کہی ہیں۔

عبادت۔ فیض صاحب! نظریئے کے بغیر شاعری یا بڑی شاعری ناممکن ہے کوئی نہ کوئی نقطۂ نظر کوئی نہ کوئی نقطۂ خیال کسی شاعر کے پاس ضرور ہونا چاہئے کیونکہ اس کے بغیر اعلیٰ درجے کی شاعری کی تخلیق ناممکن ہے۔ اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

فیض۔ نظریئے کی جو اصطلاح ہے اُس کے بارے میں بہت سے مغالطے ہیں۔ نظریئے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ شاعر ہمیشہ بہت باقاعدگی سے کسی فلسفے کا پھیرہ یا سیاست کا یا کسی اور چیز کا کوئی منظم اور مربوط نظام پیش کرے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شعر کا تجربہ یا کوئی بھی تجربہ کسی نہ کسی نظریئے کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ ایک ہی چیز کو آپ کئی نقطۂ نظر سے دیکھ سکتے ہیں۔ مجھے کوئی ایسا بڑا شاعر یا بڑا فن کار ادیب، مصوّر، یا موسیقار یاد نہیں جس کے ذہن میں اپنے گرد و پیش کے متعلق کچھ بار، کچھ نہ کچھ احساس یا کوئی نہ کوئی نظریہ نہ ہو اور وہ کسی احساس اور تجربے پر منحصر نہ ہو۔ ایسا شخص جس کا کوئی نظریہ نہ ہو کہ یہ دُنیا اچھی ہے یا بُری، لوگ اچھی طرح رہتے ہیں یا بُری طرح، اُن کے لئے کچھ کرنا چاہئے یا نہیں کرنا چاہئے، یا انسانیت کس طرف جا رہی ہے یا کس طرف نہیں جا رہی ہے کوئی زیادہ حساس اور ذی شعور آدمی نہیں ہو سکتا۔ ہر فن کار اور ادیب کے لئے شعور لازمی ہے۔



ہوسٹل کی ایک شام

فیض احمد فیض

میں نے بڑے گناہ کیے ہیں، مانا ایک۔ لیکن گناہ ہوتا کیا ہے؟ یہی کہ آدمی کوئی ایسا کام کرے جس سے سوسائٹی یا سوسائٹی کے کسی فرد کو نقصان پہنچے اور چونکہ ہر آدمی سوسائٹی کا فرد ہے اس لیے جو فعل اس کی اپنی فطری قوتوں کے ارتقا میں حائل ہو وہ اس کے لیے گناہ ہے۔ مثلاً اگر ایک شخص کی ذہنی زندگی محض اس وجہ سے برباد ہو رہی ہے کہ اس کے سر پر کسی ایسی نفسانی خواہش کا جن سوار ہے جسے رواجی نظامِ اخلاق پورا کرنے کی اجازت نہیں دیتا تو اس خواہش کو پورا نہ کرنا اس کے لیے یقیناً گناہ ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ اگر کوئی مولوی سن پائے تو کیا کہے۔

ہوسٹل میں خاموشی تھی۔ تمام لڑکے سر یا سینما کو جا چکے تھے۔ شام کا دھندلکا آہستہ آہستہ گہرا ہوتا جا رہا تھا اور آسمان پر بکھرے ہوئے بادلوں کی دراڑوں میں سے کہیں کہیں بھٹکے ہوئے حیرت زدہ ستارے جھانک رہے تھے۔ کل اسے پھر دیکھا تھا۔ وہی سہمے ہوئے پرندوں کی سی آنکھیں اور انیسویں صدی کے جوان مرگ انگریزی شاعروں کے سے بال۔ بالا خانے پر اسی طرح کھڑی تھی۔ لیکن دور دراز اور ناقابلِ حصول کسی بھولے ہوئے خوبصورت خواب کی طرح۔ مرد کے لیے عورت کی محبت کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ وہ اپنا سب کچھ اپنا جسم تک اس کے حوالے کر دے اور شاید دنیا میں ایک بھی مرد ایسا نہیں جو عورت کی اس شاندار قربانی کو حقیر سمجھتے ہوئے اس کا غلام نہ ہو جائے۔ اس زمانے میں اردو کے کئی ناول اور رسالے (غالباً بھائی کے چرائے ہوئے) اس کے کمرے میں بکھرے رہتے تھے اور میں ڈی۔ ایچ۔ لارنس پڑھا کرتا تھا۔

مجھے غالباً اس سے محبت بھی کم از کم اس قدر تھا کہ چوبیس گھنٹوں میں کئی لمحے ایسے آتے جب میری روح کا ہر ذرہ اس کے قرب کے اشتیاق میں کانپنے لگتا۔ اسے تو یقیناً ہوگی ورنہ کون اتنی زحمت برداشت کرتا ہے کہ ہر روز شام کسی کے انتظار میں ایک ہی جگہ کھڑا رہے۔

اف! اس زمانے میں ہم کتنے شوق سے ناول پڑھا کرتا تھا۔ تھوڑے ہی انسان ہوں گے جنہوں نے ایسی پاک اور پُرخلوص ناولیں پڑھی ہیں۔ میری جوانی بے داغ تھی اور بے سحر۔ میں ارادہ کی پوری قوت کے ساتھ اپنے آپ کو معصوم مانتے ہوئے تھا۔ غالباً اس لیے کہ معصومیت کے میدان میں وہ مجھ سے آگے نہ بڑھ جائے۔ بے لوث محبت انسان کو مجبور کرتی ہے کہ قدرت کی عطا کی ہوئی تمام نعمتیں محبوب کے لیے وقف کر دے۔ محبت کیا چیز ہوتی ہے؟ (فی ذات؟) یہ تمام خودپرستانہ جذبات کو حسن کی قربان گاہ پر ہمیشہ چڑھا دینا ممکن ہے۔ انسان کی حقیقی زندگی میں غالباً ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آتا جب وہ خودپرستانہ جذبات سے مبرا ہو۔ عاشق و معشوق دونوں ہمیشہ کسی نہ کسی بات میں ایک دوسرے پر فتح پانے کی دھن میں لگے رہتے ہیں (معشوق کا لفظ کتنا گرچکا ہے۔ زبان پر لاتے ہوئے شرم آتی ہے) جذبۂ محبت کی تہہ میں ہمیشہ ایک شدید جذبۂ رقابت کی رو بہتی چلتی ہیں جو آپس میں ٹکراتی رہتی ہیں۔ اور اسی لیے ؎

ہر لحظہ ایک تازہ شکایت ہے آپ سے
اللہ مجھ کو کتنی محبت ہے آپ سے

لیکن بات کیا ہو رہی تھی، ہاں تو ہماری مسرت کی انتہا یہی تھی کہ ایک دوسرے کو ایک آدھ نظر دیکھ لیں۔ یا کبھی موقع ملے تو ایک لمحہ کے لیے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے رہیں۔ پردے کی سر بفلک دیواریں۔ رسوائی کا خوف۔ ہمارے مراسم کا بیشتر حصہ ان لمبے لمبے احمقانہ خطوط پر مشتمل تھا جو ہم کوٹھے پر سے ایک دوسرے کی طرف پھینکا کرتے تھے۔ وہ خطوط جن میں ٹیگور۔ اختر شیرانی اور حجاب امتیاز علی کے الفاظ و اصطلاحات کو نہایت صفائی سے اپنایا جاتا تھا ؎

تو اس دنیا میں بخشش فطرت کا کمال ہے
تو اس سنسار میں اک آسمانی خواب ہے سلمیٰ

تعلقات زیادہ گہرے ہوتے گئے ہاتھ زیادہ دیر تک تھمے رہتے تھے



ہماری نئی اسٹانی نہایت اچھا پڑھاتی تھی۔ کل لفریچ کے دقت میں باغ میں اکیلی بیٹھی تھی۔ ایک لڑکی نے ہنسی میں میرے بالوں کو چھیڑا تو مجھے بے اختیار رونا آگیا۔

وہ میں نے اس سال پھر انگریزی میں انعام لیا ہے۔ کالج کے تمام لڑکے پتہ نہیں کیوں میری بہت قدر کرتے ہیں۔ اِس دفعہ امتحان اچھا ہو جائے نہیں

"آپ کا یہ سوٹ نہایت بھلا معلوم ہوتا ہے"

"نہیں کوئی خاص تو نہیں"

بے معنی بے مقصد فقروں کا ایک باریک سا اٹک اٹک کر بہنے والا آبشار صدمات میں ڈوبی ہوئی خاموشی کو چھیڑتا رہتا تھا

میں اُس لمس کو آج تک محسوس کر سکتا ہوں جب اُس نے پہلی دفعہ میری ہتھیلی کو چوم کر اُس پر تپتا ہوا رُخسار رکھ دیا تھا۔

ترا جسم اِک ہجومِ ریشم و کمخواب ہے سلمیٰ

لذیذ حسّیات کی ننھی ننھی ملائم موجیں جسم کی رگ رگ میں جذب ہوگئیں۔

ہولاک ایلس۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس ممنوع حدود سے گزرنے اور خطرناک چیزوں سے کھیلنے کا طفلانہ اشتیاق۔ اُس کے ساتھ ہی ساتھ پاسِ معصومیت۔ اخلاقیات کے فرسودہ نظریئے جو بچپن ہی سے دماغ میں ٹھونسے جا چکے تھے۔ اور تاریک نامعلوم زمینوں میں قدم رکھنے سے طفلانہ ہچکچاہٹ کیسی کشمکش جاری رہی اُس دن تک۔

کس تیزی سے بھاگ رہے ہیں دونوں۔ دوسرا غالباً اُس کا چھوٹا بھائی ہے۔

اعصاب کا ساسب۔ حرکات کی ہم آہنگی۔ گہرا اور دھندلکے میں نیم محسوس کردہ چیزیں اپنے پہلے حسن کی آب و تاب میں ملبوس۔ دل کی دھڑکن۔ سانس رُکنے لگا تھا۔ مجھے دیکھ لیا ہے۔ نہیں تو اُس کی حرکات میں اور بھی دلود ہے۔ بڑھتی ہوئی موجوں کا جوش۔ لعی۔ میرے اللہ اُس نے اپنا بانسا ہوا سینہ اُس روز ن سے کھینچ دیا۔ جہاں میں کھڑا تھا۔ تو لوں ہے "نہیں نہیں نہیں" دماغ کے مختلف کونوں میں محو بانہ حالات کے سعلے بلند ہو رہے تھے۔ "نہیں نہیں" جانے دو۔ تقدیر سے لڑنا لاحاصل۔ انجام کا آغاز۔

کھیل اچھا نہ ہو تو سکنڈ شو دیکھ کے ہمسر طبیعت خراب ہوتی ہے۔ گھر والے سو گئے ہوں گے کھانا بھی نہیں ملے گا

"
- مجھے جانے دیجئے۔

"اچھا آپ کی مرضی"

اے مرٹ کے ممکن سکوت کے بعد بھاگ جانے کے لئے اضطراری حرکت۔ شاید میری آواز کی تہہ میں تلخی تھی۔ جانے دو۔ تقدیر سے لڑنا لاحاصل ہے۔

شام بھیگ چکی تھی۔ آسمان کی سیاہ نیلاہٹ میں ستارے ڈوبتے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے۔ لڑکے میرے واپس آرہے تھے۔ کمروں میں آہستہ آہستہ روشنیاں ہو رہی تھیں۔ فضا میں گنگناتی ہوئی آوازیں لہرا رہی تھیں۔

"راحت کا اس طرح سے زمانہ گزر گیا"

"یہیں خاکِ بسمہ را جلوہ گاہ ہے میتواں کردن"

"یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں"

"اب بھی میری محبت کا یقین آتا ہے کہ نہیں؟" اُس کی آنکھوں میں دُور کہیں آنسو جھلک رہے تھے اور اُس کی آواز بعید اور مبہم سی معلوم ہوتی تھی۔ جیسے کوئی ٹیلی فون میں سے بول رہا ہو۔

اعتبار آتا ہے کہ نہیں؟ اعتبار آتا ہے کہ نہیں؟ دماغ کی چار دیواری میں بے معنی الفاظ ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے غائب ہوتے جا رہے تھے۔ کس چیز کا اعتبار؟ محبت کیا چیز ہوتی ہے؟ ادراک کی تمام قوتوں پر غبار سا چھایا ہوا تھا۔ محبت؟ معلوم ہوتا تھا کہ روح کا کوئی اہم ٹکڑا ٹوٹ کر کہیں گر گیا ہے۔ پھڑپھڑاتے ہوئے پر سسکتے جانور اور سڑکوں کے کنارے پر پڑی ہوئی دھندلی رنگ آلود موٹر گاڑیاں۔ محبت تکمیلِ نفس۔ قلبِ انسانی کی ملکوتی صفات۔ کھلونے جن سے بچے کھیلتے ہیں۔

ہم اب بھی کبھی کبھی ملتے ہیں۔ کھوکھلے الفاظ میں اظہارِ محبت بھی کرتے ہیں لیکن ہماری آنکھوں سے ایک بھیانک قسم کی نفرت ایسا زہریلا عکس اُٹھائے ہوئے دکھتی رہتی ہے۔ دو دلوں کے درمیان ایک کریہہ اور اٹل پردہ کھینچا جا چکا ہے جسے دور کرنے کی کوشش بیکار ہے۔ ہم کتنے قریب تھے۔ اب کتنے دور ہیں؟ کیوں بھلا؟ کیونکہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو ایک تاریک غار کی طرف دھکیلا اور دونوں اس میں گر پڑے۔ اب ہر ایک دوسرے کو مجرم سمجھتا ہے۔ ہم ایک گناہ میں شریکِ کار تھے لیکن گناہ کیا ہوتا ہے ایک فریبِ نظر۔ محض گناہ کو گناہ سمجھنے کا نام گناہ ہے۔ اگر ہم گناہ کو گناہ سمجھنا چھوڑ دیں تو دنیا میں ایک بھی گناہ باقی نہ رہے۔ (ایک ہی لفظ کی تکرار کیسی بُری معلوم ہوتی ہے۔ ایسے فقرے تو عشقِ لہر کی قسم کے پنجابی شاعر لکھا کرتے ہیں۔ خیال بھی تو شیکسپیئر کا ہے۔)

چلو۔ چھوڑو۔ ہوا کیا؟ (THE WAY OF ALL FLESH) ایل جیگر نے بھی اکٹنگ شروع کر دی ہے اور اب وہ اپنی ہم جولیوں میں بیٹھی میری گذشتہ محبت کا مذاق اُڑا رہی ہوگی۔ اور میں یہاں کھڑا اُس ساعت کو کوس رہا ہوں جب میں نے شیلے اور براؤننگ پڑھ کر روحانی محبت کے نظریئے قائم کئے تھے روحانی محبت۔ ہا۔ ہا۔ ہا!

تربا پیاری! میں اُن دردوں کی پرستش کرتا ہوں جنہیں تم فیاضانہ طور پر عطا کرتی ہو — میری روح ایک کانپتی ہوئی شمع ہے۔ تمہاری محبت کی سجدہ گاہ کو روشن کرنے کے لئے وہ سہمے ہوئے ہرن کی سی آنکھیں۔ محبت۔ کسٹرائل۔ مرے ہوئے جانور۔



تصوّر

فیض احمد فیض

۱۹۱۸، ۱۹۱۹، ۱۹۲۰ [illegible] صحیح معنوں میں سال کا اندازہ اس وقت ہمیں کس کو تھا [illegible] لیکن اس سے پہلے [illegible] ایک خاص تحریر [illegible] اس کے [illegible] ان کا جاری [illegible] قومی آزادی کی تحریک شروع ہو چکی تھی [illegible] اللہ اکبر [illegible] قومی [illegible] لیڈر [illegible] محمد علی اور شوکت علی [illegible] ان کی گرفتاری [illegible] لیڈر کی گرفتاری [illegible]

[illegible] ان میں [illegible] والوں کا گوما ہے [illegible] کی حکومت قائم کر لی [illegible] انقلاب [illegible] اسکول کے [illegible] انقلاب [illegible] حکومت کیسی [illegible]

[illegible] ملکی اور غیر ملکی سیاست [illegible]

[illegible] ہو گئے۔

روس [illegible] اور انقلاب [illegible] کچھ [illegible] تصوّر [illegible] اسکول میں پڑھنے لکھنے اور دوسری دلچسپیوں میں کھو گئے اور یہ سب کچھ بھول بھال گئے۔

کئی برس کے بعد [illegible] روس کی ایک [illegible] تصویر ذہن میں ابھرے گی۔ [illegible] سوویٹ یونین [illegible] یونیورسٹی میں ایم اے کی ڈگری کے لئے انگریزی ادب [illegible] خاص طور سے [illegible] انگریزی ادب کے ساتھ [illegible] ادب [illegible] اور یوں روس کے کلاسیکی ادب سے تعارف ہوا، چیخوف، ٹالسٹائی، دوستوئیفسکی، ترگنیف، گورکی، پشکن، چیخوف [illegible] روس کی [illegible] میں گھوم گئی [illegible] کسان [illegible] اور [illegible] کے گھر [illegible] اور [illegible] جنگل اور [illegible] میدان، صحرا اور دریا [illegible] معاشرے [illegible] اور [illegible] ظلم اور [illegible] ادب [illegible] کے پردے کی [illegible] کے [illegible] رنگ [illegible] اور [illegible] اور اس کے [illegible] موسیقی [illegible] کبھی [illegible] کہ [illegible] اور [illegible] کسی [illegible]

[illegible] دوسرے [illegible] اور [illegible] انقلاب [illegible] حلقوں میں [illegible] انقلاب [illegible]



تھا۔ رفتہ رفتہ میں یہ دہشت پسند تحریک کے عروج کے دن تھے۔ چٹاگانگ آرمری کیس، کاکوری ڈکیتی کیس، بھگت سنگھ، آزاد، میرٹھ جنگ اور کھوکھری کا تذکرہ تھا۔ میرٹھ سازش کیس وغیرہ کا میں پہلے سے سن چکا تھا۔ بھگت سنگھ تحریک میں میرے دو تین قریبی دوست بھی شامل تھے۔ ان کے ساتھ رہتے ہوئے جو کتابیں اور رسالے ملے تھے وہ مشہور میوزک ڈائرکٹر میں ہوسٹل میں میرے کمرے کو اپنے خفیہ اڈے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ان میں بیشتر کارل مارکس، لینن اور انقلاب روس سے متعلق تھیں اور کبھی کبھی ان میں سے میں بھی دیکھ لیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ قریب قریب روز ہی کوئی انقلابی پوسٹر کالج کے نوٹس بورڈ پر چسپاں نظر آتا، کبھی روزانہ اخبار کی تہہ میں چھپا ہوا ملتا۔

اس تحریک کے زیر اثر قومی جلسے جلوسوں کا رنگ بھی بدل گیا۔ اب ان میں سوراج اور بندے ماترم کے ساتھ انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند ہوتے تھے اور

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"

کی جگہ

"سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے"

گایا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں [illegible] ایک جماعت کے [illegible] بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے اسمبلی میں بم گرایا اور کئی انقلابی اقدامات کئے گئے۔ ان سب باتوں سے انقلاب روس کے بارے میں کچھ دلچسپی کی، وہاں کے کچھ حقوق [illegible] لیکن ان پر دوستوئیفسکی اور ٹالسٹائی کی سی کوئی تصویر ابھی تک نہ بنی تھی۔

پھر اس تصویر پر دھیرے دھیرے ایک نئی تصویر اترنے لگی۔

[illegible] کے [illegible] میں تھے۔ یہ عالمی کساد بازاری اور اقتصادی بحران کا دور تھا۔ [illegible] کے حالات بگڑنے لگے تھے اور بھوکے کسان، وقت کی ردی [illegible] بنا دیا گیا ہے [illegible] توڑ کر شہروں میں [illegible] رہے تھے۔ بے روزگاری کا یہ عالم تھا کہ [illegible] روز ہو رہے تھے اور [illegible] کارخانوں کی چمنیاں بار بار میں آ بیٹھی تھیں۔ صرف سرمایہ داروں اور ساہوکاروں کی چاندی تھی جو دونوں ہاتھوں سے حاجت مندوں کے [illegible] کے ساتھ ساتھ ان کی عزت اور دولت بھی سمیٹ رہے تھے۔ جہاں تک مجھے علم ہے ترسیل کی سہولت [illegible] کا تفصیلی مطالعہ ابھی نہیں ہوا ہے۔ اس مطالعے سے بہت سی سیاسی تحریکوں کے ابتدائی محرکات اور عوامل پر روشنی پڑ سکتی ہے۔ اس بحران سے پہلے سیاسی سوراج اور قومی آزادی کا مسئلہ توسیع کی سطح میں تھا، بس اب [illegible] قومی دولت کی تقسیم، امیری اور غریبی، [illegible] کسان اور زمیندار، سرمایہ داری اور محنت کش طبقے اور ان تمام مسائل کو ہم سب سامنے دیکھا کیا اور بہت سے لوگ اسے سرکرنے کی فکر میں سرکھپانے لگے۔ کسان سبھائیں بنیں، مزدور تحریک سے روزگار اور قومی آزادی کے ساتھ ساتھ سوشلزم اور سماجی عدل و مساوات کے تقاضے بھی عام ہونے لگے۔

۱۹۲۵ء میں جب میں نے ادب کے ایک کالج میں پڑھنا شروع کیا تو نوجوان اساتذہ میں ان مسائل پر بحث رہتی تھی۔ ایک دن میرے ایک رفیق کار [illegible] محمود الظفر (مرحوم) نے ایک پتلی سی کتاب میرے حوالے کی اور کہا لو یہ پڑھو اور اگلے ہفتے اس پر ہم سے بحث کرو۔ لیکن یہ کتاب ہے ذرا احتیاط سے رکھنا، یہ کتاب تھی کمیونسٹ مینی فیسٹو۔ میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی، لکھ دو تین بار پڑھی۔ انسان اور فطرت، فرد اور معاشرہ، معیشت اور صنعت [illegible]

[illegible] دراتع پیداوار کی تقسیم، ذرائع پیداوار اور پیداواری رشتے [illegible] انسانوں کی دنیا کے پیچ در پیچ اور تہہ در تہہ راستے اور مقدمے کے ساتھ جیسے [illegible] مارے میں یوں محسوس ہوا کہ کسی نے اس پہیلی کی گتھی سلجھا دی ہے [illegible] اور میرے ہی مسئلے کا حل ڈھونڈ رہا ہو۔ اسی زمانے میں اسی دلچسپی کی ابتدا ہوئی۔ جرنلسٹ [illegible] کے ساتھ [illegible] کے انقلاب روس کی ابتدا انقلاب کی شدت سے کچھ ہوئی [illegible] کی کتاب

TEN DAYS THAT SHOOK THE WORLD

[illegible] بارے میں [illegible] کی کتاب

DAWN OVER SAMARKAND

[illegible] مطالعہ کو سوویت یونین کے بارے میں سڈنی اور بیٹرس ویب کی کتاب ڈیل سولیٹ وامس ... [illegible] ان سب کتابوں کا اس وقت ملک میں نسوخ تھا لہٰذا میں بہت پابندی سے رکھا جاتا تھا کہ کسی کے حصے میں آئے تو مٹھی میں [illegible] پرکی چھپے ہاتھوں ہاتھ تقسیم کی جاتی [illegible] جیسے [illegible] رنگ لیے تھے [illegible] دیکھتے تھے، [illegible] ایک دو سال بعد دوست [illegible] بیڈ لو میں کام کرتا تھا، ایک ادیب [illegible] مرحوم تھے جو پاکستان کمیونسٹ [illegible] کے ساتھ [illegible] جس میں مساوات [illegible] سے وسط ایشیا کی خلاف ورزی کرتے تھے [illegible] سے ایک کتاب دکھا کر [illegible] تعمیر کر [illegible] تھے [illegible] کچھ [illegible] یہ لوگ سوویٹ یونین گئے تو نہیں تھے لیکن [illegible] سے لوگوں سے [illegible] جن کا گھرانا [illegible] اور اس میں لاچھی پہ ساتھ لاتے تھے۔ [illegible] زمانے میں ہندوستان میں پسند مصنفین کی محبت [illegible] اور سوویٹ انقلابی ادیبوں کی کتابیں لوگ [illegible] دلوں کو [illegible] گورکی، شولوخوف، الکسی ٹالسٹائی [illegible] رنگ اور جس کا بھی [illegible] سے پڑھا گیا۔ سعادت حسن منٹو [illegible] اردو میں کے بہت [illegible] تعمیر کیں [illegible] کالج میں [illegible] سے میرے تک گرد [illegible] کالج [illegible] کے بعد [illegible] کی کتاب اور [illegible] ترجمے کی تربیت تشبیح کے لیے [illegible]

[illegible] ہم [illegible] رنگ بھرے [illegible] ایک آدھ [illegible] طبقاتی معاشرے کی تصویر جہاں کوئی سرمایہ دار نہیں، کوئی جاگیردار اور زمیندار نہیں، کوئی آقا نہیں، کوئی [illegible] کوئی تلاش معاش میں سرگرداں ہے، [illegible] گرفتار جہاں [illegible] اور کسان راج کرتے ہیں اور [illegible] کی رسی سے [illegible] پاتا ہے۔

[illegible] سے ایک قصہ یاد آیا [illegible] پہلے کی بات ہے [illegible] سے [illegible] سوکے ستے پاکستان [illegible] اور [illegible] کے کچھ [illegible] آرہے تھے [illegible] آرہے تھے [illegible] لیے [illegible] بیٹھے تھے [illegible]



"ادھو" جیسے میاں کچھ متاسف ہو رہے تھے کہ ایسا نہ ہوا، وہ بہت بڑا ادیب تھا کہ تین کڑیل دو دوروں کی استانیاں سی بیٹھی تھیں، القصہ یہ انقلاب مولانا روم کے شعر کی جیتی جاگتی مثال تھی:
لیکن اگر یہاں کے عالم بھی ہم جیسے دو دو ساں لوگ ہیں تو یہ بہت ہی عجیب تک ہوگا"

حیرت یہ ہوئی تھی کہ اس زمانے میں ہم نے جو کچھ پڑھا اور جو کچھ سنا اس کے مطابق سوویت
انقلاب اور سوویت معاشرے کے خیال تھے، ذہن میں ترتیب دیے تھے، وہ کئی میں ٹوٹ گئے۔
انسٹی ٹیوٹ، جنگی جہاز آرورا، سمیلنی کا محل، تاشقند، سمرقند اور بخارا کے قدیم آثار، سعید روی اور ان کے
یہ تکی میلیوں کی منظر ترتیب یافتہ بیسیوں ادوار سے ختم ہو دور دستوں کی یادگار ہائی جو تخیل دل سے
دیدہ اپنے اندر درد و جوش ایمان کے ان پڑھ رہے تھے۔ وسط ایشیا میں ترال ملکوں کا کچھ کھوں دیکھا اور بڑ
سال ہم لیے بزرگ دوستوں کی رہائی بھی رہنے تھے، یہ لوگ ۱۹۱۹ء، ۱۹۲۰ء میں خلافت کی تحریک کا پانچ کے
کہ یا تھوڑ دکتوبر یاد کرتے پیچھے خیال سے تو ان تر ترکی کو یہ دو بار دار ہوئے تھے لیکن وسط ایشیا
انقلابی۔ میں میں پیچ اگر جو رٹے تک دیں سے دورے، ان کی رہائی سنانے کو جب ان کا
سے دوسامان تانڈکو، ہر دو تتی رب اور افغانستان کے وقت دریا سے گزر کر ترکستان میں داخل
ہوئے تو قدم قدم پر خلافت کے حامی اور مخالف مسلح دستوں میں جدال و قتال کا بازار گرم تھا
جنگ میں دو بار اور سعف سے کو کوئی سوال نہیں تھا، آپ ایک علاقہ انقلابیوں کے ہاتھ میں ہے
تو کل ان کے دشمنوں کے تصرف میں۔ چنانچہ یہ لوگ کئی اسیر ہوئے، کبھی چھڑائے گئے حتیٰ کہ باقاعدہ
فوج کے کسی دستے نے انہیں اپنی حفاظت میں لے کر بخارا بھیجا، جہاں سے امیر بخارا اپنی کیر دل اور
محبوبوں کا ... ساتھ لے کر چند دن پہلے فرار ہو چکے تھے۔ اس پاگل ... سرگریاں چاک قافلے
دیہی کے محل میں ٹھہرایا گیا اور یہیں ... محل کے تہ خانوں میں حلقوں، قمر علوں اور
ستاں دوستانوں ... جیسے ان میں سے جو چاہیں اپنے لئے پسند کر لیں میں نے یہ محل دیکھنے ...
تب قی سب کچھ ویسے ہی ہے جو ہمارے راتوں، بہاراتوں اور نوابوں کے محلات میں ہوتا ہے دیکھا ...
علام کرتیں اور بار بال ... و دیگرہ دیکھیں ایک چیز مجھے ... معلوم ہوئی، باغ میں ایک
... تالاب سے جس سے کسب کچھ تو لی بیٹھیاں میں حسن کے اوپر ایک بڑی شیشی صورت کا
... ساہے ... کا بیٹھے تایا کہ سال جب امیر کی شکست سے حسیں دو تیز ... کیر ل ساکرلاتی
جاتیں تو انہیں اس تالاب کے کنارے جمع کیا جاتا، اس ہو ترے پر امیر کا تخت بچھایا جاتا اور ... ایک سیب
امیر میں لے کر اس تخت پر متمکن ہو جاتے، پھر ان لیروں کو حکم ہوتا کہ وہ کپڑے اتار کر اس تالاب میں نہائیں
اور ان میں سے جو کوئی ... پسند آتی امیر ... سیب اس کی طرف پھینک دیتے اور اگلے دن وہ
شاہی حرم میں داخل ہو جاتی۔ یہ روایت صحیح ہے یا غلط لیکن اپنے ہاں کے بعض پرانے امراء کے
محل دیکھے جائیں تو کچھ ایسی بعید از قیاس بھی نہیں۔

تو ہمارے دوست سناتے ہیں کہ ان کا مستقل قیام تو تاشقند میں رہا لیکن ہیں آذربائیجان اور
ترکستان کے رستے میں ... کا بھی اتفاق ہوا جہاں لینن کی زیر قیادت انقلابی معاشرے کی بنیاد ڈالی
جا رہی تھی۔ ادھر کئی سمت سے ملکی اور غیر ملکی دشمنوں کی یلغار تھی، ادھر نظم و نسق کا پرانا نظام درہم برہم ہو چکا
تھا۔ سڑک، ریلیں، ڈاک خانے، رسل و رسائل کسی چیز کا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ بھوک، فاقے، بے سروسامانی،
یہ سب کچھ ایک طرف اور دوسری جانب ... ایک عجیب ... جوش کا عالم اور سوویت کمیٹیوں کی قیادت
میں تعمیر کی ان تھک ... جدوجہد میں لینن سے لے کر ایک عام ... تک دن رات یکساں ...
... زندگی کے ہر شعبے میں ... سے کام ہو رہا تھا، ... رسل و رسائل کی بستی، محکموں ...
تعلیم اور ثقافتی سرگرمیوں ... جلسے ہو رہے تھے، محفلیں ہو رہی تھیں، ڈرامے کھیلے جا رہے تھے، ...
لکھے جا رہے تھے، ... گھر ... بیٹے اپنے والدین کو سبق دے رہے تھے، کہیں اسکول کی لڑکیاں کار خانوں

پس سے تو کہ آمدان گمند
اول آں میر راویاں گمند

... سے آگے تعمیر نو دور کا تذکرہ ہم نے ... ان میں پڑھا جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے اس سے
ادارہ سو گیا تھا اور ایک پوری قوم جیتی دل کی طرح اس ... ایسٹ روڈ سے سرکل اسرائیل جا رہی
... بستیاں بسائی جا رہی ہیں، بس رہیں آباد ہو رہی ہیں، ... کانیں دریافت ہو رہی ہیں، ریلیں
بیں جا رہی ہیں، سے عظیم الشان کارخانے بن رہے ہیں، ... بیسیوں کھیت ... ہیں اور ہر میں کی ماں
کے ساتھ ساتھ ایک بیاباں میں بہ ان چڑھ رہا ہے جسے پیسے کی ہوس نہیں، بڑھاپے بیماری
اور بے روزگاری کا ڈر نہیں، اولاد کی فکر نہیں اور جو اس نے معاشرے سے طلاق ... اس امداد کے ...
... دیسی نظام ... سان کیلئے

ادھر ہم نے یہ ڈھونگ رکھا تھا اور ادھر ... اندیشوں سے بیگانے تھے کہ سوویت
یونین کے بارے میں طرح طرح کی ... ایک پھیلائی جا رہی تھیں۔ انقلاب نے روس کی تہذیب کا ستیاناس
... کے بی کی تمیز ... اخلاق سب غارت ہو گئے حتیٰ
... وہ آپس ... کسی کے ساتھ ... رنگ رلیاں منانے
... کو حکومت نے جاتی ہے جہاں انہیں جبراً کمیونسٹ بنایا جاتا ہے ... بیگار کیمپ سے
... بیس ... سے سخت مشقت لی جاتی ہے اور صرف ... تھوڑا سا پیسے کو ... روٹی کھانے
... سے ہر چیز کا تو ... کسی بات کی آزادی نہیں اور لوگوں کی سخت مصیبت میں جان سے
... یورپ میں جانے آنے پر کافی پابندیاں تھیں اس لیے بہت کم لوگ یہاں کے حقیقی حالات سے
واقف تھے اس لیے ... سے لوگ یہ سب باتیں آسانی سے تسلیم کر لیتے تھے تحت اس بات پر
کہ ان ... کے قصے ... کئی ہی چلتے رہتے ہیں ... کے زمانے میں ہزاروں سیاح یہاں ہر ... آتے جاتے
ہیں اور ... لوگ یہاں کے حالات کا تفصیلی مطالعہ کر سکتے ہیں۔

بہرحال ہم نے اس دور کی جو تصویر اپنے ذہن میں قائم کی تھی وہ بھی کافی رومانی اور مثالی تصویر تھی جو
کی مرتسیل حقیقت پر بھی نہیں تھی۔

... میری تصویر مکمل ... ویرانی تھی ... پر ایک تیسری تصویر ابتدا شروع ہوئی۔
۱۹۲۹ء کے وسط میں میں نے مزید تعلیم کے لیے کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا ایک اطا
لوی جہاز میں جگہ بھی مخصوص کروالی تھی، ٹکٹ خرید لیا تھا، کپڑے سلوالیے تھے، بس روانگی کا انتظار تھا جو
کے جانے میں کوئی دس دن باقی تھے جب خبر آئی کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی ہے اور ملک
سے باہر آنے جانے کے سب راستے بند ہو گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ملک میں باتیں مارد کی جماعتوں،
حکومت کا رنگ اڑا، جو معروف کارکن تھے سب گرفتاری کے بعد امتحان میں دیولی کیمپ میں نظر بند کر
دیے گئے، جو روپوش تھے ان کی کھوج میں گھر گھر چھاپے پڑنے لگے، ممنوعہ لٹریچر کی برآمد کے لیے تلاشیاں ہو
نگیں، ادھر کانگریس نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک شروع کر رکھی تھی اور دھڑا دھڑ گرفتاریاں پیش
رہی تھیں۔

یہ کافی ہنگامہ آرا دن تھے۔ میں نے امرتسر کو خیر آباد کہہ کر لاہور کے ایک کالج میں ملازمت کر لی
ان دنوں ہم جیسے لوگوں کو جو گرتی ... سے فاشزم اور نازی ازم کے خلاف لکھنے لکھانے میں بھی مصروف
تھے اور انگریزی سامراج کے خلاف عمل طور سے مصروف کار تھے، ایک عجیب ذہنی الجھن کا سامنا کرنا پڑا
لیکن جاپانی جنگ بازوں اور نازی ستم رانوں نے ہماری یہ مشکل جلد ہی حل کر دی، ادھر جاپانیوں کے ...



سارے مشرق اور جنوب مشرقی ایشیا کو تاخت و تاراج کرکے برصغیر کا دروازہ کھٹکھٹانے لگے اور ادھر فاشسٹ حملہ آوروں کے سیاہ بادل سارے یورپ کو پامال کرکے سوویٹ سرزمین پر منڈلانے لگے۔

انقلاب یہ تیسری تصویر نظر میں اترنے لگی سوویٹ یونین کے میدان کارزار کی تصویر۔

اس تصویر کو میں نے ذرا زیادہ قریب سے دیکھا ہے، جب تین طرف سے فاشسٹوں کا ریلا یعنی مشرق سے برما، مغرب سے شمالی افریقہ اور شمال سے جنوبی روس کی طرف بڑھنے لگا تو ایشیا دیس بھی اس سرتاج یورش کی زد میں نظر آنے لگا اور میں نے ہندوستانی فوج میں ملازمت کرلی۔ دوسرے فرائض کے علاوہ میرے ذمے ایک کام یہ بھی تھا کہ مختلف محاذوں سے جو خبریں ہمارے وائرلیس پر موصول ہوتی تھیں انہیں یکجا کرکے ریڈیو کے لئے ایک جنگی خبرنامہ اور اس پر تبصرہ تیار کروں۔ یہ ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے جب قریب قریب ہر محاذ پر انگریز اور امریکی اتحادی فوجیں پسپا ہو رہی تھیں ہمارے اور فاشسٹ حملہ آوروں کے درمیان اگر کوئی دیوار کھڑی نظر آرہی تھی تو وہ سوویٹ یونین ہی کے عوام اور سپاہی تھے جو قدم قدم پر غنیم سے مصروف دفاع تھے، ہم نے ان فوجوں کے اصل کمانڈروں کے ... سے ژدکوف، کونیف، تموشنکو، ٹمیشی، راکوسوسکی، میلنووسکی، گوروف وغیرہ جیسے مارگوریلا بہادروں کے کارنامے پڑھے، روپا متروسوف، گاستو اس زمانے میں ہمارے بعض دوستوں کے ہاں جو بچے پیدا ہوتے ان کے نام بھی انہیں کے ناموں پر رکھے گئے اور لو ولو لڑکیوں کے لئے زویا مہت مقبول نام قرار پایا۔ مختلف محفلوں میں میدان جنگ کا نقشہ سامنے رکھ کر ہر معرکے کے نشیب و فراز پر بحثیں ہوتیں شمال، جنوب، مشرق، مغرب، کتنے محاذوں پر بیک وقت کہاں کہاں خون بہہ رہا تھا، شمال میں لینن گراڈ، سکوف، نیس گراڈ، مغرب میں میسک، سمولینسک، جنوب میں کیف، اودیسہ، خارکوف، روستوف آن ڈان کس کس میدان پر کیا حشر بپا تھا اور ہر مقام پر محض سپاہی نہیں پوری قوم کے بچے بوڑھے، عورتیں مرد کس بے جگری سے لڑ رہے تھے ان کی روداد ہمارے سوویٹ ادیبوں کی نظم و نثر میں نظر سے گزرتی، الیا اہرن برگ، شولوخوف، سیمونوف، سرکوف، پولے ولئے اور بہت سے جانے انجانے ادیبوں سے جانثارانہ جاں سپاری، مزدوروں اور کسانوں کے ہاتھوں تعمیر کی ہوئی ان کی نئی دنیا پر بستیاں تاراج گائیں، ... محل گھر، کارخانے، تجربہ گاہیں، کھیت اور باغات ان سب کی تباہی اور بربادی اور ان کو بچانے کے لئے سرفروشی کی داستانیں اسی زمانے میں اہرن برگ نے اپنی کسی تحریر میں ایک جملہ لکھا تھا جو اب تک دل پر کندہ ہے وہ کچھ یوں تھا کہ "میاں بیوی آپس میں ملتے توڑ سکتے ہیں محبتیں چھوٹ سکتی ہیں اور عاشق و محبوب جدا ہو سکتے ہیں لیکن ایک رشتہ جو کسی صورت نہیں ٹوٹ سکتا ماں بیٹے کا رشتہ ہے اور ہمارا وطن ہماری ماں ہے"

جب تک ہمارے سب دوست اسیری سے رہا ہو چکے تھے، کمیونسٹ پارٹی اور دوسری مارکسی جماعتوں پر سے پابندیاں اٹھ چکی تھیں اور سب کی نظریں ان مختلف محاذوں پر جمی تھیں، ان کے بارے میں نظمیں لکھی گئیں، گیت گائے گئے، ڈرامے کھیلے گئے، آل انڈیا ریڈیو پر پہلی بار سوویت یونین کے حق میں زبان کھولنے کی اجازت ملی اور لکھنؤ کے ایک ریڈیو کے مشاعرے میں جہاں ہم سب لوگ جمع تھے مجاز، سردار جعفری، صدیقی، جاں نثار اختر وغیرہ مخدوم محی الدین مرحوم نے فارق تا ... کا منظوم ترجمہ اپنی انتہائی شیریں آواز میں سنایا۔

صف اعداء کے مقابل ہے ہمارا رہبر

ان دنوں مجھے سرور خبرنامہ تیار کرنے کی وجہ سے کم از کم یورپی سوویٹ یونین کا پورا جغرافیہ اتنا حفظ ہو چکا تھا کہ کسی سوویٹ طالب علم کو بھی نہ ہوگا۔ سب کی نظریں امید و بیم کے عالم میں ان سب محاذوں پر جمی تھیں۔ ہمیں نظریاتی وجوہ سے یقین تھا کہ فاشسٹ یہ جنگ نہیں جیت سکتے لیکن سب لوگ

ہمارے ہم خیال نہیں تھے شروع شروع میں تو کچھ کوتاہ اندیش لوگ انگریز امریکن فوجوں کی ہزیمت پر خوش تھے اور اس مغالطے میں مبتلا تھے کہ جاپانی یا جرمن اطالوی فوجیں انہیں انگریزوں کی غلامی سے نجات دلا دیں گی لیکن جنوب مشرقی ایشیا میں جاپانیوں کے مظالم اور یورپ میں دشمنوں کی چیرہ دستیوں کے سبب یہ خوش فہمی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی، تاہم یہ اندیشہ عام پایا جاتا تھا کہ فاشسٹ دیو کے خلاف سوویٹ انسان زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے گا۔ چنانچہ جب ماسکو اور لینن گراڈ چاروں طرف سے محصور ہو گئے تو ہمارے فوجی دفتر میں شرطیں بدی جانے لگیں کہ یہ شہر کتنے دنوں میں فتح ہوں گے، کوئی تین ہفتے کہہ رہا تھا کوئی ایک مہینہ۔ میں نے ایک انگریز دوست سے ایک ادھ تین کی بازی لگا دی کہ یہ شہر فتح نہیں ہو سکے گے اور آخرکار میں جیت گیا

اور پھر اسٹالن گراڈ کی جو اب وانگا گراڈ کہلاتا ہے تاریخی لڑائی شروع ہوئی، اب دنیا بھر میں تمام طاقتوں سے دوسرا محاذ کھولنے کے تقاضے ہونے لگے لیکن اصل بحث جاری تھا تاہم سبھی لوگ محسوس کر رہے تھے کہ جیت ہار کا فیصلہ اسی لڑائی پر ہے ہم بھی دور سے سانس تھامے اس کا نظارہ کرتے رہے آج اس محلے میں دونوں طرف جان کی بازی لگی ہے تو کل اس بازار میں کشتوں کے پشتے لگ رہے ہیں آخرکار جب سوویٹ فوجیں جیت گئیں تو ہندوستان میں بھی خوشی کے شادیانے بجے پھر کچھ عرصے کے بعد جرمن کمانڈر فان پالس کی ذاتی کاڑی اور ایک ٹینک نمائش کے لئے نئی دہلی لائے گئے کناٹ سرکس کے بیچوں بیچ جس میں ان کی نمائش ہوئی، جھنڈیاں لگائی گئیں، بینڈ بجائے گئے اور سب خلق خدا دیکھنے کو آئی۔

جنگ کی یہ تصویر بیک وقت بھیانک بھی تھی اور دلولہ انگیز بھی۔ اس کے بعد جب فاشسٹ طوفان جزر کر اتر گیا اتحادیوں کی فتح ہو گئی اور برلن پر سرخ جھنڈا لہرانے لگا تو اسی تصویر کے بہت سے نقوش دلوں پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو گئے۔

یہ تھے وہ تاثرات جو مختلف اوقات میں، مختلف صورتوں میں ہمارے دل و دماغ پر وارد ہوتے رہے اب طلب یہ تھی کہ ان کی تصدیق کیسے کریں اور یہ کیسے دیکھیں کہ سوویٹ سماج میں اور وہاں کا معاشرہ سچ مچ کیسا ہے اور وہاں کس طرح کی مخلوق بستی ہے۔

بامِ مینا سے ماہتاب اُترے
دستِ ساقی میں آفتاب آئے
ہر رگِ خوں میں پھر چراغاں ہو
سامنے پھر وہ بے نقاب آئے

عمر کے ہر ورق پہ دل کو نظر
تیری مہر و وفا کے باب آئے



فیض سے میری پہلی ملاقات

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم

سن ۱۹۲۱ء تھا اور اکتوبر کا مہینہ۔ مجھے سنٹرل ٹریننگ کالج سے گورنمنٹ کالج میں آئے ہوئے کوئی تین ہفتے گزرے تھے۔ سابقہ درس گاہ کی خشک تدریسی فضا اور ضبط و نظم سے طبیعت گھٹی گھٹی سی تھی نئے کالج میں آتے ہی طبیعت میں انبساط کی لہر دوڑ گئی ادب و شعر کا شوق پھر سے اُبھرا۔ چنانچہ "بزم سخن" کی وساطت سے ایک بڑے مشاعرے کی صدارت پروفیسر پطرس بخاری کے سپرد ہوئی۔ شام ہوتے ہی کالج کا ہال طلبہ سے بھر گیا۔ اسٹیج کے ایک طرف نیاز مندان لاہور اپنی پوری شان سے براجمان تھے۔ مقابل میں لاہور کی تمام ادبی انجمنوں کے نمائندے صف آرا تھے۔ دونوں جانب سے ترقی و ذوق اور حریفانہ شگفتگی ایک دوسرے کا خیر مقدم کر رہی تھی

روایتی دستور کے مطابق صدر نے اپنے کالج کے طلبا سے شعر پڑھانے کا اعلان کیا۔ دو ایک رحوردار آئے اور بڑے ادب و انکسار سے کلام پڑھ کر چلے گئے اچانک ایک دُبلا پتلا، سہمی سا لڑکا اسٹیج پر نمودار ہُوا، سیاہ رنگ، سادہ لباس، انداز میں متانت بلکہ خشونت، چہرے پر اجنبی ہونے کا شدید احساس۔ اِدھر اُدھر کچھ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اتنے میں اس نے کہا عرض کیا ہے۔ کلام میں ابتدائی مشق کے باوجود پختگی اور اسلوب میں برجستگی تھی۔ سب نے داد دی۔ یہ حفیظ ہوشیارپوری تھے۔

پھر ایک نوجوان آئے، گورے چٹے، کشادہ جبیں، حرکات میں شیریں روانی، آنکھیں اور لب بیک وقت ایک تبسم میں ڈوبے ہُوئے۔ شعر بڑے ڈھنگ اور حکمت سے پڑھے۔ اشارے ہُوئے، پطرس نے کچھ معنی خیز نظروں میں لاہور کے بیار سدوں سے باتیں کیں اور ان کی نیم خاموشی کو رضا سمجھ کر دونوں نوجوانوں کو دوبارہ اسٹیج پر بُلایا گیا۔ کلام سُنا۔ فیض صاحب نے غزل کے علاوہ ایک نظم بھی سنائی۔ غزل اور نظم دونوں میں سوچ کا انداز اور بیان کا انوکھا اسلوب تھا۔

مشاعرہ ختم ہُوا۔ قرار پایا کہ احباب ان دونوں کو ہمراہ لے کر عرب خانے میں جمع ہوں۔ رات کافی گزر چکی تھی، انھیں بورڈنگ میں پہنچنا تھا۔ بُخاری صاحب نے ان کی غیر حاضری کا ذمہ لیا اور پھر گھنٹہ بھر کے لیے شعر و سخن کی صحبت قائم رہی۔ یہ ان کی طبع آزمائی کا امتحان نہیں، اساتذہ کی حوصلہ افزائی کا امتحان تھا۔ دونوں کامیاب رہے۔

ابھی پُورا مہینہ نہیں گزرا تھا کہ کالج کے امتحانات کا آغاز ہُوا۔ جس دن کی میں بات کر رہا ہوں اس دن پطرس کالج ہال میں مہتمم امتحانات تھے اور ہم جیسے نوتجربوں کو چھوٹے کمرے سپرد کیے گئے تھے۔ مجھے کالج کی دُوسری منزل میں متعین کیا گیا۔ یہاں ایم اے انگلش کے طلبہ تھے اور ان میں فیض احمد فیض بھی تھے

امتحان کا کمرہ مقام احترام ہوتا ہے۔ اُمیدواروں کے ذہنی امتحان کے ساتھ ساتھ ضبط و نظم کا امتحان بھی ہوتا ہے۔ سگریٹ نوشی ممنوع تھی۔ میں نے اپنی عادت کو دبانے کے لیے پان کا انتظام کر لیا تھا۔ مگر فیض صاحب کبھی سوالات کے پرچے پر نظر ڈالتے اور کبھی میری طرف نیم متبسم نظروں سے دیکھتے اور پھر قلم کو اُٹھا کر سر کو کھجاتے اور کبھی خاموشی سے اپنے پڑوسیوں کی مزاج پُرسی کرتے۔ کبھی کبھی ان کا بایاں ہاتھ ایسے حرکت کرتا جیسے وہ کسی نامعلوم سے کنٹرول ہو رہے ہیں۔ میں سوچ رہا تھا وہ اُٹھے اور کہا ہمیں یہاں سگریٹ پینے کی اجازت ہے، میں نے کہا میں ابھی بتاتا ہوں۔

اتنے میں پطرس مختلف کمروں کا مُعائنہ کرتے کرتے میرے کمرے کے باہر آ کر کھڑے ہو گئے۔ میں تعظیماً پلیٹ فارم سے اُتر کر دروازے پر پہنچا، پُوچھا سب کچھ ٹھیک ہے، میں نے کہا جی،

میں نے عرض کیا، پروفیسر صاحب (میں انھیں پروفیسر صاحب کہا کرتا تھا) بعض طلبہ سگریٹ پینا چاہتے ہیں۔ اجازت ہے،

پطرس نے میرے کان میں دبی آواز میں کہا

"جب تک پروفیسر سوندھی سنگھ اس کالج کے پرنسپل نہیں بنتے۔ اس وقت تک پی سکتے ہیں:" اور پھر مُسکرا کر چلے گئے۔

میں نے اندر آتے ہی فیض صاحب کی طرف دیکھا اور اشاروں سے سگریٹ نوشی کا اعلان کیا۔ فیض صاحب کے ہاتھ میں فی الفور ایک سگریٹ نمودار ہُوا۔ جیسے قلم ہی سے اُبھر آیا ہو۔

پھر قلم کے رَس اور سگریٹ کے کش میں مُقابلہ شروع ہُوا اور اس کش مکش میں مُعطّر دُھوئیں کے غبارے پورے کمرے میں پھیل گئے۔ میں مُنتظم تھا، ضبط و نظم کی زنجیروں میں جکڑا ہُوا بیٹھا رہا اور قوام دار پان کو چھوڑ کر اس خوشبو سے اپنے ذوقِ سگریٹ نوشی کی تسکین میں محو ہو گیا۔

کیا معلوم تھا کہ دُھوئیں کے یہ غبارے کالج کی چار دیواری سے دُور دُور تک فضا میں پھیل جائیں گے اور ان میں سگریٹ پینے والے کے مُعطّر انفاس کی خوشبوئیں بھی ملیں گی اور ہُنر و فن اور ادب کی دُنیا کو اپنے آغوش میں لے لیں گی۔



فیض سے میری رفاقت

شیر محمد حمید

۱۹۲۹ء کی بات ہے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں تیسرے سال کا طالب علم تھا۔ چودھری نبی احمد اور آغا عبدالحمید میرے دوست تھے ہم سب نیو ہوسٹل میں رہتے تھے ہر شام ہم سیر کو نکلتے تو ایک نوجوان کو دیکھتے جو باہر بنگلے کے پاس تنہا کھڑا گرد و پیش سے بے خبر کالج ٹاور کی سمت نظریں جمائے، دور کسی اُفق کی وسعتوں کو دیکھ رہا ہوتا۔ اس کا سراپا دلکش اور محویت جاذب نظر تھی۔ تین چار دنوں کے بعد نبی احمد کے ذوقِ تجسس نے ہمیں اس نوجوان سے ہمکلام ہونے پر آمادہ کر لیا۔ قریب جا کر نبی احمد نے پوچھا "معاف کیجیے گا، آپ کون ہیں اور یوں گم سم تنہا کھڑے کیا دیکھا کرتے ہیں؟" نوجوان محویت کے عالم سے چونکا اور کہنے لگا "میرا نام فیض ہے میں نے مرے کالج سیالکوٹ سے ایف اے پاس کر کے یہاں تھرڈ ایئر میں داخلہ لیا ہے یہاں میرا کوئی واقف آشنا نہیں ہے"۔ نبی احمد نے کہا "آیئے آج سے آپ ہمارے دوست ہیں، یہ شیر محمد حمید ہیں یہ آغا حمید ہیں، یہ بھی آپ کے ہم جماعت ہیں"۔ وہ دن اور آج کا دن، ایک کم پچاس برس بیت چکے ہیں زندگی ہزاروں نشیب و فراز سے گزری، فیض کی دوستی کا وہ سلسلہ بدستور برقرار ہے اور یہ دوستی ہمارے لیے بحر و مسرت کا باعث رہی ہے۔

فیض کے والد خان بہادر سلطان محمد خان سیالکوٹ کے سرکردہ وکیل، معزز و معتبر شہری، ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیئرمین تھے۔ وجاہت و شرافت کا پیکر تھے، گھر میں ہر طرح کی آسودگی تھی فیض نے ناز و نعمت میں آنکھ کھولی تھی، لاڈ پیار میں پرورش اور گھر پر رکھ رکھاؤ اور رواداریوں میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ لاہور آئے تو ماحول مختلف پایا۔ کچھ کھنچے کھنچے رہتے ہمیں کافی جدوجہد کرنا پڑی کہ فیض اپنے خول سے باہر نکلیں چھ سات ماہ کے بعد ہم کامیاب ہوئے اور فیض حلقۂ احباب میں پھیلنے لگے۔

وہ زمانہ گورنمنٹ کالج کا سنہری دور تھا، بڑے بڑے نامور اساتذہ مختلف شعبوں کے سربراہ تھے پروفیسر ڈکنسن انگریزی کے صدر شعبہ تھے۔ تھرڈ ایئر کے امتحان میں انہوں نے ہمارے انگریزی کے پرچے دیکھے۔ پرچے واپس ملے تو فیض کے پرچے پر ایک سو پچپن نمبر درج تھے، کسی طالب علم نے پروفیسر صاحب سے پوچھا ان کو ڈیڑھ سو میں سے ایک سو پچپن نمبر کیسے مل گئے، جواب ملا Because I could not give more

فیض کی انگریزی دانی کے متعلق ایک نامور انگریز استاد کے یہ الفاظ سند رہیں گے۔

انہی دنوں پطرس بخاری کیمبرج سے فارغ التحصیل ہو کر گورنمنٹ کالج آ گئے۔ کالج کی علمی و ادبی دنیا میں ایک تہلکہ مچ گیا بخاری اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ان کی دلنواز شخصیت کا پرتو کالج کے ہر شعبے پر پڑا۔ کالج میں "بزمِ سخن" نام کی ایک اردو انجمن موجود تھی۔ اس کے اجلاس مشاعروں اور رسمی تقاریب تک محدود تھے۔ بخاری صاحب نے ناکافی سمجھ کر "مجلس" کے نام سے ایک نئی انجمن کا اجرا کیا۔ اردو علم و ادب سے شغف رکھنے والے طلبا کو چن چن کر اس کا رکن بنایا۔ فیض، راشد، آغا حمید، نبی احمد، حفیظ ہوشیارپوری اور یہ خاکسار اس کے بانی اراکین میں سے تھے۔ طالب علموں کے علاوہ بخاری صاحب کے ایما اور دعوت پر لاہور کے برگزیدہ ادیب و دانشور شریکِ مجلس ہوتے۔ ڈاکٹر تاثیر، مولانا سالک، امتیاز علی تاج، صوفی تبسم، چراغ حسن حسرت، بالالتزام اور حفیظ جالندھری کبھی کبھار تشریف لاتے۔ اجلاس اکثر و بیشتر بخاری کے دولت کدے پر ہوتے۔ ایک طالب علم مقالہ پڑھتا، ایک دو نظم یا غزل پیش کرتے، پھر سوال و جواب، تنقید و تبصرے کا دور چلتا۔ صاحبِ مقالہ کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی اور نئے نئے گوشوں کی طرف رہنمائی بھی۔ موضوع کے ہر پہلو کو کھنگالا جاتا۔ اور مشرق و مغرب کے اسالیبِ تنقید، قدیم و جدید اصولوں کے معیار پر پرکھا جاتا۔ غرض کوئی زاویہ، کوئی پہلو نظرانداز نہ کیا جاتا۔ اس دوران زمامِ بحث اکثر بخاری کے چابکدست ہاتھوں میں رہتی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے کی یہ نشست مہینوں کی دیدہ ریزی پر حاوی ہوتی۔ ہم لوگ انشراحِ قلب کی کیفیت لیے واپس لوٹتے۔ یہ بخاری کی کرشمہ زائی تھی کہ مدفون امکانات کو اُجاگر کر کے فیض اور راشد جیسے نامور اکابرِ مجلس نے پیدا کیے۔

فیض میں شاعری کا مادہ فطری و وہبی تھا۔ ہم لوگوں میں بھی فیض کی صحبت اور بخاری، تاثیر اور تبسم جیسے جید اساتذہ کے التفاتِ نظر کے باعث شعر و ادب سے کچھ لگن پیدا ہو گئی احباب کا حلقہ وسیع ہو چکا تھا۔ ہر شام ہوسٹل کے کسی کمرہ میں محفلِ مشاعرہ برپا کر بیٹھتے طرحی مصرع پر ہر کوئی دو چار شعر لکھ کر لاتا محفل کے اختتام پر ہر غزل میں شعر انتخاب کر کے ایک غزل مرتب تیار کر لیتے جو کالج کے مجلہ راوی میں "احباب" کے نام سے چھپتی۔ ظاہر ہے اس غزل مرکب میں حصہ وافر فیض کا ہوتا "ذی احباب" کے عنوان سے ایک طنزیہ فیض نے راوی میں لکھا تھا جو اب اُن کی کتاب "متاعِ لوح و قلم" میں شامل ہے۔

فیض کی شاعری پروان چڑھتی رہی۔ بین الکلیاتی مشاعروں میں فیض اکثر انعامات سمیٹتے رہے۔ ابھی کالج کا زمانہ تھا کہ فیض صفِ شاگرداں سے اٹھ کر مجلسِ اساتذہ میں شریک



ہو گئے اور بخاری، تاثیر اور تبسم کے احباب میں جگہ پالی۔

ہم نورتھ ایسٹرن میں تھے۔ دسمبر کی چھٹیوں میں فیض کی ہمشیرہ کی شادی تھی، وہ سیالکوٹ چلے گئے۔ اُن کے والد اس تقریب کی تیاری میں معروف تھے۔ جس صبح برات کو آنا تھا اُسی رات حرکتِ قلب بند ہو جانے سے اُن کا انتقال ہو گیا۔ اس قیامت کا اندازہ کیجیے جو اِس ناگہانی موت سے ان کے خاندان پر گزر گئی۔ فیض نے ایک فقرہ کا خط لکھا: "تمہارا فیض یتیم ہو گیا"۔ ان حشر سامانیوں کو کون سمجھے جو اس ایک فقرہ کی تہ میں موجود ہیں۔ اس سانحۂ عظیم نے گویا زندگی کی بساط اُلٹ دی۔ فیض کی زندگی کی کایا پلٹ گئی۔ اس کے قلب و ذہن میں ایک انقلاب آگیا۔ یہاں سے اس کی سوچ اور فکر کے ساتھ ساتھ اس کی شاعری نے بھی نیا رُخ اختیار کیا۔ غم جاناں کے ساتھ غم روزگار کا حال گسل پیوند لگ جانے سے سوچ کے دھارے نئی سمت میں بہنے لگے۔

فیض نے انگریزی اور عربی میں ایم اے کر لینے کے بعد ایم اے او کالج میں انگریزی کے استاد کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ وہاں ڈاکٹر تاثیر بطور پرنسپل اور صاحبزادہ محمود الظفر بطور وائس پرنسپل آ گئے۔ صاحبزادہ کی معروف رفیقۂ حیات ڈاکٹر رشید جہاں اور ان کے زمرہ کے دوسرے لوگوں سے میل جول بڑھا تو فکر و نظر کو اور وسعت ملی۔ ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا اجراء انہی دنوں ہُوا۔ فیض اس کے بانی رکن ہیں۔ اب وہ غم جاناں اور غم روزگار سے گزر کر غم وطن اور غم جہاں کی سنگلاخ راہوں پر چل نکلے۔ اپنی ذات کا دُکھ عالمگیر دکھ کے سامنے ہیچ اور اس آفاقی دُکھ کا ایک معمولی حصہ نظر آیا۔ فیض وطن دوستی اور انسان دوستی کی جس راہ پر گامزن ہُوئے اس میں ہزار آفتوں کا سامنا تھا۔ جسم و جان کی قربانیاں درکار تھیں۔ الحمدللہ کہ فیض کبھی مصیبت کا سامنا کرنے سے نہیں ہچکچایا۔ نگارِ وطن کی حرمت آزادی اور پھر تزئین و تجمیل کے شوق نے جس جس قربانی کا تقاضا کیا، پیش کر دی۔ یہ راہ طویل بھی ہے اور کٹھن بھی، لیکن راہروِ عشق کے قدموں میں نہ لغزش آئی اور نہ تھکن محسوس کی ———

تحریکِ آزادی کا یہ حیالا تحریکِ پاکستان کے معرکوں میں بھی ہراول رہا۔ پاکستان ٹائمز کے اجراء پر مدیرِ اعلیٰ مقرر ہُوا تو صحافتی محاذ پر قلمی جہاد کے معرکے سر کرتا رہا۔ پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو تعمیرِ وطن کے مراحل سامنے آئے۔ جس پاکستان کے خواب دیکھے تھے۔ ان کی تعبیر حسبِ مُراد نظر نہ آئی تو احتجاج کی صدا بلند کی۔ اور اربابِ اقتدار کو یہ طرزِ نوا پسند نہ آئی تو سازش کیس میں دھر لیے گئے اور قید و بند کے مصائب جھیلنا پڑے۔ سازش کیس کا مُعما کیا تھا، اس کے متعلق نہ کبھی ہم نے دریافت کیا اور نہ ہی فیض نے بتایا۔ معلوم یہی ہوتا ہے کہ ؎

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری تھی

اچانک گرفتاری، خوف و دہشت کی فضا، قیدِ تنہائی اور پھر سنٹرل جیل میں مقدمے کی سماعت، عجب گومگو کا عالم تھا۔ فیض کے اعزہ اور اقربا، دوست احباب سب پریشان تھے۔ فیض کے بڑے بھائی حاجی طفیل احمد، جو میرے بھی کرم فرما تھے، حیدرآباد جیل میں فیض سے ملاقات کر گئے اور وہیں حرکتِ قلب رُک جانے سے انتقال کر گئے۔ میں تعزیت اور دلجوئی کے لیے فیض سے ملنے حیدرآباد گیا۔ جیل کے اندر ملاقات ہُوئی میرا خیال تھا کہ مقدمے کی سختی، جیل کی مصیبت اور اب شفیق بھائی کی ناگہانی موت نے فیض کو سخت مضمحل اور بدحال کر رکھا ہوگا۔ میں یہ دیکھ کر متعجب رہ گیا کہ فیض کی ظاہری شکل و صورت میں کسی غیر معمولی تبدیلی کے آثار نظر نہ آئے۔ اضمحلال و پریشانی کا کوئی خاص نشان نہ تھا

فیض ٹھنڈے مزاج کے بے حد صلح پسند آدمی ہیں، بات کتنی بھی اشتعال انگیز ہو، حالات کتنے بھی ناسازگار ہوں وہ نہ برہم ہوتے ہیں اور نہ مایوس۔ سب کچھ تحمل اور خاموشی سے برداشت کر لیتے ہیں نہ کوئی شکوہ نہ کسی کا گلہ نہ چڑچڑاہٹ نہ بدگوئی۔ میں نے فیض کو کبھی طیش میں دیکھا ہے اور نہ کبھی کسی کا شکوہ شکایت کرتے سُنا ہے۔ ان کے دل کی گہرائیوں میں لاکھ ہیجان برپا ہوں، چہرے پر برہمی کی یا پریشانی کی کوئی لکیر نظر نہ آئے گی۔ فیض کا ظرف کتنا وسیع ہے، سمندر کی تہ میں طوفانوں کی رستاخیز ہے، سطح پُرسکون ہے یہ منزلت ہر کسی کو کہاں نصیب!

ہر معتدل آدمی کی طرح فیض پر بھی عشق و محبت کے حادثے گزرے ہیں۔ کچھ عام نوعیت کے رُومانی واقعات جن کا دیرپا اثر فیض کی زندگی اور شاعری پر نہیں پڑا لیکن دو ایک واردات اس قدر شدید تھیں کہ فیض کے قلب و جگر کو برما کے رکھ گئیں۔ "نقشِ فریادی" کی نظمیں رقیب سے، ایک راہ گزر پر، ایک ایسے ہی حادثہ کی یادگار ہیں جس کا اختتام مرگِ سوزِ محبت پر ہُوا۔ ایسے حادثے ہر کسی پر گزرتے ہیں لیکن فیض جیسے حُسن بین اور حُسن آفریں حساس فنکار بران کے جو گہرے اثرات مرتب ہُوئے ان کا سُراغ جا بجا ان کی شعری تخلیقات میں مل جاتا ہے۔

میرے نزدیک فیض کی زندگی کے اہم ترین واقعات میں ایلس جارج سے ان کی شادی ہے۔ یہ بظاہر ایک مشرقی نوجوان کا ایک فرنگی نژاد خاتون سے نکاح ہے ایسے نکاح آئے دن ہوتے رہتے ہیں، لیکن حقیقتاً یہ مشرقی قلب و رُوح اور مغربی جسم و دل کا وہ بارآور پیوند ہے جس نے مشرق و مغرب کی رعنائیاں یکجا کر دی ہیں۔ فیض ایک لاابالی سے نیاز این و آں اور خود فراموش سا نوجوان تھا۔ ایلس نے اس کی زندگی میں تربیت اور سنوار پیدا کر دی۔ اس کی بیقرار رُوح کو ایک حسین قالب میسر آگیا۔ ایلس نے مغرب اور اس کی تہذیبی روایات کو خیرباد کہہ کر مشرق اور اس کی ثقافتی اقدار کو اپنا لیا دیس کے ساتھ بھیس اور وطن کے ساتھ زبان تک بدل لی۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ایلس نے فیض کے فکر و نظر، جذبات و حیات اور آدرش تک اپنا لیے۔ قید و بند کی جن جن آزمائشوں سے فیض گزرے ہیں، ایلس کی غم خواری اور حوصلہ مندی کے بغیر ان جان لیوا مراحل سے یوں استقلال و یقینِ محکم کے ساتھ گزرنا مشکل ہوتا۔

فیض کا پیدائشی شہر سیالکوٹ ہے۔ رہائشی شہر لاہور کہہ لیجیے لیکن ہم جانتے ہیں کہ لائلپور سے بھی ان کو نسبتِ خاص ہے۔ ان کی جوانی کی کئی حسین یادیں اس شہر سے وابستہ ہیں ان کے مداح اور پرستار ملک کے اندر اور باہر ہر جگہ موجود ہیں لیکن لائل پور کے باسی ان سے دوگونہ التفات کے مستحق ہیں۔ اس لیے یہ آرزو کرنا کوئی بڑی جسارت نہ ہوگی کہ فیض ہمیں دل کے کسی محفوظ اور مخصوص گوشے میں جگہ دیے رکھیں۔





حبیب عنبردست





ناظم حکمت

فیض احمد فیض

ناظم حکمت کا نام ہم بہت پہلے سے جانتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ موجودہ دور میں ترکی زبان کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ انگریزی میں ان کی نظموں کے تراجم کا ایک مختصر سا مجموعہ ہمارے ہاتھ آگیا تھا جسے بہت سے لوگوں نے بہت شوق سے پڑھا۔ یہ مجموعہ بیشتر حبسیات پر مشتمل ہے اور ناظم کے طویل ایام اسیری کی یادگار ہے۔ چنانچہ میں اپنے جیل خانے کے دنوں میں ناظم کے جیل خانے کے ایام کا یہ مصرعہ اکثر یاد کرتا تھا۔

آلام کچھ بھی ہوں

اپنا سینہ بھرا دل درخشاں رکھو

ناظم حکمت نے زندگی کا بہت سا حصہ ترکی کے جیل خانوں میں گزارا اور پھر ۱۹۵۱ء کو سوویت یونین میں پناہ لی اور روس میں بس گئے۔ اگرچہ ان کا دل یہاں ہر طرح کی آسائش بہم ہونے کے باوجود یاد وطن میں تڑپتا رہا اور جلاوطنی میں لکھے ہوئے ان کے بیشتر حریہ اشعار کا موضوع یہی ہے۔

۱۹۵۸ء میں تاشقند کی افرو ایشیائی ادبی کانفرنس کے پروگرام میں ہم نے یک مشاعرہ بھی رکھوا دیا تھا جو یہاں کے لوگوں کے لئے ذرا سی حیرت تھی۔ سوویت یونین میں ہماری طرح کلام شاعر بزبان شاعر کا دستور تو ہے لیکن عام طور سے ایسی تقریبات میں صرف ایک معروف شاعر کا کلام سنا جاتا ہے یا کسی خاص تقریب کی مناسبت سے متعلقہ موضوع پر نظم اور ترانے پیش کئے جاتے ہیں۔ شاعروں کا اکھاڑا نہیں رچایا جاتا۔ اسی تاشقند مشاعرے میں ناظم سے پہلی بار ملاقات ہوئی اور اس کے بعد اس سے دوستی اور محبت کا رشتہ ۱۹۶۳ء میں ان کی اچانک وفات تک قائم رہا۔

ناظم حکمت دیکھنے میں بہت وجیہہ آدمی تھے۔ سوا چھ فٹ قد، چھریرا بدن، گہرے سنہری گھنگھریالے بال، سنہری آنکھیں، بہت تیکھے نقش اور سرخ و سفید رنگ۔ عمر میں مجھ سے آٹھ دس برس بڑے ہوں گے لیکن بالکل نوجوان دکھائی دیتے تھے۔ جاناں کے ہیں ایک دل کے پرانے عارضہ میں مبتلا تھے جو جیل خانہ میں لگا۔ تاریخ کی نوازش کے لئے عمر اور تحریک کی جدوجہد میں ایک زندگی صرف کر دی۔ تاشقند کا نفرنس کے بعد جب ہم ماسکو پہنچے تو ناظم نے ہم دو چار دوستوں کو اپنے گھر یعنی مصاحبت آرام گاہ میں مدعو کیا۔ یہ بڑے بڑے کمروں کی ایک بہت پرانی دیہاتی عمارت تھی۔

ایک دن کھانے پینے اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے میں گزرے، پھر ناظم نے کہا "چلو بھئی اب دوسرے کمرے میں چل کر گپ کرتے ہیں، بات یہ ہے کہ گپ کرنے کے آداب سے ہماری طرح پہلے ورکر تو آشنا تھے، بھی لیٹ کر ہی گپ کیا کرتے تھے لیکن ان یورپین لوگوں کو یہ ڈھب نہیں آتا۔ وہ تو کرسیوں سے بندھے بیٹھے رہتے ہیں۔" چنانچہ ہم تھوڑی دیر دوسرے کمرے میں گئے، یہاں ہم نے ساتھ ساتھ تکئے لگائے ہوئے کرسی رکھے تھے دیواروں پر ترکی مرحوں کے نامور مصوروں کی تصویریں اور ترکی کے مختلف ڈرائنگ کے دستر تھے جو ماسکو کے علاوہ اور بہت سے

آہ وہاں تب بیٹھ ہوئے تھے۔ ناظم نے کہا بات یہ ہے کہ یہ جو ہم گپ کرتے ہیں شعر کے سوال پیش آتا ہے۔ اصل میں ہر زبان کی روزمرہ بول چال کا ایک مخصوص آہنگ ہوتا ہے جس پر پوری توجہ دی جائے تو اس سے کئی طرح کے مترنم صوتی تجربے کئے جا سکتے ہیں۔ عوامی گیت تو بہت واضح چیز ہے لیکن اگر تم کسی بوڑھے شہری یا دیہاتی داستان گو سے کوئی پرانا قصہ سنو تو اس کی نثر میں بھی تمہیں اس زبان کا آہنگ ملے گا۔ کوشش یہ ہونا چاہیئے کہ اپنی زبان میں اس کے فطری آہنگ و ترنم کے امکانات دریافت کر کے اپنے شعر کی لے اس کے قریب لائی جائے لیکن ہم عام طور سے ایسا نہیں کرتے مثلاً تم اپنی زبان یا میری ترکی زبان کی مثال لے لو۔ ان زبانوں کا اپنا صوتی آہنگ تو کچھ اور ہے لیکن شعر میں یہ ذی سب عربی عروض کی رہنمائی میں۔ وہ کیوں، حالانکہ یہ پرانے اوزان اور بحریں تو ہم لوگوں نے اپنی بول چال، اپنے لوک گیتوں اور نغموں سے برآمد نہیں کیں بلکہ یہ بھی تم نے کتابوں میں پڑھا ہو گا کہ ان کے لئے کا اصل ماخذ اونٹ کی چال کا ردھم ہے۔ تم اس اونٹ کے قافلے کیوں سے پیچھے ہو۔ اپنے اپنی ایک صورت اور اپنے اپنے مزاج کے مطابق قدیم شعرا نے عربی بحروں میں ترمیم و اضافے اور تصرفات تو کئے جو سب نے قبول بھی کرلئے لیکن عروض کے بنیادی ڈھانچے سے منحرف ہونے کی ہمت کسی کو نہیں ہوئی۔ جب میں نے شعر لکھنا شروع کیا تو سب سے پہلے یہی مسئلہ سامنے آیا اور جب سے میں نے کوشش شروع کی کہ شعر میں عروض کے متبادل کوئی آہنگ پیدا کرنے کی صورت کی جائے۔ آہستہ آہستہ میں نے عروض کا سہارا بالکل چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب بہت سے جدید ترک شاعر ایسے ہی لکھنے لگے ہیں۔"

اس موضوع پر ہماری کئی بار گفتگو ہوئی اور بعض نظمیں جو میں نے ماسکو میں لکھی ہیں اور اس کتاب میں دوسری جگہ درج ہیں غالباً انہی گفتگوؤں سے متاثر ہیں۔

ناظم کہتے تھے "میری باتوں سے یہ مت سمجھ لینا کہ میں شعر و ادب کی پرانی روایت کے منکر ہوں یا اس سے یکسر قطع تعلق کے حق میں ہوں، بلکہ اگر غور کرو تو بات اس کے برعکس ہے۔ بات اس طرح ہے۔ ہماری روایت کا اصل ماخذ تو پرانا عوامی ادب ہے، عوامی گیت ہیں، داستانیں ہیں، رسمیں ہیں۔ کلاسیکی طرز اظہار اور عروض کی پاسداری کا دور تو بعد میں آیا اور اس تبدیلی کی وجہ محض شاعرانہ یا فنی پرکھ کی تحریک نہیں تھی بلکہ بنیادی وجہ تو معاشرے کے نظام اور بود و باش کے طور طریقوں کی کایا پلٹ تھی۔ ہم پہلے خود مختار اور خود کفیل قبائلی نظام کی جگہ یا شاہی، نوابی یا جاگیرداری نظام نے لے لی تھی۔ اس نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ نظام نے ایک نسبتاً ترقی یافتہ تہذیب پیدا کی اور شعر و ادب کو اسی سانچے میں ڈھال لیا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ ہمارے مشرقی ممالک میں صدیوں تک یہی نظام منجمد ہو کر رہ گیا اور اسی کے نتیجے میں ہم نے قدامت پسندی اپنا شعار ٹھہرا لیا، شعر و ادب میں بھی، سیاست اور معیشت میں بھی۔ لیکن اب یہ دور گزر چکا۔ انسانی دنیا صنعتی دور میں داخل ہو چکی ہے۔ زندگی کی نئے ڈھنگ، نئی ... اور بود و باش کے طریقے



بدل گئے، انسانی رشتوں کی صورتیں مختلف ہو گئیں۔ ظاہر ہے کہ اس دور میں انفرادی اور اجتماعی انسانی تجربات کی نوعیت اور ماہیت پچھلے زمانے سے بالکل مختلف ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان کے مناسب اور موثر اظہار کے لئے نئی صورتیں اور نئے سانچے بھی درکار ہوں گے۔ نظریاتی طور سے تو یہ سب لوگ تسلیم کرتے ہیں لیکن عملی طور سے بات جہاں پر اٹک جاتی ہے وہ ذہنی یا نظریاتی مسئلہ نہیں بلکہ جمالیاتی مسئلہ ہے۔ یعنی محض حقیقت کا اظہار کافی نہیں اس اظہار میں حسن کاری بھی لازم ہے۔ شروع شروع میں اس مسئلے کی پیچیدگی کا مجھے بھی پوری طرح احساس نہیں تھا چنانچہ نقش فریادی کے بارے میں سمجھتا ہوں کہ میری ابتدائی شاعری جو بیشتر سیاسی اور جلسے جلوس کی شاعری ہے بالکل یک رخی یا دوں ڈائمینشنل شاعری ہے جو وقتی یا ہنگامی طور پر مفید بھی ہوتی ہے اور موثر بھی لیکن جس کی لغت اور ہیئت میں کسی انسانی تجربے کی گہرائیوں اور باریکیوں کا عکس نہیں ملتا۔

"روایت، ہیئت اور موضوع کے الگ الگ خانے نہیں بنائے جا سکتے۔ مثلاً موضوع کے تقاضے کے مطابق میں نے پابند شاعری بھی کی ہے مگر ہر نئے زمانے کی کسی بات کا مفہوم نئے تو اس زمانے کی صحیح فضا پیدا کرنے کے لئے قدیم اور متروک زبان بھی استعمال کی ہے... علامتی یا عوامی دھنوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ فارم یا ہیئت کے بارے میں پہلے بھی میں نے کہیں کہا تھا کہ اس کی صورت تو کسی حسینہ کی ساق سیمیں یا ریشمی جراب کی سی ہے جو ساق سیمیں کے حسن میں تو اضافہ کرے لیکن خود اس... میں نظر نہ آسکے۔"

اس پر مجھے حسرت موہانی کا شعر سنایا اور بہت داد پائی،

رنگ قبا سے مل گئی جوئی جسم یار میں
اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

اپنے استدلال کے ثبوت میں ناظم دقتاً فوقتاً اپنی نظمیں بھی سناتے رہے ترجمے میں ان کا حسن کیا دکھائی دے گا بہرحال دو چار تراجم اگلے باب میں شامل ہیں۔

ایلیا اہرن برگ

فیض احمد فیض

۱۹۶۲ء غالباً جولائی یا اگست کا مہینہ ہے۔ لینن گراڈ شہر ملاقات کو سوار روحۃ الکبری میں تعصت اور ترحم سے ان نوجیر جوڑوں کو تک رہی ہیں جو اس کے چاروں طرف آہنی بینچوں پر بچھڑے دلی یاد آتی تھی لیکن اس شہر کا تو کوئی بدل ہماری طرف موجود نہیں۔ ماسکو کے برعکس یہ بالکل یورپی طرز کا شہر ہے۔ سڑکیں، چوراہے، عمارتیں، گرجے، شہر کے بیچوں بیچ بہنے والے دریائے نیوا کے پل بیشتر مغربی وضع کے ہیں لیکن پشکن کی زبان میں کانسی گھوڑے کے شہسوار پیٹر اعظم کا بسایا ہوا یہ شہر روس کی سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور انقلابی تاریخ کے آثار سے مالا مال ہے۔ پیٹر اعظم کے گھڑسوار مجسمے سے لب دریا شہر کی جانب چلیں تو ہر عمارت کوئی نہ کوئی پرانی یا نئی تاریخی یاد جگاتی ہے۔ اس مکان میں پشکن بڑا ہوا کرتا تھا۔ اس مہیب قلعہ میں سیاسی قیدی روشنی اور آزادی کو ترستے تھے۔ وہ آرورا جہاز ہے جس کے عرشے سے اکتوبر انقلاب کی توپ داغی گئی تھی۔ یہ سمولنی انسٹی ٹیوٹ ہے جہاں لینن نے اپنی انقلابی حکومت تشکیل کی تھی اور یہ زار کا محل ہے جو اب سرمئی عجائب گھر کے نام سے دنیا بھر میں مشہور ہے جس کے سب نوادرات، تصاویر، مجسمے، جواہرات، ظروف، ملبوسات وغیرہ وغیرہ اچھی طرح دیکھنے کے لئے چند گھنٹے تو کیا چند دن بھی کافی نہیں۔

اگلے دن یہاں یورپی ادیبوں کی کانفرنس منعقد ہو رہی ہے اور کچھ ایشیائی ادیب بھی مبصر کی حیثیت میں مدعو کئے گئے ہیں۔ چنانچہ میں اور ایلیس بھی آج ہی لندن سے یہاں پہنچے ہیں۔ دن بھر شہر میں پیدل گھومنے کے بعد سب لوگ ہوٹل میں سستا رہے ہیں لیکن ابھی دن نہیں ڈھلا۔ اس شہر میں ایک لمحہ بھی کسی بند کمرے میں ضائع کیا جائے۔ ہوٹل سے چند قدم پر ایک مختصر سا پارک ہے اور اس کے وسط میں پشکن کا دراز قد مجسمہ۔ اس وقت یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نے لینن گراڈ کی دلکش شام کو لبادے کی طرح اوڑھ رکھا ہے اور دو تین ٹمٹماتے ہوئے ستارے اس کے گھنگھریالے بالوں میں الجھ گئے ہیں۔ جانے وہ اس وقت سرگوشیوں میں کس سوچ میں غرق ہے۔ لیکن شاید اس کی درد مند آنکھیں

بچھڑے پتوں کی اوٹ میں لپٹے دو رشتوں دلچسپ کی بحث کو ستش کر رہے ہیں۔

اگلے دن ہم کانفرنس کے لئے لینن گراڈ ادیبوں کی انجمن کے صدر دفتر میں جمع ہوئے جو گئے وقتوں میں کسی بڑے امیر کا محل تھا۔ مندوبین میں بڑے بڑے نام شامل ہیں۔ فیدن، ایلیا اہرن برگ، تیونوخوف، سارتر، ایمپس، جان لہمان اور کئی دوسرے۔ تین دن کے مختصر قیام میں ان سب سے تو ملاقات ممکن نہیں تھی لیکن میں نے اپنے دوست مریم سلگانیک کے ذریعہ اہرن برگ اور سارتر صاحب سے ملاقات کی درخواست بھیجی اور ایک ہی سہ پہر میں ان دونوں بزرگوں سے یکے بعد دیگرے ملاقات کا وقت طے ہوا۔

پہلے اہرن برگ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ جب بھی کافی ضعیف نظر آتے تھے کمر جھک گئی تھی آنکھیں بھی کچھ دھندلا رہی تھیں چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی، میانے قد کے دبلے پتلے آدمی تھے جن کو دیکھ کر کسی تھکے ہوئے شکاری پرندے کی یاد آتی تھی۔ اہرن برگ صاحب کی بہت سی باتیں تو ہم کانفرنس کے دوران سن چکے تھے جب انہوں نے سوویٹ یونین کے بارے میں مغربی ادیبوں کے بعض اعتراضات کا جواب دیا تھا کوئی کوئی فقرہ مجھے یاد ہے "آپ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس میں کچھ اچھی چیزیں بھی ہوتی ہیں لیکن یہاں کے جدید ادب کا بہت سا حصہ آپ کے کہنے کے مطابق سپاٹ اور بے کیف ہوتا ہے جسے تخلیقی اعتبار سے معیاری ادب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ کتابیں لکھنے والوں کے اپنے جذبات و محسوسات کی ترجمانی کرنے کے بجائے آپ کی انجمن کی انتظامیہ کے ایما پر ان کے نظریات کی تبلیغ کے لئے



لکھی جاتی ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کا کہنا ایک حد تک تو صحیح ہے لیکن دو تین باتوں پر دھیان دینا ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جب ہم نے انقلاب برپا کیا تھا اور سوویت معاشرہ تشکیل دیا تھا تو ہم نے آپ سے اور ساری دنیا سے یہ اقرار تو ضرور کیا تھا کہ ہم ایک سوشلسٹ معاشرہ قائم کر رہے ہیں۔ ہم سرمایہ داری، جاگیرداری، مطلق العنانی، استحصال اور وہ سب خباثت ختم کر دیں گے جو طبقاتی نظام سے مخصوص ہیں۔ یہ سب وعدے تو ہم نے کئے تھے اور ہم نے انہیں پورا بھی کر دکھایا لیکن ہم نے یہ کب عہد کیا تھا کہ ہم گھٹیا ادب پیدا نہیں کریں گے اور یہ بھی کب کہا تھا کہ ہمارے ادیب کے قلم سے کچھ ایسی تحریریں نکلیں گی کہ ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ اس بات کو چھوڑئیے اب یہ بتائیے کہ آپ جسے گھٹیا یا غیر معیاری ادب کہتے ہیں وہ کس زمانے میں، کس ملک میں اور کس دور میں اچھے اور بڑھیا ادب کے مقابلے میں زیادہ کثرت سے پیدا نہیں ہوا ہے۔ آپ ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھئے آپ کے ہاں ہر سال سینکڑوں ناولوں کی تعداد میں لٹریچر چھپ کر تیار ہوتا ہے۔ ان کے مقابلے میں سنجیدہ اور معیاری ادب کے کتنے نمونے سال بھر میں سامنے آتے ہیں۔ ہمارا ادب سرے کیف سے سیاست سے بہرہ ور ہے لیکن آپ کے تجارتی اداروں کی طرح اس میں زہر اور پھوڑ کی ملاوٹ تو نہیں ہوتی۔ ہمارے ادیب یہاں کے محنت کشوں کی زندگی یا یہاں کے قومی تعمیری منصوبوں کے بارے میں اگر لکھتے ہیں اور بعض اوقات کامیابی سے نہیں لکھ پاتے لیکن آپ کے بیشتر ادیبوں کی طرح جرائم اور فحاشی یا امراء کی گھریلو زندگی کے بارے میں تو اپنا موضوع نہیں ٹھہراتے۔

آپ کہتے ہیں کہ ہمارے انقلاب کے بعد ٹالسٹائی، دوستوئیفسکی، چیخوف یا گورکی جیسا کوئی ادیب کیوں پیدا نہیں ہوا۔ یہ گورکی بھی انقلاب سے پہلے ہی کی پیداوار ہے۔ یہ بھی آپ کا کہنا ٹھیک ہے، ہم نے ٹالسٹائی جیسا ادیب ان تیس سال میں نہیں پیدا کیا لیکن ہم نے وہ بات پیدا کی ہے جو آپ ایک ہزار سال میں نہیں کر سکتے۔ ہم نے ٹالسٹائی پڑھنے والا پیدا کیا ہے۔ گریٹ ... جو آپ کے یہاں ہے اور اس کی جو عظمت ہے کبھی ہو گا۔ شیکسپیئر تو آپ کا ادیب ہے ہمارا تو نہیں ہے لیکن آپ نے گزشتہ تیس سو برسوں میں اس کے جتنے ایڈیشن جتنی تعداد میں چھاپے ہیں غالباً اس سے زیادہ گزشتہ تیس برس میں ہم چھاپ چکے ہیں۔ اور پھر آپ کے ہاں اسکول یا یونیورسٹی سے باہر شیکسپیئر کون پڑھتا ہے؟ یہاں ہر کوئی اس سے آشنا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ جینئس جیسے ہومر، یا شیکسپیئر یا ٹالسٹائی، کہیں بھی اور کسی دور میں بھی پیدا ہو وہ تو ہمیشہ ایک اتفاق یا ایکسیڈنٹ ہوتا ہے اس لئے اس کی پیدائش کا سہرا کسی معاشرے یا کسی دور کے سر باندھنا معقول بات نہیں اور اگر وہ کسی جگہ پیدائش سے انکاری ہے تو کسی پر الزام بھی نہیں دھر سکتے۔"

سہ پہر کے وقت ہم دونوں اس برگ صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے، بہت خندہ پیشانی سے ملے۔ اٹھ کر مصافحہ کیا اور رسمی رسال پرسی کے بعد پوچھا کہ کہاں سے آئے ہیں۔ میں کچھ باتیں ہو رہی تھیں کہ بیچ میں کافی آ گئی۔ پوچھنے لگے ہمارے ہاں کے ہوٹلوں کی معذرت شروع کر دی، ویسے پوچھو تو کسی مہمان کو اس ہوٹل کی کافی پیش کرتے ہوئے مجھے ندامت ہوتی ہے، یہ بھی کوئی پینے کے لائق چیز ہے۔ لیکن اس ہوٹل پر کیا منحصر ہے کوئی سا ہوٹل یا کوئی سا گھر ہو، بس میں ایسی ہی کافی ملے گی۔ دراصل ہم روسیوں کو دو کاموں کا سلیقہ بالکل نہیں آتا اور میرے خیال میں کبھی آئے گا۔ ایک تو یہ اچھی کافی نہیں بنا سکتے اور دوسرے ہوٹلوں کے لئے ڈھنگ کی تصویریں بنانا نہیں جانتے۔ یہ دیکھو یہ سامنے کیا لٹکا رکھا ہے۔" کمرے کی دیوار پر کچھ ویسی ہی مسند یا مبتذل تصویریں آویزاں تھیں جو ہوٹلوں میں اکثر دیکھنے میں آتی ہے۔ کسی جنگل، پہاڑ یا وادی کا منظر۔ لیکن میں نے عرض کیا یہ اس طرح کی تصویریں لگانے میں ایک منطق بھی ہے۔" اہرن برگ کہنے لگے "دیکھئے ہوٹلوں میں تو آپ زیادہ سے زیادہ دو چار دن مہمان ٹھہرتے ہیں۔ پھر آپ کو گھر لوٹنا ہوتا ہے اس

لیے بالکل معقول بات ہے کہ ہوٹل کے کمرے میں دلفریب کوئی ایسا سامان نہ دکھایا جائے جس کی یاد بعد میں آپ کو ستاتی رہے کیونکہ نہ جانے آپ کبھی اس ہوٹل میں دوبارہ آئیں نہ آئیں اور آئیں بھی تو کیا شرط ہے کہ وہی کمرہ آپ کو دوبارہ ملے۔ اس لئے ہوٹل کے کمرے میں جو بھی سامان مہیا کیا جاتا ہے وہ فرنیچر ہو، برتن ہوں یا دیوار پر لٹکی ہوئی تصویر ہو، سب کچھ غیر ذاتی، امپرسنل، میکانکی، اور بیگانہ قسم کا ہونا چاہیئے تاکہ آپ کمرے سے نکلتے ہی اپنے ذہن سے محو کر سکیں۔" پھر روس کے جدید ادب کی بات شروع ہوئی جس کا تذکرہ کانفرنس میں ہو چکا تھا۔ کہنے لگے "دیکھو یہ انقلاب کے وقت ہماری بیشتر آبادی ان پڑھ تھی۔ ایک عام آدمی سال بھر میں نے کتاب پڑھنا تو کیا کبھی کتاب کو چھوا بھی نہ تھا کہ اس کا لمس کیسا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے سامنے پہلا کام یہ تھا کہ پڑھے لکھے اور دانشور لوگوں کو محسوس کریں اس مخلوق کو جو ان اصل قوم سے پڑھنے کی ندرت سے آشنا کریں اور اس کے لئے لازم تھا کہم وہی ادب مہیا کریں جو اس انداز سے لکھیں کہ وہ سمجھ سکیں اور دلچسپی سے پڑھ سکیں۔ خیال یہ تھا کہ جیسے جیسے ان کی تعلیم ہو۔ ادبی معیار بلند ہو گا ویسے ہی بتدریج ان کے جمالیاتی اور فنی ذوق کی سطح بھی بلند ہوتی جائے گی۔" یہی ہوا ہے۔ میں تمہیں ایک قصہ سناتا ہوں۔ آج سے کوئی تیس پینتیس برس پیشتر میں اور میرے ایک دوست جو یہاں کے کافی ممتاز ادیب ہیں ایک کارخانے میں کسی تقریب پر گئے۔ حسب معمول تقریریں ہوئیں اور نظمیں وغیرہ پڑھی گئیں ہم دونوں نے بھی کچھ کہا سنا۔ جب ہم لوٹ رہے تھے تو میں نے اپنے دوست سے کہا دیکھئے ہمارے اصل پڑھنے والے اصل میں تو یہ ہیں۔ آپ ان کے لئے کچھ کیوں نہیں لکھتے۔ وہ کہنے لگے کہ یہ لوگ میرے معیار کو نہیں پہنچتے اور میرے لئے ان کی سطح پر اتر کر کچھ لکھنا بہت مشکل ہے۔" خیر بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن حال ہی میں تیس پینتیس برس بعد مجھے اسی کارخانے میں جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے دیکھا کہ کارخانے کی لائبریری میں اور کتابوں کے علاوہ میرے اس دوست کی کتابیں بھی رکھی ہیں۔ میں نے ان میں سے ایک دو کتابیں کسی پاس کھڑے ہوئے مزدور کو دکھائیں اور پوچھا کہ ان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ وہ کہنے لگے "کتابیں خیر ٹھیک ہیں لیکن یہ ہمارے معیار کو نہیں پہنچتیں۔" ایک اور مثال لے لو۔ آج کل ہماری سوویت ادیبوں کی الجھن کو دو مسئلوں کا سامنا ہے۔ ایک مسئلہ تو کاغذ کا ہے جو آج کل بہت کمیاب ہے اور دوسرا مسئلہ ایلیا اہرن برگ کا ہے اس لئے کہ آج کل ہماری آپس میں ان سے لیکن اس کے باوجود ابھی تھوڑے دن پہلے میری خود نوشت سوانح عمری دو جلدوں میں اور دس لاکھ کی تعداد میں چھپی ہے۔ جب اس کی اشاعت اور دکانوں میں پہنچنے کی تاریخ کا اعلان اخباروں میں کیا گیا تو مقررہ دن سے ایک رات پہلے سے لوگ کتابوں کی دکانوں پر قطاریں باندھ کر کھڑے ہونے لگے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کتاب ختم نہیں ہو گئی۔"

○

آئے کچھ ابر، کچھ شراب آئے
اس کے بعد آئے جو عذاب آئے



سارتر

فیض احمد فیض

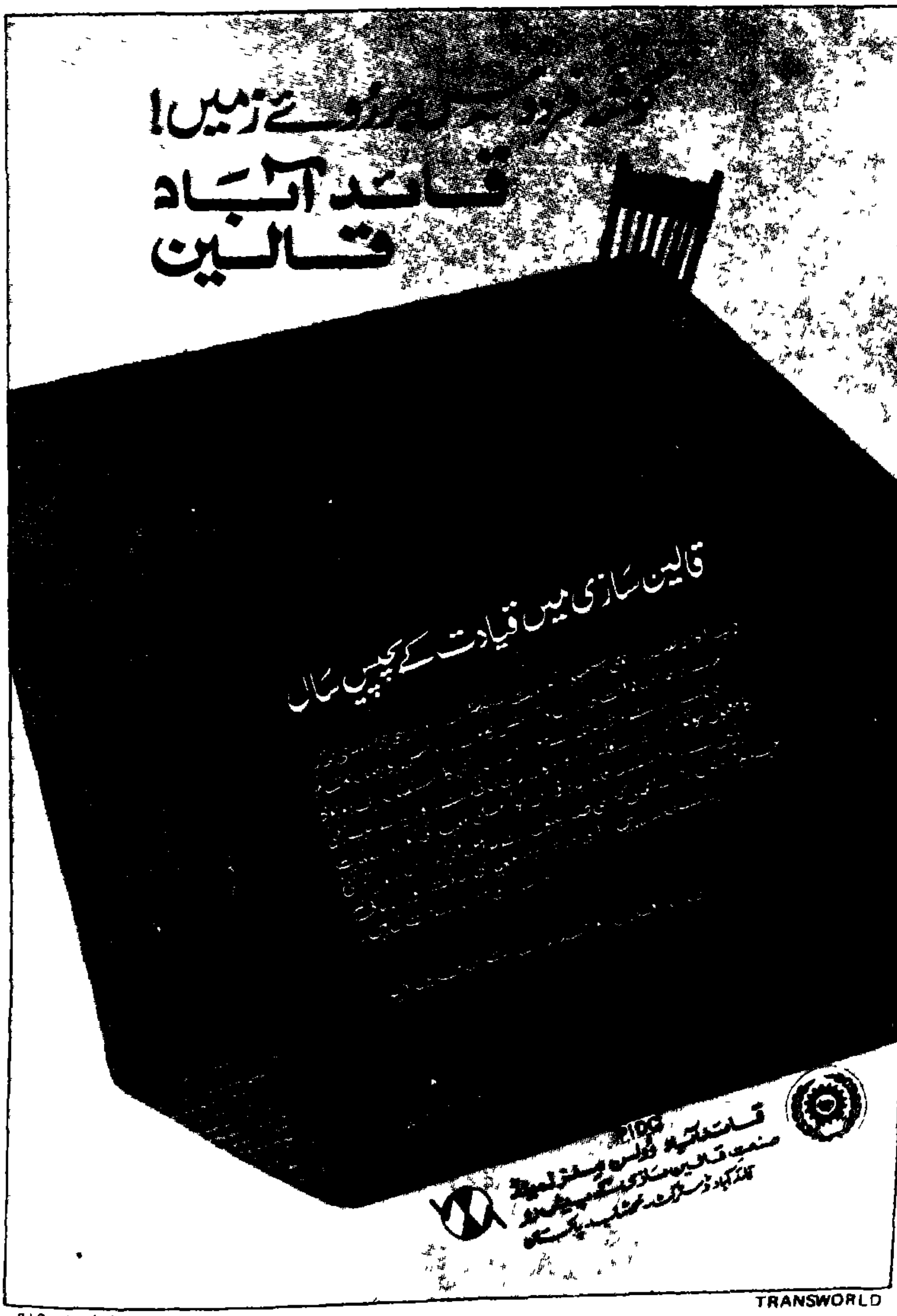
ان بزرگ صاحب سے حقیقت ... سارتر کے کمرے میں گئے ... میں دیکھو
سکتے لیکن کسی وجہ سے میں ان کی تقریر نہیں سن سکا تھا ... صورت میں سارتر ... رنگ
ہی مختصر ... پست قد کے گول مول سے شخص تھے جیسے عام آدمی میں ایک
کچھ نقص ہے اس لئے موٹے شیشوں کا چشمہ چڑھائے رکھتے ہیں۔ دیکھنے میں کوئی نہیں کہہ
یہ کوئی عظیم ادیب، مفکر یا ادیب ہیں۔ یہی گمان ہوتا ہے کہ کوئی میکینک یا کاروباری آدمی ہوں
ان کی قریب قریب سب کتابیں انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور ہمارے ہاں ... سے واقف
ان کے علاوہ مغرب کی بیشتر تنقیدی کتب میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ پھر ان کی ... نہیں کہ
رفیقۂ حیات سیموں دی بووا کی کتابوں میں ان کی شخصیت کی بہت سی جھلکیاں بھی ہم لوگ دیکھ چکے
اس وجہ سے انہیں مل کر تو ہمیں کسی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ کچھ دیر کے بعد سیموں دی بووا بھی
آ گئیں۔ ان کی عمر ڈھل چکی ہے لیکن بہت طرحدار، خوش وضع، خوش لباس خاتون ہیں۔
ویسے تو پہلے پہل فلسفۂ وجودیت کے واسطے سے ہوا تھا لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد ... بات
... اور الجزائر کی جنگ آزادی نے ان کے نظریات بہت حد تک بدل ڈالے ہیں۔ خاص
الجزائر میں فرانسیسی سامراجیت کے خلاف اور الجزائر کے مجاہدین کی حمایت میں ان کی ...
ہمیں ہم ایک بہت دلچسپ قدر مشترک ... کے ذکر سے بات شروع ہوئی۔

سارتر کہنے لگے "دو تین سو برس سے سب مغربی ملکوں پر فتحمندی کا نشہ طاری تھا اس دوران
ان کی آپس میں ... ہوتی رہی لیکن ان لڑائیوں میں کسی ہارنے والے نے اپنی ہار تسلیم نہیں
... اس کی ذمہ داری ہمیشہ غلط کار سیاست، اوٹ پٹانگ حریفوں یا یہودی سرمایہ داروں اور غیر ملکی
... پر ڈالتے رہے۔ چنانچہ اس فتح و شکست سے ان کی انا اور احساس برتری میں کوئی فرق نہیں آیا۔
... اسی صورت سے ٹوٹ سکتی تھی کہ انہیں کسی ایسے حریف سے ہزیمت کا سامنا کرنا پڑے جس
کی برتری وہ خود تسلیم نہ کرتے تھے یعنی ایشیا اور افریقہ کے محکوم اور پسماندہ عوام کا کوئی ملک
میں سمجھتا ہوں کہ ویت نام اور الجزائر کے حریت پسندوں نے اپنی فتحمندی سے اہل مغرب پر ہی نہیں
امریکہ پر بھی بہت بڑا احسان کیا ہے۔ یہ نہ ہوتا تو اہل مغرب کو اپنے ضمیر سے صفائی معاملات کرنے
جانے اور کتنے دن لگتے۔ تمہارے ہاں سے اگر انگریز بغیر لڑائی کے واپس چلے گئے تو انہوں نے تم پر
کوئی احسان نہیں کیا ... سے کچھ ... کیا ہے۔ گر وہ تمہیں بھی کچھ جہاد کا موقع
ملتا تو ایک تو تمہارا آپس میں خون خرابہ نہ ہوتا اور دوسرے تمہارے عوام کو اپنے دل و جگر اور
بازو کی طاقت کا بھی صحیح اندازہ ہو جاتا۔ پھر انگریز، عوام بھی تمہیں اپنے سے برتر نہیں تو برابر
تو سمجھنے لگتے۔ ویسے یہ بات سچ ہے ... ادبی اعتبار سے دیکھو تو ... جنگ ... سے
... کر جانے آپ لوگ کتنے عظیم ادبی تخلیق کاروں سے محروم ہو گئے ہیں۔ ... ایک بات کاٹ
... یہ بات ٹھیک ہے ... مگر یہ ... نہیں کہ ... صرف جنگ و جدل و قتال
... کہ مجھے ... بڑا ادب پیدا کرنے کے لئے ہمیشہ کوئی قیمت ادا کرنی ... جیسے

جس میں سارا ... کسی بڑی طاقت سے ادا ... ہونے کے ...
ان کے ... سے ہیں جن سے ... رہنے کے ...
تعمیر ... سامراجی ... طاقتوں کے خلاف ہو رہا ہے ... انسان ...
... جنگ ... عذاب ... انسان ...
کہیں ... ایشیا اور افریقہ کے ... میں ... مختلف صورت میں ...
ممالک میں جہاں انسان انسان سے ... نفرت یا بچھڑے ... اور ... سے ...
اور کیا ہو گا۔ لیکن ہمارے پاس یورپ یا مغربی ممالک میں اب لکھنے کو کیا رہ گیا ہے بھوک، بیماری، جہالت
غلامی، وہ سب کچھ تو ہم پیچھے چھوڑ آئے۔ اب کوئی بڑا خطرہ ہمارے پاس فتح کرنے کو نہیں۔ پیسے ملوں
کے سب کو اپنے کھڈے نکال لئے کوئی بڑا موضوع ہی نہیں ملتا۔ طبقاتی کشمکش کا تناؤ ... نے
ڈھیلا کر دیا ہے اب تو یہی ہے کہ ... کے جوڑوں پر بیٹھے ... بات ...
سے کھیلا کریں یا ماورائی خلاؤں میں مختلف موضوعات کے خیالی گھوڑے دوڑاتے رہیں۔ یہ ٹھیک ہے
کہ اگر کسی کو دیکھنے اور سوچنے کا ڈھب آتا ہے تو وہ ان کے بارے میں بھی اچھی کتاب لکھ لے گا اور اچھی
کتابیں لکھی جا رہی ہیں لیکن ان میں سے کسی بھی کتاب کو آپ ہومر یا شیکسپیئر یا ٹالسٹائی کے مقابلے
میں تو نہیں رکھ سکتے۔ البتہ فن اور تکنیک میں بہت سے دلچسپ تجربے بھی ہو رہے ہیں۔ ترقی بھی ہو رہی
ہے اور اس میدان میں آپ لوگ ابھی تک گھٹنوں کے بل چل رہے ہیں۔ وہ اس لئے کہ آپ کے
لئے آباؤ اجداد کی ادبی روایتوں کو ہم لوگوں نے آگے چلنے نہیں دیا اور آپ کو لا محالہ ہمارے اسالیب
اظہار کی تقلید سے شروع کرنا پڑا۔ کچھ ہوشیار لوگ اس پر قادر بھی ہو گئے لیکن وہ مستثنیات ... ہیں۔
ہو سکتا ہے کچھ اور لوگوں میں کہیں زیادہ جوہر وجود ہو تو محض اس وجہ سے نہیں کھل سکا کہ انہیں تعلیم
کے مواقع ہی میسر نہیں آتے۔ تو خود صورت حال یہ ہے کہ تکنیک ہمارے پاس ہے، موضوعات
آپ کے پاس ہیں۔ کوئی صاحب کمال ان دونوں کو یکجا کرے گا تو اس صدی کا ہومر یا شیکسپیئر یا
ٹالسٹائی جنم لے گا۔

ہم میں سے کسی نے پوچھا کہ شیکسپیئر، ٹالسٹائی تو پیدا ہو گا جب ہو گا آپ کے نظریہ ادب میں
عاشقانہ ... ادب کا بھی کوئی مقام ہے یا نہیں ... کہنے لگے کیوں نہیں۔ وہ تو دل کا ایک
فطری تقاضا ہے جس کی تسکین لازم ہے لیکن وہ تو ایک پگڈنڈی سی ہے شاہراہ نہیں ہے۔ ادب کی
شاہراہ کو تو کسی دور میں اسے ایک منزل سے اگلی منزل تک پہنچاتی ہے اس دور کی ذہنی، فکری،
جذباتی اور اخلاقی اقدار پر پوری طرح محیط ہونا چاہئے ورنہ بات آگے نہیں بڑھے گی۔ قبائلی دور کے شاعر کو
اپنے قبیلے کے ... رقیبوں پر ... ہوتے ... واقعات اور تجربات کے علاوہ اور کچھ جاننے کی ضرورت
نہ تھی۔ اس کے عہد کا تو یہی تقاضا تھا لیکن آج کل کا ادیب اگر انسانی معاشرے کی تاریخ اور حقائق
کی تبدیلیات سے بے خبر ہے تو ہم عصر حقائق کے بارے میں اس کا جذباتی اور ذہنی ردعمل خواہ کتنا بھی
صحیح ہو ... مگر دنیا کے کھوٹے کھرے کا بھی پورا اندازہ ... ہو سکے گا اور ...
... یقینی اس کی تحریروں میں بھی ملے گی۔"





قائد آباد
قالین
قالین سازی میں قیادت کے پچیس سال



کمندِ فیض





فیض احمد فیض

قومی آرٹ کلچر سے متعلقہ فکری مسائل

آرٹ اور کلچر پر فیض کمیٹی ۱۹۶۸ء کی رپورٹ سے اقتباس

ترجمہ راحت نسیم ملک

آرٹ اور کلچر کی نوعیت اور منصب کے بارے میں فکری مباحث عملی مقاصد کے حصول کی خاطر عملی لائحہ عمل کی سفارشات مرتب کرنے کے لئے قائم کردہ کسی چند رکنی کمیٹی کے دائرہ کار میں تو نہیں آتے تاہم کسی بھی موضوع پر کوئی عملی نوعیت کی پالیسی بنیادی خطوط واضح کیے بغیر ترتیب میں دی جاسکتی اس حصے کی معروضات کا مقصد گو یہ معروضات اپنی جگہ نئی نہیں یہی بنیادی خطوط فراہم کرنا ہے

کلچر اصطلاح اوّل اوّل ذہنی جانی احساس کی نشوونما اور ارتقاء کے فن کے لئے استعمال کی گئی تھی جس کی نوع انسان سے نسبت ہے۔ یہ اصطلاح معمولاً کسی خاص انسانی گروہ یا معاشرے کے مکمل طریق حیات کو بیان کرنے کے لئے استعمال ہوتی ہے یہ مکمل طریق حیات ظاہر ہے نظریاتی اور مادی دونوں اجزا یعنی اقدار اور سماجی اعمال کا مرکب ہوتا ہے کلچر کی اس تعریف میں یہ مفروضے مضمر ہیں

(الف) آرٹس کے برخلاف کلچر محض چند افراد کی تخلیق نہیں ہوتا بلکہ یہ کل عوام کے زندگی بسر کرنے کے عمل سے مرتب ہوتا ہے۔ اس طور آرٹس اجتماعی زندگی کرنے کے عمل کی محض دیا سلامتی تصریح ملتے ہیں

(ب) چونکہ ہر کلچر ایک خاص انسانی معاشرے سے متعلق ہوتا ہے اور ہر انسانی معاشرہ متعین زمانی و مکانی حدود میں بستا ہے لہٰذا ہر کلچر کی اپنی تاریخی اور جغرافیائی حدیں ہوتی ہیں گو کلچر کے نظریاتی جزو کی تشکیل میں زمان و مکاں کی حدود سے آزاد عوامل شامل ہو سکتے ہیں جیسا کہ مسلمان معاشروں میں نسلی، لسانی اور اس قسم کے دیگر اختلافات کے باوصف ثقافتی لحاظ سے کئی ایک پہلو مشترک ملتے ہیں۔

(ج) چونکہ کسی انسانی گروہ کا زندگی کرنے کا انداز اس معاشرے میں جاری سماجی ڈھانچے یا نظام کے زیر اثر ترتیب پاتا ہے، اس لیے اس گروہ کا کلچر یکساں نوعیت کی تراش خراش کا مظہر ہوتا ہے اس گروہ کے ثقافتی حالات میں کوئی تبدیلی بے علاوہ زندگی کی سماجی صورت میں بھی اپنے مطابق کوئی تبدیلی لیے سامنے آتی ہے۔ دوسری طرف جب سماجی حالات بدلتے ہیں تو اس گروہ کے کلچر کو بھی اسی طور بدلنا پڑتا ہے

(د) چونکہ کلچر محض اقدار مکمل نہیں، اقدار حیات ہوتا ہے، لہٰذا اس کے اوصاف اور رنگ ڈھنگ محض خیالات کے زبانی اظہار سے نہیں، زندگی گزارنے کے اصل عمل سے پھوٹتے ہیں۔ یہ بات سوچ سے بالاتر نہیں کہ کوئی معاشرہ اقدار کے ایک ضابطے پر بہت پختہ یقین رکھتے ہوئے بھی مادی معاملات کے پیش نظر حقیقت میں بالکل مختلف اقدار پر عمل پیرا ہو۔

ان سب باتوں سے یہ عیاں ہوگیا ہوگا کہ ثقافتی مسائل محض آرٹ یا قومی زندگی کے کسی اور مخصوص شعبے سے ہی متعلق نہیں بلکہ یہ ہر معاشرے کے سماجی و اقتصادی بناؤ بگاڑ کے بنیادی مسائل کا جزو لاینفک ہیں۔

لہٰذا ان مسائل کا حل بھی ان بنیادی سماجی و اقتصادی مسائل کے حل پر منحصر ہے اس طور ایک معاشرہ جو ذہنی ارتقاء کی بے میل سطحیں رکھنے والے مختلف سماجی طبقوں میں بٹا ہو، اس کا کلچر بھی علیحدہ علیحدہ پایے کی مختلف ثقافتی صورتوں میں بٹا ہوگا۔ ایسے معاشرے میں ایک مشترک یا یکساں کلچر کے ارتقاء کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ایک یک جان اور مساوات پر مبنی سماجی ڈھانچہ ترتیب پا چکا ہو۔

اسی طور یہ بات بھی عیاں ہو چکی ہوگی کہ سماجی تبدیلی کے ادوار میں پرانے زمانے کی موروثی ثقافت کے رنگ ڈھنگ اور موجودہ وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ نئے انداز باہم متصادم بھی ہو سکتے ہیں۔ ایسے ادوار میں، معاشرے کے لئے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی موروثی روایات کو جانچے پرکھے اور انہیں نئے سماجی حالات کے پیدا کردہ نئے عوامل کے ساتھ منضبط کرے۔ ماضی کی محض نقل ثقافتی نشوونما کی جڑوں کو چاٹ جاتی ہے اور ہم عصر صورتحال کی نفی اس کے آئندہ جاری و ساری رہنے کے امکانات کو لے ڈوبتی ہے۔

یوں اگرچہ کلچر اپنے اردگرد کے سماجی ڈھانچے کی حدود سے آگے نہیں نکل سکتا تاہم وہ اس کا ساتھ دینے سے معذور یقیناً ہوسکتا ہے دوسرے لفظوں



میں گو ثقافتی سرگرمی ایک مخصوص معاشرے کی آمدہ کی جانب پھیلنے کی صلاحیتوں سے تجاوز تو نہیں کرسکتی لیکن یہ امکان و اقتضا کی مطلوبہ رفتار سے پچھڑ ضرور سکتی ہے۔ اس قسم کی صورت حال پیدا کرنے میں ذیل کے عوامل کی طرح کئی عوامل کارفرما ہو سکتے ہیں۔

۱۔ سماجی تبدیلی کے مخالف اور مخصوص مفادات کے حامل بااثر عناصر کا زور

۲۔ عدم دلچسپی، لاتعلقی اور شکست خوردگی کے حامل رویے جو سماجی عدم مساوات کی انتہا کے شکار معاشروں میں اپنے استحقاق سے محروم اکثریت پر چھائے رہتے ہیں

۳۔ وسائل، سرپرستی یا مواقع کی کمی کے باعث معاشرے کے روشن ذہن عناصر کے ہاں مناسب تخلیقی سعی کا فقدان

لہٰذا جہاں ایک مفروضہ آئیڈیل کلچر کے لئے ایک مفروضہ آئیڈیل معاشرہ درکار ہے، وہاں روزمرہ کی اس نامکمل دنیا میں یہ ہر معاشرے کو کچھ رویوں کو قبول اور کچھ کو رد کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح ثقافتی دائرۂ عمل میں اسے ایسے اقدامات کو اپنانے یا نہ اپنانے کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے جو اس کی اپنی محدودات کے مطابق زیادہ سے زیادہ سماجی ترقی اور روشن ذہنی کی راہیں کھول سکتے ہیں۔

یوں آرٹ کا ایک اہم اور دہرا سیاسی کردار بنتا ہے اندرونی طور پر آرٹ قوم یا معاشرے کے لئے آئینہ بردار کی حیثیت رکھتا ہے تاکہ وہ قوم یا معاشرہ اپنے تشخص اور اپنی شخصیت کو دریافت کرسکے ایسی شخصیت کا یہ شعور ہی کسی قوم کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اسے اجزائے ترکیبی کو زیادہ ہم آہنگ انداز میں مرتب کرسکے

بیرونی طور پر آرٹ بین الاقوامی برادری میں کسی قوم کا تشخص واضح کرنے کا مؤثر ترین ذریعہ ہے

اس لحاظ سے آرٹ قوم کی پہچان اور اس کے فکر کی تعمیر کا ایک اہم وسیلہ ہوتا ہے۔ آرٹ کی صورت میں اظہار ذات کے قومی اسالیب کا باہمی تبادلہ اور روابط اعلیٰ ترین ہم عصر فکر و احساس میں کارفرما عمومی خطوط کی دریافت میں ہر معاشرے کے لئے ممد ثابت ہوتے ہیں یوں یہ بین الاقوامی دوستی اور تفہیم کی ترویج کے لئے ایک اہم عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔

ایک آئیڈیل معاشرے میں ایک آئیڈیل کلچر کے مسائل سے اس کمیٹی کا کوئی واسطہ نہیں اس کمیٹی کا احاطۂ کار صرف اس ثقافتی صورتحال تک محدود ہے جو آج کے پاکستان میں موجود ہے یہ صورتحال کن بنیادی سماجی و اقتصادی مسائل سے پھوٹی ہے اور ان مسائل کے حل کے لئے کونسا نسخہ کارآمد ہو سکتا، اس قسم کے سوالات بھی اس کمیٹی کے دائرہ کار میں نہیں۔ اس لیے ہم نے قومی کلچر کے صرف انہی اجزائے ترکیبی کے ساتھ اپنا تعلق رکھا ہے جن کے ضمن میں تمام تر محدودات کے باوجود عملی طور پر بہت کچھ کیا جاسکتا ہے اور کیا جانا چاہیئے ان اجزائے ترکیبی سے مراد ہمارے آرٹس ہیں۔

آرٹ کا کردار

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے، آرٹس کسی معاشرے کے مادی اور نظریاتی دونوں لحاظ سے زندگی کرنے کے انداز کا علامتی سطح پر ترسیلی ترشاتی صورت میں اظہار کرتے ہیں اسی طور آرٹس کسی قوم کے تشخص یا خدوخال کی صوری تشکیل ہوتے ہیں جن کی نسبت سے اسے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ کسی قوم کے آرٹس کی وصفی سطح اور معیار اس کی تہذیب کی وصفی سطح اور معیار کا پیمانہ سمجھے جاتے ہیں

کلچر کے برخلاف آرٹ اس سماجی زندگی کا عام مال نہیں ہوتا، جو افراد سے بالاتر قائم و دائم ہوتی ہے بلکہ یہ تو ہے ہی کاریگری، ماہرین فن کی باقاعدہ کوشش کا نفیس حاصل۔ یہ سند ہوتا ہے۔ آرٹسٹ کے ہاں عام لوگوں کی نسبت استعداد کی اعلیٰ تر آگاہی اور دوسروں کے مقابلے میں احساس کی بالاتر حبت کی۔ اس لیے کلچر کے برخلاف آرٹ محض زندگی کا غیر متحرک عکس نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک موثر وسیلہ ہوتا ہے زندگی کو پرکھنے، بدلنے اور بہتر صورت میں ڈھالنے کا۔ آرٹ اپنا یہ عمل اپنی قاری اور ناظر کے شعور کو تیز اور آمادہ کرنے کی صلاحیت کے ذریعے سرانجام دیتا ہے۔ آرٹ ذوق میں اچھے اور برے، تہذیب اور رعایا میں "مہذب" اور "غیر مہذب" اور مادی گردوپیش میں حسن اور بدصورتی کے مابین حد فاصل قائم کرتا ہے اس طور معاشرے میں اقدار اور اعمال دونوں کے لیے معیاروں کے تعین پر آرٹ کے نہایت گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اس لحاظ سے آرٹ معاشرے میں ایک اہم اخلاقی (اور بگڑی ہوئی صورت میں غیر اخلاقی) قوت ہوتا ہے

آرٹس کسی انسانی گروہ کی خواہشات، تحریکات، حملتوں، خوابوں، واہموں، کشمکشوں، خوشیوں، ناخوشیوں، کامرانیوں اور حسرتوں کے اظہار کے لئے ذریع وسیلہ مہیا کرتے ہیں۔ اظہار ذات کے یہ ذریعے معاشرے کے لئے اسی قدر فطری اور ضروری ہوتے ہیں جتنا کہ ایک فرد کے لیے ہنسی یا آنسو یا درد اور لذت کی سسکیاں اور سسکاریاں۔ ان ذرائع میں کسی قسم کی روک یا تعطل جمہور کے لیے اسی قسم کے مسرت رساں نفسیاتی مسائل پیدا کرسکتے ہیں جس قسم کے مسائل فطری جبلتوں کے دباؤ سے کسی فرد کے لیے پیدا ہو سکتے ہیں۔

یوں بھی اظہار جمہور کی ذہنی صحت کے ایک اہم عامل ہوتا ہے

آرٹ انسانوں کے لیے حظ کا ایک مسلمہ منبع ہے یہاں تک کہ بعض اوقات غلطی سے آرٹ کا واحد مقصد یہی سمجھ لیا جاتا ہے۔ یہی حظ دوسرے اخلاقی، ذہنی اور جذباتی عوامل کے ساتھ مل کر اچھے اور سنجیدہ آرٹ کو جمہور کے فارغ اوقات کے استعمال کے لیے سب سے زیادہ آگاہی بخش، مفید اور بامقصد وسیلہ بناتا ہے

یوں آرٹ انسانوں کے لیے مسرت کا ایک اہم واسطہ ہوتا ہے

یہ سب کچھ اور شاید اس سے بھی زیادہ پاکستان میں کئی ایک پلیٹ فارموں سے کئی ایک بار کہا جاچکا ہے لیکن اب تک اس ضمن میں اتنا کم کام کیوں ہوا ہے؟ آرٹ اور کلچر کے مسائل سے متعلق مغالطوں، مفروضوں، کم نظری اور حتیٰ کہ کج روی پر مبنی قومی رویوں کی بنا پر۔ ہم اس رپورٹ میں ان میں سے چند ایک کا ذکر کریں گے

قومی رویّے ـــ کلچر اور نظریہ

ایک مدرسۂ فکر کی نظروں میں تمام ثقافتی سرگرمی عمومی طور پر اور کھیل تماشے والے فنون خصوصی طور پر غیر اخلاقی اور راندۂ دین ہیں۔ اس مدرسۂ فکر کی ثقافت دشمنی اور فن دشمنی زیادہ تر مندرجہ ذیل عوامل کی بنا پر ہے

(۱) طویل غیر ملکی تسلط نے ہمارے پرانے معاشرے کے مقامی ثقافتی رنگ ڈھنگ کو پائمال کردیا اور غیر ملکی حکمرانوں نے اس کی جگہ اپنے ثقافتی سانچوں



کو درآمد کرنے کی سعی کی۔ کلچر اور آرٹ کے ضمن میں یہ رویہ تھے کہ استعمار کا شکار بنایا گیا اور صرف اس کی مغربی صورت کو قابلِ تقلید گردانا گیا۔ یوں ہماری قومی ثقافتی زندگی تہ و بالا ہو گئی اور قومی آرٹ کے سوتے سوکھ گئے جس کی وجہ سے ہمارے عوام کے کئی ایک طبقوں، خاص طور پر سول نشنز والا بالاتر طبقے کے دلوں اور ذہنوں سے اپنے قومی آرٹ کی محبت، احترام اور سمجھ بوجھ جاتی رہی

(ب) اس قسم کی نازک صورت حال کا شکار دوسرے ملکوں کی طرح برصغیر میں بھی مغل سلطنت کو زوال پذیری کے دور میں فنون چھوٹے موٹے درباروں کی نادہندی کے باعث بیگاروں کے ناکامیاب ذوق کے آلہ ہائے کار ہو کر رہ گئے۔ موسیقی اور رقص خصوصی طور پر اس سلوک کا شکار ہوئے جس کے نتیجے میں یہ آرٹس سماجی اور اخلاقی لحاظ سے دھندلا رہے ہوئے طبقے کی میراث بنا کر رکھ دیے گئے مغلوں کے زوال کے بعد اس نامناسب طرزِ عمل کے خلاف پیدا ہونے والے اخلاقی ہیجان اور علما لوگوں کے خلاف سماجی تعصبات کی رو میں وہ حالات ترچھلا دیے گئے جن سے آرٹ کی یہ گت بنادی گئی تھی لیکن آرٹ بجائے خود ساری نفرتوں اور تعصبات کا نشانہ بن کر رہ گیا

(ج) آزادی کے بعد ماضی کی نفرتوں کی یہ میراث ملک میں کچھ طبقوں نے اپنے سیاسی مفادات کی خاطر اپنالی۔ پہلے تو اپنی جانب سے تمام ثقافت کو رقص و موسیقی سے منسوب کرنے کی کی اور پھر لعو پیشہ وروں کے ہاتھوں اس آرٹ کی مسخ شدہ صورتوں کو رقص و موسیقی کی کل کائنات گردان لیا۔ اس کے بعد تو دلیل واضح تھی کہ ”آرٹ غیر اخلاقی ہے جذبات کو مادہ دیتا ہے، لہٰذا نظریاتی لحاظ سے ناقابلِ قبول ہے۔

اس دلیل کا جواب دینے کے لیے مذہب کے کوئی بہت زیادہ علم کی ضرورت نہیں، حمد، نعت، سلام، مرثیہ، قوالی حتیٰ کہ قرآن حکیم کی اچھی قرأت موسیقی کی صورتیں ہیں خٹک، ڈھالی، کاتھی، بھنگڑا، جھومر سب رقص کی شکلیں ہیں ترمیں یہ تمام صورتیں محض سادہ اور معصومیت کے ساتھ ہیں ہمیں شک ہے کہ کوئی زیادہ سوال حتیٰ کہ کٹر مذہبی لوگ بھی فنکارانہ اظہار کی ان صورتوں میں سے کسی کا بھی مسترد کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ لہٰذا اگر کسی آرٹ کے خلاف کوئی نظریاتی اعتراض کیا جا سکتا ہے تو وہ کسی خاص آرٹ کی کسی خاص صورت کے بارے میں، کل کے کل آرٹ کے بارے میں نہیں۔ اس کا واضح پروپیگنڈہ کرنا تو تحکم بے بنیاد ہو جاتا ہے کیونکہ اس مدرسہ فکر کے لیے بنیادی محرک اخلاق اور مذہب نہیں محض سیاسی مفادات ہیں اور ایسے محرکات ترقی پسند سائنسی تحقیق اور روشن خیالی کے سارے وسیلوں کے مخالف رہتے ہیں۔

(د) کلچر اور آرٹ کی مدد کی مخالفت ”کلچرل شو“ نام کی شے کی ہے جس اور بے جا غلط قسم کے سرکاری اور غیر سرکاری انجمنیں اکثر نام نہاد پیشہ وروں کے موسیقی، رقص اور تماشوں کے گھٹیا اور بے مایہ پروگراموں کی دکان کلچر شو کے نام سے چکاتی ہیں اس طرزِ عمل نے ثقافت دشمن مدرسہ فکر کے ہاتھ بھی مضبوط کیے ہیں اور آرٹ کے خلاف عام لوگوں کے تعصبات کو بھی پختہ کیا ہے۔

(ہ) قومی آرٹ اور کلچر کے بارے میں عوام اور سرکار دونوں کے عمومی طور پر منفی رویوں نے مغربی تجارتی اور سیاسی ایجنٹوں کے لیے ایک کڑی کی ثقافتی یلغار کے راستے کھول دیے ہیں چنانچہ ادھر چند برس سے مغربی کلچر کی جنس تشدد اور اوباشی پر مبنی کئی ایک فاسد اور کج رو جنس زدہ پڑھے لکھے پاکستانی لڑکے لڑکیوں کی مرغوب ثقافتی غذا بن چکی ہیں اور ان کی اظہارِ ذات کی فطری خواہش کی تکمیل کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ کمال یہ ہے کہ ہماری قومی ثقافتی اخلاقی اور نظریاتی اقدار و سنخ کرنے کی اس کوشش کے خلاف سب سے زیادہ بلند آواز انہی حضرات کی ہے جنہوں نے خود ہی اپنی کڑی مخالفت سے ہمارے اپنے قومی آرٹ کی ترویج اور اخلاقی اور جمالیاتی پرکھ کے سنجیدہ جمہوری معیاروں کے ارتقاء کی راہیں مسدود کر کے اس یلغار کے لیے راستے کھولے ہیں۔

اس ثقافت دشمن اور آرٹ دشمن مدرسہ فکر کی جانب سے پیش کی جانے والی دلیلوں کو بارہا ٹھکرایا جا چکا ہے اور سرکاری طور پر بھی انہیں کبھی تسلیم نہیں کیا گیا لیکن اس مسئلے پر کھل کر بات کبھی بھی نہیں کی گئی، نہ ہی کبھی کسی قومی حکومت نے فکری یا عملی لحاظ سے فن اور ثقافت کے میدان میں نرد اور مار دار کی حدیں واضح طور پر متعین کی ہیں نتیجتاً ریاست کے حکام فرداً فرداً کسی طے شدہ پالیسی کے بغیر ہی اپنی پسند یا ناپسند کے مطابق فنکاروں اور ثقافتی کارکنوں کے لیے قانون قاعدے نافذ کرتے رہتے ہیں۔

اولاً تو یہ بات سرکاری پالیسی میں عجب مضحکہ خیز قسم کے تضادات رونما ہونے کا سبب بنی ہے چنانچہ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ ملک کے آدھے حصے کی درسگاہوں میں رقص و موسیقی پر مکمل پابندی تھی اور دوسرے حصے میں یہ آرٹ تعلیمی نصاب کا باقاعدہ حصہ تھے چونکہ ملک کے دونوں حصوں کا مذہب بھی ایک ہے اور نظریہ بھی ایک لہٰذا دونوں حصوں میں کوئی ایک تو دین کی تکذیب کا مجرم تھا دوسرے اس بنا پر کئی ایک سرکاری حکام میں اس قسم کا احساس پیدا ہو گیا ہے کہ آرٹ اور کلچر کا معاملہ کچھ پُرخطر سا ہے لہٰذا بہتر ہے کہ اسے چھیڑا ہی نہ جائے اور اس سے اجتناب ہی برتا جائے تاآنکہ حکام بالا واضح طور پر کچھ اور چاہیں

دانش کمیٹی کی رائے ہے کہ

(ا) پاکستان میں آرٹ اور کلچر کی ترویج کے خلاف بیشتر نظریاتی اعتراضات مذہب یا فطرت پر مبنی نہیں بلکہ ان کی بنیاد ذاتی تعصب، سیاسی مفاد یا آرٹ اور کلچر میں اچھے اور برے کھرے اور کھوٹے، اخلاق اور غیر اخلاق کے مابین عدم امتیاز پر رکھی گئی ہے

(ب) ہر قسم کی فنی اور ثقافتی سرگرمیوں کی اندھی مخالفت کا جواز نہیں تاریخ سے ملتا ہے نہ روایات سے اور نہ ہی اعلیٰ مسلمان معاشروں میں مروج رسم سے ورنہ مسلم کلچر یا اسلامی تہذیب نام کی کوئی شے ہی نہ ہوتی

(ج) عوام کے ذہن سے آرٹ کی اصل نوعیت اور قومی زندگی میں اس کے صحیح کردار سے متعلق غلط فہمیوں اور الحاد کو دور کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ

(۱) آرٹ سے متعلق ایک مفصل اور واضح قومی پالیسی بنائی جائے اور اس پر عملدرآمد کیلئے ایک قومی ادارہ قائم کیا جائے

(۲) آرٹ کی پرکھ اور اس سے حظ اٹھانے کے لیے عوامی ذہن اور ذوق کی تربیت کی جائے اور اس تعلیم و تربیت کا طریق کار قیل و قال میں مثال ہو دلیل نہیں مثیل ہو یعنی اس کے لیے ہی اظہار کی سنجیدہ اور صحت مند صورتوں کی ترویج کیلئے سازگار حالات پیدا کیے جائیں

کلچر اور قومی ترقی

ملک میں ایک اور عام نقطہ نظر یہ ہے کہ کلچر اور آرٹ، اخلاقی لحاظ سے ناقابلِ پسند یا نظریاتی لحاظ سے قابلِ اہتمام نہ بھی ہوں، پھر بھی یہ عیاشی کے ضمن میں آتے ہیں، جو صرف امیر ملکوں کو ہی مبارک ہو۔ پاکستان جیسے ترقی پذیر ملکوں کو پہلے اپنی ترجیحات کا خیال رکھنا چاہیئے اور جس طرح ایک غریب آدمی آرٹ کے جھمیلوں میں پڑے

کی بجائے پہلے نانِ جویں کی فکر کرتا ہے، اسی طرح ان ملکوں کو بھی طاؤس و رباب آنے والے بہتر دنوں پر اٹھا کر اپنے تمام ذرائع زراعت اور صنعت جیسے میدانوں میں مادی ترقی کے لئے وقف کر دینے چاہئیں۔

ہم اس نقطۂ نظر کے ساتھ اتفاق کرنے سے قاصر ہیں

ایک ترقی پذیر معاشرے میں جہاں وسائل کی کمی ہر قسم کی ترقی کی راہ میں حائل ہے، تعلیم شخصی سرمایہ ہوتی ہے اور اسی طرح ترقی کے لئے ایک بنیادی عامل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طور کلچر کسی معاشرے کی اپنی اقدار، اپنی منزل اور اپنے خوابوں سے آگاہی کی ایک ہی صورت ہے اور یہ آگاہی کمانے خود قومی ترقی کے لئے ایک اہم متحرک ہوتی ہے ترقی کی جانب مسائل میں اگر اس جدباتی اور روحانی امداد کو نظر انداز کر دیا جائے، جو کسی قوم کے ہاں اپنے منزل اور اپنے خوابوں سے آگاہی کی دین ہوتی ہے، تو ان مساعی سے ترقی کے لئے کام کرنے والے کارگزاروں اور عوام کے مابین مخاصمانہ تضادات جنم لے سکتے ہیں۔ ترقی پذیر ملکوں میں ثقافتی سرگرمی کئی لحاظ سے سماجی و سیاسی سرگرمی کا ایک روپ ہوتی ہے اور صرف اسی سرگرمی کے ذریعے ہی قومی ترقی کی مساعی میں عوام کی بھرپور شرکت کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔

اگر قومی آرٹ اور کلچر پر اٹھنے والے کل مصارف کا مقابلہ گولف کے میدانوں، پُرتعیش تفریح گاہوں اور کچھ بینکوں اور تجارتی اداروں کے محلات نما دفتروں کی تعمیر پر اٹھنے والے خرچ سے کیا جائے تو غریب آدمی والی مثال کچھ ٹھیک نظر نہیں آتی۔ دوسرے ترقی پذیر ملکوں کی طرح پاکستان نے بھی نام و نمود والے کئی ایسے منصوبوں میں بھاری سرمایہ کاری کی ہے، جو مادی منفعت کے لئے نہیں، قومی اور بین الاقوامی سطح پر اپنی ساکھ اونچی کرنے کے لئے ہیں۔ یہ کمیٹی محسوس کرتی ہے کہ انہی وجوہات کی بنا پر قومی آرٹ اور کلچر کی ترویج کو قومی ترقیاتی منصوبوں میں اونچی ترجیح ملنی چاہیئے تھی کیونکہ قومی فنون ملکی ساکھ کے سرمایہ میں سب سے نمایاں اثاثہ اور اس کے نام کا سب سے زیادہ جاندار حصہ ہوتے ہیں

سرکاری سطح پر دیکھا جائے تو جہاں پھولوں کے انسداد سے لے کر سیاحت کے فروغ تک قومی زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں ہر نوع کا مناسب دفتری عملہ کام کرتا نظر آتا ہے، وہاں ساری حکومت میں کوئی ایسا اعلیٰ افسر نہیں، جس کے فرائض کا تعلق کلی طور پر قومی آرٹ اور کلچر کی ترویج سے ہو۔

غریب آدمی والی مثال اس ضمن میں کئی ایک اور وجوہات کی بنا پر بھی لاگو نہیں ہوتی۔ اب دیکھئے شاید ہی کوئی ایسا غریب آدمی ہو جو اپنے نانِ جویں کو کسی نہ کسی نوع کی ثقافتی تفریح سے تر نہ کر لیتا ہو۔ چاہے یہ تفریح لوک گیت یا لوک رقص کی صورت میں ہو، علم کی شکل ہو یا کھیل کے روپ ہو۔ اگر اس کو اپنے فارغ اوقات میں اس قسم کی کوئی تفریح نہیں ملتی تو وہ تنگ آکر نشوں اور منشیات کی دنیا کا رخ کرتا ہے۔ انسانی گروہوں، معاشروں اور قوموں کا مسئلہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اگر ریاست یا ذمہ دار عوامی ادارے عوام کی تفریحی ضروریات یا جدباتی آسائش کے تقاضوں سے عہدہ برا نہیں ہوتے تو ظاہر ہے یہ بساط عوامی اور اخلاقی ذمہ داریوں سے عاری گماشتوں کے لئے کھلی ہے۔ یہ عناصر جو کچھ مہیا کریں گے وہ قوم کی ذہنی اور اخلاق کیلئے شاید نشہ آور دواؤں اور منشیات سے بھی زیادہ مہلک ثابت ہو۔



دوسرے مادی طریق ہائے پیداوار میں فنون، تعلیم ہی طرح کا عامل ہوتے ہیں جس طرح تعلیم بہتر مہارت پیدا کرتی ہے اور یوں قومی تعلیم میں سرمایہ کاری قومی پیداوار پر براہِ راست اثر انداز ہوتی ہے۔ اسی طرح فنون ڈیزائن اور فیشن کی دنیا میں رفعت پیدا کرتے ہیں اور یوں فنون میں سرمایہ کاری صنعتی پیداوار کی بعض صورتوں کا معیار بلند تر کرنے میں براہِ راست کردار ادا کرتی ہے۔

تیسرے آج کی دنیا میں ایڈورٹائزنگ اور پبلک ریلیشنگ اب محض عیاشی نہیں سمجھے جاتے بلکہ صنعتی مصارفات میں انہیں خاصی اہمیت دی جاتی ہے قومیں اپنی ایڈورٹائزنگ اور پبلک ریلیشنگ ثقافتی تیاریوں یا نئی تخلیقات اور مظاہروں کے تبادلوں کے ذریعے کرتے ہیں

اس لئے اس کمیٹی کی رائے ہے کہ قومی ترقیاتی منصوبوں میں آرٹ اور کلچر کے مقام پر دوبارہ غور کیا جائے اور اس کے مقام کو زیادہ صحیح طور پر پہچانا جائے

کلچر اور قومی تشخص

قیامِ پاکستان سے پہلے ظاہر ہے پاکستانی قوم نام کی کوئی شے موجود نہیں تھی۔ تاریخی لحاظ سے آج کے پاکستان کے عوام (ماسوا چند ایک اقلیتوں کے) ہندی مسلمانوں کا ایک حصہ تھے نسلی اور جغرافیائی لحاظ سے وہ ان علاقوں کے ناموں سے پہچانے جاتے تھے، جہاں وہ رہتے تھے مثلاً بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچی، پٹھان۔ سو ان حالات میں جب ایک نئی پاکستانی قوم وجود میں آئی تو اس کا کلچر ہی سالم مکمل صورت میں یک جان موجود نہیں تھا ملک کے مختلف علاقوں کے سماجی ارتقاء میں تفاوت، رسمی اور جغرافیائی حالات کے فرق نسلی اور تاریخی عوامل اور غیر ملکی حکمرانوں کی قائم کردہ انتظامی حد بندیوں نے مل کر آج کے پاکستان کے عوام کو کلچر کے معاملے میں گوناگوں رنگوں کا مرکب بنا دیا البتہ پاکستان کے سب خطوں کے عوام ایک ساتھی تاریخی واردات میں شریک رہے تھے اور ان کے ہاں ان اخلاقیاتی اور ثقافتی اسالیب کی ساجھ بھی موجود تھی، جو ایک ہی دین کی پیروی سے پھوٹے تھے۔ برصغیر کے مسلمان، تاریخ کے ایک لمبے دور سے گزر کر اسی مشترک دین اور ان اقدار اور سماجی زندگی میں ان کے اظہار کے حاصل کی بدولت ایک علیحدہ اور نمایاں ثقافتی اکائی کے طور پر اُبھرے۔

اس کلچر کی تعریف پر خاصا اختلاف رائے موجود ہے، تاہم اس بات پر اتفاق نظر آتا ہے کہ ہر وہ چیز جو ہمارے عوام کی سماجی اور تاریخی زندگی میں رچ بس چکی ہے، پاکستانی عوام کے کلچر میں شامل ہے دینِ اسلام جو ہمارے عوام کی زندگی کیلئے اخلاقیاتی اور نظریاتی بنیاد مہیا کرتا ہے، مختلف لسانی علاقوں کے مقامی کلچر جو ان کے مخصوص ثقافتی ماضی کی میراث ہیں اور مغربی کلچر کے عناصر جنہیں برطانوی تسلط کے زمانے میں اپنایا گیا، اس مرکب کے نمایاں اجزا ہیں۔ ان میں اقلیتوں کی، جو کہ پاکستانی قوم کا ایک حصہ ہیں، مخصوص ثقافتوں کو بھی شامل کر لیجئے۔

اس بات سے دو بحث طلب مسئلے پیدا ہوتے ہیں

۱۔ اگر پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے اور اس کا نظریہ اسلام ہے، تو کیا



مسلمان کلچر یا اسلامی کلچر اپنی جگہ پاکستانی کلچر کی تعریف کے طور پر کافی نہیں کیا اس عام تعریف سے مالا یا علیٰحدہ ثقافتی تشخص کی دریافت یا تلاش ہی کوئی ضروری یا قابل پسند امر ہے اس طرح کے دلائل دو واضح حقیقتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں

اولاً تو یہ کلچر کے غیر نظریاتی حصوں مثلاً زبان، لباس، خوراک، فن تعمیر، فنون اور دستکاریوں، غیر مذہبی رواج اور سماجی رسوم کی حقیقت کو پس پشت ڈال دیتے ہیں یہ چیزیں تو تاریخ اور جغرافیائی حالات کی پیداوار ہیں، جنہیں اسلامی یا غیر اسلامی قرار نہیں دیا جا سکتا بنگالی، اردو، پنجابی، سندھی یا پشتو زبانیں، شلوار، ساڑی، اجرک، رلی، جامدانی، مالکی ٹائلیں، کنڈی، گلکاری، سالامار باغ، حضیالی گیت ہیر وارث شاہ، چکن تکہ، لسی اور لاہور بازار سو ایسی چیزیں ہیں جنہیں نظریاتی خانوں میں بانٹا جا سکے اور یہ چیزیں مسلمانوں کے کسی اور ملک کے کلچر کا حصہ بھی نہیں مسلمان ہونے کی حیثیت سے پاکستانیوں اور دوسرے مسلمانوں کے مابین نظریے کے اشتراک کے علاوہ ایک مشترک ثقافتی ورثہ، جسے مجموعی طور پر مسلم کلچر کہا جاتا ہے کے کئی عناصر کی سانجھ ہے لیکن پاکستانی ہونے کے ناطے ان کی کچھ اپنی مخصوص ثقافتی پہچان بھی موجود ہے جس کی بنا پر وہ اپنے دوسرے ہم مذہبوں سے ممیز معاشرہ اور قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دوسرے ایسے دلائل "قومیت" کی سیاسی حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ قومیت ہمارے خود ایک آزاد وجود کی سیاسی حقیقت کی مظہر اور اس طور ریاست کے ہم معنی ہوتی ہے۔ یہی وہ تشخص ہے جو قوموں کی برادری میں عوام کی پہچان ہوتا ہے قومیت نئی سے ہو یا اچھی لیکن جب تک یہ ایک سیاسی حقیقت ہے پاکستان کا شہری پاکستانی ہی رہے گا اور سوڈانی یا انڈونیشی نہیں کہلائے گا تا آنکہ وہ اپنی قومیت بدل لے۔ حالانکہ مذہباً پاکستانی، سوڈانی یا انڈونیشی تینوں ایک ہی دین کے پیروکار ہیں سو ایک پاکستانی اور اس کی قوم کو جو شے ایک سوڈانی یا انڈونیشی سے ممیز کرتی ہے وہ دین و مذہب کے علاوہ کچھ اور ہے یہ کچھ اور اس کی قومیت اور اس کا کلچر ہیں جو ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔

(۲) دوسرا مسئلہ علاقائی ثقافت کا ہے ہمارے عوام کے کلچر کی مبادی اور مخصوص صورتیں یعنی ان کی زبان، لباس، رواج، فن تعمیر، موسیقی، لوک فن وغیرہ نظری طور پر بڑے شہروں کی نسبت مختلف علاقوں کے دیہاتوں اور غیر شہری حصوں میں محفوظ تر رہی ہیں کہ بڑے شہروں میں تو غیر ملکی اثرات کے تحت بین الاقوامی سی فضا ہوتی ہے، جس میں بہت سے عناصر اور خصائص ایسے ہوتے ہیں جو کلی طور پر قومی نہیں ہوتے ان لوک ثقافتوں کی ترقی جاگیردارانہ معاشروں کے انتشار، جاگیردارانہ سرپرستی کے خاتمے اور بڑے شہروں میں دولت، اقتدار اور تعلیمی و ثقافتی سہولیات کے ارتکاز کی بنا پر ارتقا کی مختلف منزلوں پر رک گئی تھی لہٰذا اب ضرورت ہے کہ اس جمود کو توڑا جائے اور ان علاقائی ثقافتوں میں جو کہ اس سب کچھ کا سب سے زیادہ مستند ذخیرہ ہیں جو خاص پاکستانی ہے، نئی روح پھونکی جائے یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں پہلا تو یہ کہ آیا علاقائی ثقافتوں کی اس ترویج سے علاقائیت کے مرکز گریز رجحانات پیدا ہو کر قومی استحکام کی راہ کا روڑا تو نہیں بن جائیں گے۔ دوسرے آیا علاقائی ثقافتوں کی نو دریافت اور ترقی سے آخر کار قومی سطح پر کسی قسم کی امتزاجی صورت پیدا ہو گی۔

اس سلسلے میں جو آرا ہم نے اکٹھی کی ہیں ان کے متفق پہلوؤں کا خلاصہ کچھ یوں بنتا ہے

(ا) جیرات کی طرح کلچر کی ابتدا بھی گھر ہی سے اچھی لگتی ہے یہ امر فطری لگتا ہے کہ پیشتر اس کے کہ پاکستان کے کسی شہری کے دل میں ایک ایسے قومی کلچر کی محبت گھر کرے یا اس کے ہاں اس کی پہچان پیدا ہو جو ابھی ارتقا کے مرحلے میں ہے اور جسے وہ ابھی تجریدی صورت میں ہی جانتا ہے، یہ ضروری ہے کہ پہلے اس کے ہاں اس علاقائی کلچر کی محبت، تعظیم اور پہچان پیدا ہو، جو ترقی یافتہ یا غیر ترقی یافتہ کسی نہ کسی صورت میں موجود تو ہے اور جسے وہ جانتا اور سمجھتا ہے۔ اگر ہمارے تمام علاقائی کلچر ہمارے قومی کلچر کی کلیت کا جامد اور جز ہیں، تو جزو کی محبت کل کی محبت پر حاوی نہیں ہوا کرتی بلکہ حقیقت میں دل میں راہ بنایا کرتی ہے اس موضوع پر پیدا ہونے والا فکری الجھاؤ دراصل اس کج فہمی سے ہوتا ہے، جو قومی اور علاقائی ثقافتوں کو رقیبانہ مخاصمت کے ماحول میں تصور کر کے یہ فرض کر لیتی ہے کہ ان میں سے صرف کوئی ایک ہی دوسرے پر حاوی ہو کر پھل پھول سکتی ہے یہ کج فہمی اس واضح حقیقت کے ادراک سے دور ہو سکتی ہے کہ جس طرح ملک ایسے مختلف علاقوں کی جغرافیائی وحدت ہوتا ہے اور قوم ان علاقوں کے عوام کی سیاسی وحدت کا نام ہے، اسی طور قومی کلچر بھی ان علاقائی ثقافتوں اور تاریخ کے اتحاد بخش رشتوں کے مجموعہ ہوتا ہے قومی کلچر کا ارتقا بھی اسی بات پر ہے کہ پاکستان کا ہر شہری اپنی پیدائشی اور گھریلو ثقافت سے محبت کرے، اس کی تنظیم کرے اور اس میں خلاقانہ طور پر شریک ہو اس لئے اس سرگرمی کو اجتماعی قومی تخلیقی عمل کا حصہ بنائے اور انہیں یک نفس کر دے۔

(ب) حقیقی قومی استحکام محض کچھ اقدار اور اعتقادات جن پر عبادات یا مادی محرکات کی کوئی بھی نسبتاً تند رو حال آ سکتی ہے کے اشتراک سے جنم نہیں لیتا بلکہ اس میں تو اشتراک ہوتا ہے اجتماعی واردات کا اجتماعی فکر، احساس اور فراست کی سنگت کا کلچروں، ثقافتوں، سیمیناروں، افراد کے تبادلوں وغیرہ کے اپنے فوائد ہوں گے لیکن ہمارے ہاں تعلیم و دانش کے موجودہ ارتقائی تناظر میں یہ سب کچھ صرف چند گنے چنے لوگوں کے دماغوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے ان ذرائع کی رسائی عام آدمیوں کے دل و دماغ تک نہیں عام آدمیوں تک اپنی بات پہنچانے کا واحد وسیلہ فنون ہو سکتے ہیں علاقائی ثقافتوں، فنون دستکاریوں اور ادب کی گلکاری اور فنکارانہ اظہار کے وسیع پیمانے پر مستقل تبادلے نہ صرف قومی استحکام کی راہ نہیں روکیں گے بلکہ یہ تو اس عمل میں سب سے زیادہ مؤثر وسیلہ ہوں گے ایک اور بات جو نظر میں رہنی چاہیئے یہ ہے کہ کسی علاقائی ثقافتی یا فنکارانہ پیشکش کو اپنی جمالیاتی یا جذباتی اپیل کی بنا پر قبولِ عام کی سند حاصل ہوتی ہے تو اس کی رو سے ساری قوم تک پھیل سکتی ہے ہمارے ہاں کئی ایسے لوک گیتوں اور لوک فنوں کی مثالیں موجود ہیں، جو ملک کے سارے حصوں میں یکساں طور پر مقبول ہو چکے ہیں۔

(ج) علاقائی ثقافتوں کی گوناگوں صورتوں کے کسی کھرے ملاپ کو انتظامی ذرائع استعمال کر کے بالجبر کسی قومی صورت میں نہیں ڈھالا جا سکتا ایسا تو بس سانچوں کے حوالے سے اکٹھا ہونے اور ہم رنگ عناصر کے آہستہ آہستہ گھل کر ایک نیا روپ اختیار کرنے کے عمل ہی سے ہو سکتا ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہر اوررنگی کو نااتفاقی نہ سمجھا جائے اور دوری نتائج کے لئے بے صبری کے باعث گوناگوں عناصر کی آرائش کے فطری عمل پر قدغن نہ لگائی جائے۔ ہر صورت اگر ہمارے علاقائی فنون اور ثقافت کے تخلیقی جوہر کی ناقدری کر کے انہیں سے آپ ہونے کے لئے چھوڑ دیا گیا تو شاید جلد ہی ملاپ کرنے کے لئے ہمارے



پاس کچھ باقی نہ رہے۔ ان حالات میں ہمارے لئے بس ایک ہی راستہ کھلا ہوگا اور وہ یہ کہ ہم کسی غیر ملکی ذریعے سے قومی کلچر نام کی شے پوری کی پوری مستعار لے لیں۔ یہ عمل شاید تھوڑا تھوڑا شروع بھی ہو چکا ہے۔

کلچر اور روایات

قومی تشخص کے سوال کا تعلق فنون کی کلاسیکی روایت سے بھی ہے اس سے کچھ اور قسم کے مسائل جنم لیتے ہیں

(الف) چونکہ یہ کلاسیکی روایت، خاص طور پر رقص و موسیقی ایسے فنون میں مسلمانوں کے دور سے کہیں زیادہ پرانی ہے، اس لئے اس میں بہت سے اجزا ابھی تک مسلمانوں کی سماجی روایات سے غیر متعلق ہیں

(ب) چونکہ سندھی مسلم تہذیب صرف ان علاقوں تک محدود نہیں تھی جو اب پاکستان میں ہیں اس لئے اس میں کئی اجزاء ایسے ہیں جو سرحد پار علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور انہیں صرف اور صرف پاکستانی نہیں کہا جا سکتا۔

تو پھر فنون کی اس روایت کو کلیتاً اپنا لیا جائے یا اسے آج کی کسی پاکستانی ستھری کی خواہشات سے نزدیک تر سانچے کے مطابق ڈھال لیا جائے اس مسئلے پر بھی خاصا اختلاف رائے ہے ایک طبقے کا کہنا ہے کہ ایک کلی طور پر مختلف قومی اور نظریاتی تشخص قائم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایسے تمام اجزا کو نکال پھینکا جائے اور کسی خاص فنی روایت کے ضمن میں ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو پھر اس روایت کو ہی مکمل طور پر ترک کر دینا بہترین راہِ عمل ہے مخالفین کا کہنا ہے کہ ایسی روایت کی مذمت کر کے جیسے مسلمان معاشرے نے اپنے شاندار عروج کے دنوں میں پالا پوسا اور جو اس برصغیر کی ثقافتی تاریخ میں مسلمانوں کا نمایاں ترین حصہ ہے، ہم اصل میں اپنی تاریخ کی مذمت کرتے ہیں اس لئے ہمیں اس روایت پر معترض نہیں ہونا چاہئے جس پر ہمارے آباء اجداد جو ہمارے لئے باعثِ افتخار ہیں نہ صرف معترض نہیں تھے بلکہ انہوں نے اس کی کفالت و سرپرستی کی۔

تیسرا نقطۂ نظر جو ہمارے سامنے پیش کیا گیا وہ یہ تھا کہ آرٹ اور کلچر میں ہمیں اسلامی اور غیر اسلامی کے مابین تخصیص کرنی چاہئے اور جو کچھ بھی بنیادی اسلامی تعلیمات کے برخلاف ہو ہمیں صرف اسی کی کاٹ چھانٹ کرنی چاہئے۔

جہاں تک جغرافیائی حدود کا تعلق ہے، یہ صاف ظاہر ہے کہ ہمارے ثقافتی ورثے کے چند بالکل بنیادی اجزاء نے پاکستان کی موجودہ جغرافیائی حدود سے باہر جنم لیا اور پھلے پھولے۔ ان اجزاء میں اردو زبان و ادب اور ایرانی، وسط ایشیائی اور دوسرے بہت سے اثرات جو ہماری ثقافتی روایت میں سمو لئے گئے ہیں کی ایک وسیع دنیا شامل ہے۔

کلاسیکی روایت کو اپنی خالص صورت میں قائم رکھنے کے حق میں جو سب سے زیادہ مدلل دلیل دی گئی وہ یہ تھی کہ مذہب کے بعد فنون یعنی فنِ تعمیر موسیقی اور رقص کی یہی روایت ہمارے علاقائی تقاضوں کو باہم منسلک کرنے والی کڑی ہے۔ پاکستان کے سب علاقوں میں کلاسیکی فنون ایک ہی زبان بولتے ہیں اس لئے ہمیں اس روایت کو قومی استحکام کے لئے ایک عامل سمجھنا چاہئے اور ایسے اقدامات اٹھانا چاہئیں جن سے کلاسیکی فنون کی یہ زبان جو فی الحال چند گنے چنے لوگوں کے لئے مخصوص سا ہے، زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے قابلِ فہم ہو جائے۔

آخری مسئلہ اپنی ثقافتی اور فنی روایت کو ہم عصر تجربے کی روشنی میں پرکھنے کا ہے تاکہ ماضی سے رشتوں اور حال کے تقاضوں کے مابین کوئی ہم آہنگی پیدا ہو۔

مغربی معاشروں نے کوئی دو سو سال کی سائنسی، صنعتی اور تکنیکی ترقی کے بعد جس کے بیشتر مصارف ان معاشروں کے زیر تسلط قوموں کو اٹھانے پڑے، دنیا کو ایسی تکنیکوں، طریقوں، آلہ ہائے کار، مواد اور طریقہ ہائے پیداوار سے روشناس کرایا ہے جو پہلے موجود نہ تھے۔ اسی ترقی نے فکر و احساس کے نئے آداب پیدا کئے ہیں اور فنی اور ثقافتی اظہار کی نئی صورتیں سامنے آئی ہیں، جن کے زیر اثر سماجی و ثقافتی زندگی میں بہت سے روایتی عناصر کی یا تو بیخ کنی ہو گئی ہے یا ان کی صورت بدل گئی ہے پاکستان جیسے ترقی پذیر اور نو آزاد ممالک میں یہ عمل ابھی شروع ہوا ہے اور اس کے ساتھ ہی روایت اور جدیدیت کے مابین اتصال کی کشمکش شروع ہو گئی ہے۔

اس کشمکش میں تین قسم کے رجحانات نے جنم لیا ہے۔ پہلا رجحان تو یہ ہے کہ روایت کے نام پر اپنے ماضی کی اندھا دھند تقلید کی جائے دوسرا یہ کہ جدیدیت کے نام پر ہر معاملے میں مغرب کی اندھی نقالی کی جائے اور تیسرے کی صورت ان دونوں کے بے ذوق ملغوبے کی سی ہے جس میں دونوں دنیاؤں کے بہتر حصوں کا مرا لینے کی دھن کارفرما ہے۔

ہماری رائے میں یہ تینوں رویے غلط ہیں کیونکہ

(الف) روایت کے تسلسل کا مطلب یہ نہیں کہ اس کی اصل صورت بعینہٖ قائم رکھی جائے۔ مثال کے طور پر اب ہمارے تلوار اور تیر سے ایسے روایتی ہتھیاروں کی جگہ میدانِ جنگ نہیں، عجائب گھر ہیں تاہم ورثے کے ایک حصے کی حیثیت سے ہمیں ان کی حفاظت کرنی چاہئے اور انہیں محبت اور تعظیم دینی چاہئے۔

(ب) مغرب سے سائنس، ٹیکنالوجی، صنعت اور دانش کے میدانوں میں علم حاصل کرنے سے ہماری اپنی تاریخی شخصیت کی نفی تو کوئی ضروری نہیں۔

(ج) ہمارے روایتی کلچر کے وہ حصے جو کسی ماضی کے مخصوص حالات کے مطابق تھے اور جو اب کسی طور کارآمد نہیں، انہیں محض جذباتی ہو کر ہم مصنوعی طور پر قائم رکھ سکتے ہیں نہ رکھنا چاہئے بس محبت اور تعظیم کے جذبات ہی کو بہت جانیے۔

(د) فنون میں نئی تکنیکوں کے استعمال، اظہار کی نئی صورتوں میں تجربات نئے مواد کے استعمال فنی سوچوں کو مقبول بنانے کی مساعی کی حوصلہ شکنی محض اس لئے نہیں کرنی چاہئے کہ ان کا منبع مغرب ہے بشرطیکہ فنکار اپنے معاشرے کی ایک رکن کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم رکھے۔

(ہ) ایک زندہ اور جاندار کلچر وہ ہوتا ہے جو ایسے حالات پیدا کرے جن میں اپنے معاشرے کو جمالیات اور دانش کے میدانوں میں اعلیٰ ترین ہم عصر معیاروں کے مطابق مالا مال کرنے کے لئے قومی جوہر بہتر سے بہتر کردار ادا کر سکے ایسے ہی حالات پیدا کرنا مقصد ہونا چاہئے۔



بنائے محبّت — کہ خالی از خلل است

فیض احمد فیضؔ

[بین الاقوامی لینن امن کی تقریب کی تقریر]

(بہ مقام ماسکو — بزبان اُردو)

محترم اراکینِ مجلسِ صدارت، خواتین اور حضرات!

الفاظ کی تخلیق و ترتیب شاعر اور ادیب کا پیشہ ہے لیکن زندگی میں بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں جب یہ قدرتِ کلام جواب دے جاتی ہے۔ آج عجزِ بیاں کا ایسا ہی مرحلہ مجھے درپیش ہے۔ ایسے کوئی الفاظ میرے ذہن میں نہیں آرہے ہیں جن میں اپنی عزت افزائی کے لئے لینن پرائز کمیٹی، سوویت یونین کے مختلف اداروں، دوستوں اور آپ سب خواتین اور حضرات کا شکریہ خاطر خواہ طور سے ادا کرسکوں۔ لینن امن انعام کی عظمت تو اسی ایک بات سے واضح ہے کہ اس سے لینن کا محترم نام اور مقدس لفظ وابستہ ہے۔ لینن جو دورِ حاضر میں انسانی حریت کا سب سے بزرگ علمبردار ہے اور امن جو انسانی زندگی اور اُس زندگی کے حسن و خوبی کی شرطِ اوّل ہے۔ مجھے اپنی تحریر و عمل میں ایسا کوئی کام نظر نہیں آتا جو اس عظیم اعزاز کے شایانِ شان ہو۔ لیکن اس عزت بخشی کی ایک وجہ ضرور ذہن میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جس تمنّا اور آدرش کے ساتھ مجھے اور میرے ساتھیوں کو وابستگی رہی ہے یعنی امن اور آزادی کی تمنّا وہ بجائے خود اتنی عظیم ہے کہ اِس واسطے سے اُن کے حقیر اور ادنیٰ کارکن بھی عزت اور اکرام کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

یوں تو ذہنی طور سے مجنوں اور جرائم پیشہ لوگوں کے علاوہ سبھی مانتے ہیں کہ امن اور آزادی بہت حسین اور تابناک چیزیں ہیں اور یہ سبھی تصوّر کرسکتے ہیں کہ امن گندم کے کھیت ہیں اور سفیدے کے درخت، دلہن کا آنچل ہے اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ، شاعر کا قلم ہے اور مصوّر کا مُوئے قلم اور آزادی اُن سب صفات کی ضامن اور غلامی اُن سب خوبیوں کی قاتل ہے جو انسان اور حیوان میں تمیز کرتی ہے یعنی شعور اور ذہانت، انصاف اور صداقت، وقار اور شجاعت، نیکی اور رواداری۔ اِس لئے بظاہر امن اور آزادی کے حصول اور تکمیل کے متعلق ہوشمند انسانوں میں اختلاف کی گنجائش نہ ہونا چاہیئے لیکن بدقسمتی سے یوں نہیں ہے۔ اِس لئے نہیں ہے کہ انسانیت کی ابتدا سے اب تک ہر عہد اور ہر دور میں متضاد عوامل اور قوتیں برسرِعمل رہی ہیں۔ یہ قوتیں ہیں تخریب و تعمیر، ترقی اور زوال، روشنی اور تیرگی، انصاف دشمنی اور انصاف دوستی کی قوتیں۔ یہی صورت آج بھی ہے اور اسی نوعیت کی کش مکش آج بھی جاری ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ آج کل انسانی مسائل اور گذشتہ دور کی انسانی اُلجھنوں میں کئی نوعیتوں سے فرق بھی ہے۔ دورِ حاضر میں جنگ سے دو قبیلوں کا باہمی خون خرابہ مُراد نہیں ہے۔ نہ آج کل امن سے خون خرابے کا خاتمہ مُراد ہے۔ آج کل جنگ اور امن کے معنی ہیں ابنِ آدم کی بقا اور فنا۔ بقا اور فنا اِن دو الفاظ پر انسانی تاریخ کے خاتمے یا تسلسل کا دارومدار ہے۔ انہیں پر انسانوں کی سرزمین کی آبادی اور بربادی کا انحصار ہے۔ یہ پہلا فرق ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ اب سے پہلے انسانوں کو فطرت کے ذخائر پر اتنی دسترس اور پیداوار کے ذخائر پر اتنی قدرت نہ تھی کہ ہر گروہ اور برادری کی ضرورتیں پوری طرح سے تسکین پاسکتیں۔ اِس لئے آپس میں چھین جھپٹ اور لوٹ مار کا کچھ نہ کچھ جواز بھی موجود ہے۔ لیکن اب یہ صورت نہیں ہے۔ اب انسانی عقل، سائنس اور صنعت کی بدولت اِس منزل پر پہنچ چکی ہے کہ جس میں سب تن بخوبی پل سکتے ہیں اور سبھی جھولیاں بھر سکتی ہیں بشرطیکہ قدرت کے یہ بے بہا



ذخائر پیداوار کے یہ بے اندازہ خرمن بعض اجارہ داروں اور مخصوص طبقوں کی تسکینِ ہوس کے لئے نہیں بلکہ جملہ انسانوں کی بہبود کے لئے کام میں لائے جائیں اور عقل اور سائنس اور صنعت کی کُل ایجادیں اور صلاحیتیں تخریب کے بجائے تعمیری منصوبوں میں صرف ہوں لیکن یہ جبھی ممکن ہے کہ انسانی معاشرے میں ان مقاصد سے مطابقت پیدا ہو اور انسانی معاشرے کے ڈھانچے کی بنائیں ہوس، استحصال، اور اجارہ داری کے بجائے انصاف، برابری، آزادی اور اجتماعی خوش حالی پر اُٹھائی جائیں۔ اس سہ ذہنی اور خیالی بات نہیں، عملی کام ہے۔ اِس عمل میں امن کی جدوجہد اور آزادی کی جدوجہد کی حدیں آپس میں مل جاتی ہیں اِس لئے کہ امن کے دوست اور دشمن اور آزادی کے دوست اور دشمن ایک ہی قبیلے کے لوگ، ایک ہی نوع کی قوتیں ہیں۔ ایک طرف وہ سامراجی قوتیں ہیں جن کے مفاد، جن کے اجارے جبر اور حسد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتے اور جنہیں اِن اجاروں کے تحفظ کے لئے پوری انسانیت کی بھینٹ بھی قبول ہے۔ دوسری طرف وہ طاقتیں ہیں جنہیں ٹینکوں اور کمپنیوں کی نسبت انسانوں کی جان زیادہ عزیز ہے۔ جنہیں دوسروں پر حکم چلانے کے بجائے آپس میں ہاتھ بٹا لے اور ساتھ مل کر کام کرنے میں زیادہ لُطف آتا ہے۔ سیاست و اخلاق، ادب اور فن، روزمرہ زندگی، غرض کئی محاذوں پر کئی صورتوں میں تعمیر و تخریبِ انسان دوستی اور انسان دشمنی کی یہ چپقلش جاری ہے۔ آزادی پسند اور امن پسند لوگوں کے لئے اِن میں سے ہر محاذ اور ہر صورت پر توجہ دینا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر سامراجی اور غیر سامراجی قوتوں کی لازمی کشمکش کے علاوہ بدقسمتی سے بعض ایسے ممالک میں بھی شدید اختلافات موجود ہیں جنہیں حال ہی میں آزادی ملی ہے۔ ایسے اختلافات ہمارے مُلک پاکستان اور ہمارے سب سے قریبی ہمسایہ ہندوستان میں موجود ہیں۔ بعض عرب ہمسایہ ممالک میں موجود ہیں۔ اور بعض افریقی حکومتوں میں موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ اِن اختلافات سے وہی طاقتیں فائدہ اٹھا سکتی ہیں جو امنِ عالم اور اِنسانی برادری کی دوستی اور یگانگت کو پسند نہیں کرتیں۔ اِس لئے صلح پسند اور امن دوست صفوں میں اِن اختلافات کے منصفانہ حل پر غور و فکر اور اس حل میں مدد دینا بھی لازم ہے۔

اب سے کچھ دن پہلے جب سوویت سائنس دانوں کا تازہ کارنامہ ہر طرف دُنیا میں گونج رہا تھا تو مجھے بار بار یہ خیال آ رہا کہ آج کل جب ہم ستاروں کی دُنیا میں بیٹھ کر اپنی ہی دُنیا کا نظارہ کر سکتے ہیں تو چھوٹی چھوٹی کمینگیاں، خود غرضیاں، یہ زمین کے چند ٹکڑوں کو بانٹنے کی کوششیں اور انسانوں کی چند ٹولیوں پر اپنا سکہ چلانے کی خواہش کیسی بعید از خیال باتیں ہیں۔ اب جب کہ ساری کائنات کے راستے ہم پر کشادہ ہو گئے ہیں، ساری دُنیا کے خزینے انسانی بس میں آ سکتے ہیں تو کیا انسانوں میں ذی شعور، منصف مزاج اور دیانت دار لوگوں کی اتنی تعداد موجود نہیں جو سب کو منوا سکے کہ جنگی اڈے سمیٹ لو۔ یہ بم اور راکٹ توپیں، بندوقیں سمندر میں غرق کر دو اور ایک دوسرے پر قبضہ جمانے کے بجائے سب مل کر تسخیرِ کائنات کو چلو جہاں جگہ کی کوئی تنگی نہیں ہے جہاں کسی کو کسی سے اُلجھنے کی ضرورت نہیں ہے جہاں لامحدود فضائیں ہیں اور اَن گنت دُنیائیں۔ مجھے یقین ہے کہ سب رکاوٹوں اور مشکلوں کے باوجود ہم لوگ اپنی انسانی برادری سے یہ بات منوا کر رہیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمنوں سے آج تک کبھی ہار نہیں کھائی اب بھی فتح یاب ہو کر رہے گی اور آخر کار جنگ و نفرت اور ظلم و کدورت کے بجائے ہماری باہمی زندگی کی بنا وہی ٹھہرے گی جس کی تلقین اب سے بہت پہلے فارسی شاعر حافظ نے کی تھی ؎

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی !
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں
حدیثِ یار کے عنواں نکھرنے لگتے ہیں
تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں
ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے
جو اب بھی تیری گلی سے گزرنے لگتے ہیں
صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکرِ وطن
تو چشمِ صبح میں آنسو اُبھرنے لگتے ہیں
وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں
درِ قفس پہ اندھیرے کی مُہر لگتی ہے
تو فیضؔ دل میں ستارے اُترنے لگتے ہیں







WITH COMPLIMENTS
FROM
INTERSEAS TALLY SERVICES
Tally Contractors, Clearing &
Forwarding Agents & specialized
in Export of Cow Dung
(Organic Fertilizer)
Please Contact for any enquiry
Room No 20, 1st Floor,
Ebrahim Bldg , (Rear)
West Wharf Road,
Karachi
Phone 20 21 08



فیض احمد فیض

شعریت، اظہار اور ترجمانی

[یہ مضمون ادبی دنیا لاہور کے ۱۹۲۹ء کے سالنامے میں شائع کرتے ہوئے موقر جریدے کے مدیر اور اردو کے ممتاز اور بزرگ ادیب مولانا صلاح الدین احمد نے لکھا تھا: "پروفیسر فیض احمد نے ایک مختصر لیکن پُرمغز مضمون لکھا ہے۔ "شعر میں اظہار اور ترجمانی۔ غالباً مولانا حالی کا شعر ہے ؂

اے شعر دلفریب نہ ہو گر تو غم نہیں   پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو

اہل ذوق کے ہاں اشعار کی قدر و قیمت جانچنے کا جو پیمانہ مقرر ہے یہ شعر اُس کی مختصر تفسیر ہے مگر فیض صاحب نے اپنے قیمتی مضمون میں تفصیل سے بتایا ہے کہ شاعری میں ترجمانی کا کیا درجہ ہے، اظہار اور ترجمانی میں کیا فرق ہے؟ اور کسی شعر کی قدر و قیمت معلوم کرنے کا صحیح معیار کیا ہے، مضمون نہایت خیال انگیز ہے اور ہمارے تنقیدی لٹریچر میں ایک بیش قیمت اضافہ۔"]

اِس مضمون میں ہمیں اِس معاملے پر غور کرنا ہے کہ شعر کی ادبی قیمت کامیاب اظہار پر منحصر ہے یا کامیاب ترجمانی پر۔ پہلے ہر دو اشعار کی تشریح سن لیجئے اگر شاعر پڑھنے سننے والوں کا تصور کئے بغیر محض اپنی تسکین کے لئے کسی جذبے کو ادا کرنے کی کوشش کرے تو اِس عمل کو اظہار کہیں گے۔ اگر شاعر یہی جذبہ نہ صرف ادا کرے بلکہ اسے دوسروں تک پہنچائے تو اُس دوسروں تک پہنچانے کے عمل کو ہم ترجمانی پکاریں گے۔ اِس سلسلے میں دو ضروری سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ شعر لکھنے سے شاعر کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ اظہار یا ترجمانی؟ دوسرا یہ کہ اِن دونوں میں سے شعر کو جانچنے کا قطعی معیار کون سا ہے؟ اِس مسئلے کو لیجئے کہ شعر لکھتے وقت شاعر کو اپنی تسکین مدِنظر ہوتی ہے یا دوسروں کی؟ وہ شعر پڑھنے والے کا تصور سامنے نہیں رکھتا۔ وہ کسی موہوم جذبے یا گمنام اُلجھن کے زیرِ اثر شعر لکھنے بیٹھتا ہے اور اُس کا فوری مقصد یہی ہوتا ہے کہ یہ جذبہ ایک حسین اور واضح صورت میں اس کے سامنے آ جائے اور اُس مقصد کا پورا ہو جانا اُس کی تسکین کے لئے کافی ہے۔ اگر وہ دوسروں سے داد کا طالب ہو تو بھی اُسے اپنی ہی تسکین مطلوب ہوتی ہے۔ اگر دوسرے بھی اُس کے جذبات کو سمجھیں یا اُن سے متاثر ہوں تو وہ اُسے اظہار ہی کی کامیابی سمجھتا ہے۔ اِس کے ثبوت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر کو کسی غیر آباد جزیرے میں تنہا چھوڑ دیا جائے جہاں پڑھنے سننے والے کا وجود نہ ہو تو وہ شاعری کی تحریک سے پھر بھی باز نہ آئے گا۔

شاید اس پر یہ اعتراض کریں کہ شاعری کی بعض اصناف ایسی بھی ہیں جن میں روئے سخن ہوتا ہی کسی سننے والے کی جانب ہے اور بعض نظمیں لکھی ہی اس لئے جاتی ہیں کہ اوروں کو سنائی جائیں مثلاً قصیدے، قصے کہانیاں، اخلاقی پیغامات وغیرہ۔ یہ بھی کلی طور پر صحیح نہیں۔ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ شاعر کسی شخصیت، کسی کہانی یا کسی اخلاقی نظریئے سے اسا متاثر ہو کہ محض اپنے تاثر کا اظہار کرنے کے لئے قصیدہ یا کہانی لکھ دے اور لکھتے وقت کسی سننے والے کا تصور بھی نہ کرے۔

شاید کوئی صاحب یہ اعتراض کریں کہ اگر شاعر کو ہمیشہ اظہار ہی سے مطلب ہوتا ہے اور ترجمانی محض اتفاقی امر ہے جس کا شاعری سے براہِ راست کوئی تعلق ہے ہی نہیں تو اظہار اور ترجمانی کی بحث کو یہیں ختم ہو جانا چاہیے۔ اگر ترجمانی شاعری کا مقصد کبھی ہوتا ہی نہیں تو سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ ترجمانی اُس کا مقصد ہونا چاہیے یا نہیں۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ اظہار کا عمل بذاتِ خود ایک ترجمانی ہے۔ جب شاعر کسی پوشیدہ تجربے کو ظاہری صورت میں پیش کرتا ہے تو ارادی یا غیر ارادی طور پر اُس کی ترجمانی بھی کر رہا ہوتا ہے۔ خواہ یہ ترجمانی اُس کی اپنی ذات ہی تک محدود ہے اور دوسرے لوگ اُس میں شریک نہ ہو سکیں۔ اب ہم اِس سوال پر بحث کر سکتے ہیں کہ اِس کی ترجمانی کو وسیع ہونا چاہیئے یا نہیں۔ فرض کیجئے کہ کوئی شخص کاغذ پر الٹی سیدھی لکیریں ڈال کر کہے کہ یہ ہے روضۂ تاج محل۔ آپ اس کاغذ کو اُلٹ پلٹ کر دیکھیں اور فرمائیں کہ ہمیں تو یہ اقلیدس کی چند بے ہودہ شکل کی پیروڈی معلوم ہوتی ہے۔ روضۂ تاج محل کی تو اِس میں کوئی بات نہیں لیکن وہ شخص اِس بات پر مُصر ہے کہ میرے ذہن میں روضۂ تاج محل کا تصور یہی ہے میں نے اپنے تصور کا اظہار کر دیا اور میں اِسے کامیاب سمجھتا ہوں۔ اب یہ آپ کے ذہن میں آئے یا نہ آئے میری بلا سے۔

اِن حالات میں آپ دونوں میں سے کس کی بات تسلیم کی جائے اور کس کا معیار صحیح مانا جائے؟ اِسی طرح اگر شاعر اپنی نظم میں کسی تجربے کا بزعم خود بخوبی اظہار کر دے، لیکن ہمارے پلے خاک نہ پڑے تو ہم شاعر کو الزام دیں یا اپنے آپ کو؟ ظاہر ہے کہ شاعر شعر کو اپنے معیار سے جانچے گا۔ اور آپ اپنے ہی معیار سے۔ اب یہ فیصلہ کون کرے کہ اِن دونوں معیاروں میں سے آخری اور قطعی کون سا ہے؟ نقاد؟ لیکن نقاد بھی تو آخر آپ ہی میں سے ہے۔ اور وہ جو کچھ کہے گا پڑھنے والے ہی کے نقطۂ نظر سے کہے گا۔

آپ کو یا آپ کے نقاد کو کیا حق پہنچتا ہے کہ شاعر کو اپنے احکام کی تعمیل پر مجبور



کرے شاعر کی تسکین ہو یا نہ ہو آپ کا مطلب نکل جائے؟ اس کا ہم یہ جواب دیں گے کہ اگر شاعر ہمیں شعر سناتا ہے تو اُسے ہم اپنے ہی معیار سے جانچیں گے۔ اگر اُسے یہ معیار پسند نہیں تو اپنے شعر اپنے پاس رکھے اور بڑی خوشی سے پُڑیاں باندھ کر اُن میں اچھے کی چُودن بیچا کرے۔ ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ ہمارا معز جانے گا تو ہم اُس سے معاوضہ بھی طلب کریں گے اور وہ یہی ہے کہ شعر کے تصور اور تخلیق میں جو راحت اُس نے محسوس کی ہے اُس میں ہمیں بھی شریک کرے۔ اُس نے جو کچھ دیکھا ہے ہمیں دکھائے اور جو کچھ سُنا ہے ہمیں سنائے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ تنقید کے اُصول ہمیشہ پڑھنے والے وضع کرتے ہیں اور پڑھنے والوں کے نزدیک شعر کی پہلی خوبی یہ ہے کہ شعر کا مضمون اُن تک زیادہ سے زیادہ موثر طریقے سے پہنچے۔ پہلی خوبی اس لئے کہ جب تک ہم شعر کو سمجھیں گے نہیں شعر کی باقی خوبیاں ہمیں نظر ہی نہیں آئیں گی۔ شاعر کے تجربے میں کتنی وسعت اور کتنی گہرائی کیوں نہ ہو اگر ہم واجبی کوشش کے باوجود اُس تجربے کو ذہن میں نہ لا سکے تو شعر کو لازماً ناکامیاب ٹھہرائیں گے۔ ہم یہی کہیں گے کہ اوّل تو اس مضمون میں وسعت نہیں ہے اور اگر ہے تو فی البطن شاعر ہے۔ فی البطن شعر نہیں غالباً دنیا کا کوئی شعر بالکل مُہمل اور بے معنی نہیں ہوتا کیونکہ شعر لکھتے وقت شاعر کے ذہن میں کوئی نہ کوئی خیال تو ہوتا ہی ہے لیکن ہم ہر اُس شعر کو مہمل کہنے میں حق بجانب ہیں جس میں یہ خیال ہم تک نہ پہنچے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہر وہ شعر جو فوراً ذہن میں آجائے اچھا ہے اور ہر وہ شعر جو ذہن میں نہ آئے برا ہے۔ اگر شعر فوراً ذہن میں آجائے تو ایک خوبی ضرور ہے لیکن بہت ممکن ہے کہ شعر میں اور بہت سی بُرائیاں ہوں جو کہ اس خوبی کو رد کر دیں یا شعر کا مضمون اتنا پامال ہو کہ اُس پر توجہ دینے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اسی طرح اگر شعر فوراً ذہن میں نہ آئے تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ شاعر نے شعر میں اتنے تصورات یکجا کر دئے ہیں کہ اُن کا ایک دم ذہن میں آجانا مشکل ہے۔ اس صورت میں ہم شعر پر جتنا زیادہ غور کریں گے اُسی قدر اس سے لطف اندوز ہوں گے اور ہمیں اس میں ہر بار کوئی نئی خوبصورتی نظر آئے گی۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلا کہ شعر کی کامیابی اظہار پر نہیں ترجمانی پر منحصر ہے۔ ہم کسی اظہار کو اُس وقت تک کامیاب نہیں کہہ سکتے جب تک وہ دوسروں کے لئے ترجمانی کا حق ادا نہ کرے۔

یہاں ایک اور دقت پیش آتی ہے۔ شاعر کا کلام باقی رہتا ہے لیکن اُس کے پڑھنے والے بدلتے رہتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ شاعر کا کلام اُس کے عہد کے لوگ نہ سمجھیں لیکن بعد میں آنے والی نسلیں اُسی کے کلام کو شاعری کا معراج قرار دیں یا کوئی شاعر اپنے عہد میں آسان لیکن آئندہ زمانے میں ناقابلِ فہم ہو جائے۔ غالب ہی کو لیجئے۔ غالب کو ہم بہت بڑا شاعر مانتے ہیں لیکن سُنا ہے کہ غالب کے اپنے زمانے میں اُس کا کوئی چرچا نہ تھا اور لوگ اُسے مہمل گو کہتے تھے۔ اگر شاعر کا مقصد ترجمانی یا اپنے مضمون کو دوسروں تک پہنچانا ہے تو وہ لوگ بھی سچے تھے اور ہم بھی سچے ہیں اور اس طرح ترجمانی کوئی قطعی معیار تو نہ رہا۔ اس کا جواب کئی طریقوں سے دیا جا سکتا ہے۔ اوّل تو یہ بات ہی غلط کہ غالب کے زمانے میں اُس کے قدردان نہیں تھے۔ غالب کو سراہنے والوں کی اُس زمانے میں بھی کوئی کمی نہ تھی اور غالب کو کوسنے والے آج بھی موجود ہیں۔ غالب سے لوگوں کو اختلاف اُس کے مضامین کی وجہ سے نہیں اُس کے نظریۂ شاعری کی وجہ سے تھا۔ آخر ناسخ کی بھی تو قدر ہوئی اور استاد ذوق کا کلام بھی تو زیادہ سلیس نہیں۔ معاملہ اصل میں یہ تھا کہ لوگ لفظی صنعتوں کو کمالِ شاعری سمجھتے تھے لیکن غالب اس راستے سے ہٹ کر خاص جذبات کی مصوّری کرنا چاہتے تھے۔ بعض اشخاص کو یہ چیز عجوبہ سی معلوم ہوئی اور وہ اس کی فنی اہمیت کا اندازہ نہ کر سکے۔ دوسری بات یہ کہ آج کل بھی غالب کی عظمت اُس کے سلیس اشعار کی وجہ سے قائم ہے نہ کہ مشکل اشعار کی وجہ سے۔ اب بھی غالب کے بعض اشعار ہمیں اتنے ہی مہمل معلوم ہوتے ہیں جتنی کہ ڈاکٹر ٹیگور کی تصویریں۔ پڑھنے والے بدلتے رہتے ہیں لیکن زندگی کے بنیادی تجربات اور جذبات نہیں بدلتے۔ اگر شاعر نے اُن کی کامیاب ترجمانی کی ہے تو اُن اشعار کی قیمت وقت اور مقام کی پابند نہیں اگر یہ سب دلیلیں رد کر دی جائیں تو بھی ہم یہی کہیں گے کہ اگر غالب کو اُس عہد میں داد نہیں ملی تو اس وجہ سے کہ لوگ اُس کے اشعار سمجھ نہیں سکے اور ہم اُسے داد دیتے ہیں تو اس وجہ سے کہ ہم اُس کے اشعار سمجھ سکتے ہیں۔ معیار پھر بھی ایک ہی رہا۔ اگرچہ اس کے دائرے اور وسعت میں تبدیلی واقع ہو گئی اس لئے ایک اچھے شعر یا اچھی نظم کی کامیابی یہی ہے کہ اُس کا مضمون پڑھنے والوں تک سہولت اور برجستگی سے پہنچے تاکہ وہ اُسے سمجھ سکیں، اُس سے متاثر ہو سکیں اور اپنے تاثر کو داد کی صورت میں شاعر تک پہنچا سکیں۔

فیض

بیمانِ جنوں ہاتھوں کو شرمائے گا کب تک
دل والو، گریباں کا پتا کیوں نہیں دیتے

بربادیٔ دل جبر نہیں فیض کسی کا
وہ دشمنِ جاں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے



ادبیاتِ پاکستان کا سرسری جائزہ



آزادی سے انتخابات تک

فیض احمد فیض

[۱۴- اگست ۱۹۷۲ء کو پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن کے کراچی لاہور اور راولپنڈی اسلام آباد اسٹیشنوں سے نشر ہونے والی گفتگو]

مجھ سے سوال کیا گیا کہ گذشتہ پچیس برسوں میں ہمارے ادیبوں اور شعراء نے اپنے عہد کی کس حد تک نمائندگی کی ہے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ اُن ادیبوں کو چھوڑ کر جو یا تو صرف اپنی ذات کے خول میں بند رہتے ہیں یا الفاظ کے گورکھ دھندے میں اسیر رہتے ہیں باقی سب ادب کسی نہ کسی حد تک اپنے گرد وپیش کی، اپنے ماحول کی اور اپنے عہد کی یقیناً عکاسی کرتے ہیں اور ہمارے ادیب اِس معاملے میں کسی اور عہد کے ادباء یا شعراء سے پیچھے نہیں ہیں۔ چنانچہ گذشتہ پچیس برس میں جو مختلف دور اِس مُلک پر گزرے ہیں اور جو مختلف تجربات ہم پر وارد ہوئے ہیں اُن کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ آزادی کے حصول کے وقت اور اُس کے فوراً بعد ایک طرف فسادات بپا تھے دوسری طرف ہجرت، انتقالِ آبادی اور خانہ بدوشی کا عالم تھا۔ چنانچہ اِن ابتدائی سالوں میں اُن ہی تجربات کی زیادہ نمائندگی کی گئی ہے۔ اِس تجربے کے دو پہلو تھے۔ ایک طرف تو اُمید تھی ایک نئے معاشرے کی تکمیل کی۔ اور دوسری طرف تھا DISILLUSIONMENT اُسے یہ کہیے کہ ہم جو چاہتے تھے کہ آزادی کے بعد کچھ حاصل ہوگا اور جس صورت میں حاصل ہوگا اور معاشرے کی تکمیل ہوگی وہ اُمیدیں پوری نہیں ہوئیں۔ چنانچہ تھوڑی بہت مایوسی بھی تھی اور اُمید بھی۔

اِس کے بعد دوسرا دَور شروع ہوا جس میں احتساب، زبان بندی، مارشل لاء اور سیفٹی ایکٹ تھے۔ اِس میں بھی ہمارے شعراء اور ادیبوں نے عوام کے جذبات کی ترجمانی کی۔ احتجاجی ادب اِسی زمانے میں پیدا ہوا۔ سیاسی ادب بھی اُسی دور کی پیداوار ہے۔

اِس کے بعد تیسرا واقعہ گذرا۔ ہندوستان اور پاکستان کی جنگ یعنی سن پینسٹھ کی جنگ۔ اِس میں جنگی ترانے اور قومی نظمیں لکھی گئیں یہ بھی ادب تھا جو پیدا ہوا۔ پھر احتجاجی تحریکیں پیدا ہوئیں اُس نظام کے خلاف جو اُس وقت مُلک میں رائج تھا اور صدر ایوب کی حکومت کے خلاف مُلک کے مختلف علاقوں میں مختلف سیاسی تنظیمیں اور مختلف سیاسی تحریکیں وجود میں آئیں۔

اِس کے بعد انتخابات کا زمانہ آیا اور جب لوگوں کو ایک حد تک دوبارہ آزادیٔ تحریر و تقریر حاصل ہوئی تو اُس زمانے میں خالص سیاسی ادب پیدا ہوا اور دو تین صورتوں میں۔ ایک تو یہ کہ ہماری صحافتی شاعری پیدا ہوئی جو کہ آج سے بہت پہلے خلافت کے زمانے میں یا کانگرس کے زمانے میں یا مسلم لیگ کے عروج کے زمانے میں ہمارے معاشرے کا ایک جز تھی مگر بعد میں اُسے متروک قرار دیا گیا۔ ایک تو یہ خالص صحافتی شاعری پیدا ہوئی یعنی سیاسی شاعری دوسرے وہ شاعری پیدا ہوئی جو کہ جلسے جلوس اور اِسی قسم کی تقریبوں میں کام آتی تھی۔ دوسری طرف غزل کی علامتیں غزل کے رموز، غزل کے کنائے وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے۔

موجودہ دَور سے پہلے ایک بہت ہی شدید اور المناک حادثہ جو اِس دیس پر گذرا اُس کی ترجمانی ہمارے ادیبوں نے کی۔ چنانچہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہماری تنقید میں ہمارے افسانے میں ہمارے ناول میں اور ہماری نظموں میں اُن سب کا عکس موجود ہے جو ہمارے دل پر گذر رہی ہے اور ہمارے عوام کے دل پر گذرتی رہی ہے۔

حقیقتیں اور خواب نقش کی شاعری میں جس طور سے آئے ہیں ایک مثال دے کر پوچھے پر نقش سے تابا)

پہلے دو برس میں نے صبحِ آزادی کے نام سے جو نظم لکھی تھی اس میں دو کیفیات کی ترجمانی مقصود تھی یعنی ایک طرف امید اور عزم اور دوسری طرف ... اشعار تھے اُن سے لے اقتباس۔

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر



چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شبِ سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رُکے گا سفینۂ غمِ دل

یہ تھا ایک پہلو اس نظم کا۔ اور دوسرا پہلو یہ ہے۔

ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

میں نے دوسرے دور کا ذکر کیا تھا جو احتساب اور جبر کا دور تھا۔ اُس کے بارے میں دو شعر سن لیجئے۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

اس کے بعد جب ہمارے ہاں پہلی بار قوم اس بات پر بیدار ہوئی کہ اُس کی سلامتی کو خطرہ ہے اور ہر چند کہ مجھے ترانے لکھنے پسند آتے ہیں لیکن اس سے متاثر ہو کر میں نے بھی اشعار لکھے ہیں

کس حرف پہ تو نے گوشۂ لب اے جانِ جہاں غماز کیا
اعلانِ جنوں دل والوں نے اب کے بہ ہزار انداز کیا!
سو پیکاں تھے پیوستِ گلو جب چھیڑی شوق کی لے ہم نے!
سو تیر ترازو تھے دل میں جب ہم نے رقص آغاز کیا!
بے حرص و ہوا، بے خوف و خطر اس ہاتھ پہ سر اُس کف پہ جگر
یوں کوئے صنم میں وقتِ سفر نظارۂ بامِ ناز کیا
جس خاک میں مل کر خاک ہوئے وہ سُرمۂ چشمِ خلق بنی
جس خار پہ ہم نے خوں چھڑکا، ہم رنگِ گُلِ طناز کیا
لو وصل کی ساعت آ پہنچی پھر حکمِ حضوری پر ہم نے
آنکھوں کے دریچے بند کئے اور سینے کا در باز کیا

اِس کے بعد تیسرا یا چوتھا دور آیا جس کا میں نے ذکر کیا یعنی انتخابات کے بعد کا زمانہ اور پھر گذشتہ سال جو المیہ ہم پر گزرا ہے اُس کے بارے میں چند ایک اشعار سنیے۔

پامال ہے خونِ خلق ہر اک در کے سامنے
محشر بجل ہے کوئے ستمگر کے سامنے
بیٹھا ہے فردِ خانہ خرابی لئے ہوئے
اِس گھر کے سامنے کوئی اُس گھر کے سامنے

اور اس کے بعد جو خاتمہ ہوا اس پر دو شعر ہوئے تھے





ابتدائیہ

ایک زمانہ ہوا غالب نے لکھا تھا کہ جو آنکھ قطرے میں دجلہ نہیں دیکھ سکتی دیدۂ بینا نہیں بچوں کا کھیل ہے۔ اگر غالب ہمارے ہمعصر ہوتے تو غالباً کوئی نہ کوئی ناقد ضرور پکار اٹھتا کہ غالب نے بچوں کے کھیل کی توہین کی ہے، یا یہ کہ غالب ادب میں پروپیگنڈا کے حامی معلوم ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ شاعر کی آنکھ کو قطرے میں دجلہ دیکھنے کی تلقین کرنا صریح پروپیگنڈا ہے۔ اس کی آنکھ کو تو محض حسن سے غرض ہے اور حسن اگر قطرے میں دکھائی دے جائے تو وہ قطرہ دجلہ کا ہو یا گلی کی بدرو کا، شاعر کو اس سے کیا سروکار، یہ دجلہ دیکھنا دکھانا حکیم، فلسفی یا سیاست داں کا کام ہوگا، شاعر کا کام نہیں ہے۔

اگر ان حضرات کا کہنا صحیح ہوتا تو آبروئے شیوۂ اہل ہنر یعنی اہل ہنر کا کام یقیناً بہت سہل ہو جاتا لیکن خوش قسمتی یا بدقسمتی سے فن سخن یا کوئی اور فن بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اس کے لئے تو غالب کا دیدۂ بینا بھی کافی نہیں، اس لئے کافی نہیں کہ شاعر یا ادیب کو قطرے میں دجلہ دیکھنا ہی نہیں دکھانا بھی ہوتا ہے۔ مزید برآں اگر غالب کے دجلہ سے زندگی اور موجودات کا نظام مراد لیا جائے تو ادیب خود بھی اسی دجلہ کا ایک قطرہ ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے ان گنت قطروں سے مل کر اس دریا کے رخ، اس کے بہاؤ، اس کی ہیئت اور اس کی منزل کے تعین کی ذمہ داری بھی ادیب کے سر آن پڑتی ہے۔

یوں کہیئے کہ شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے، اسے دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر، اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر۔

اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جدّ و جہد چاہتے ہیں۔

نظام زندگی کسی حوض کا ٹھہرا ہوا، تنگ بستہ، غیر متبدل پانی نہیں ہے، جسے تماشائی کی ایک غلط انداز نگاہ احاطہ کر سکے، دور دراز، اور مشکل و دشوار گزار پہاڑوں میں برف پگھلتی ہے، چشمے ابلتے ہیں، ندی نالے پتھروں کو چیر کر، چٹانوں کو کاٹ کر آپس میں ہمکنار ہوتے ہیں، اور پھر یہ پانی گھٹتا بڑھتا، دلدلوں، جنگلوں اور میدانوں میں سمٹتا اور پھیلتا جاتا ہے۔ جس دیدۂ بینا نے انسانی تاریخ میں یہ زندگی کے یہ تعین و مراحل نہیں دیکھے اس نے دجلہ کا کنارہ دیکھا ہے، پھر شاعر کی نگاہ ان گذشتہ اور حالیہ مقامات تک پہنچ بھی گئی لیکن ان کی منظر کشی میں لطق زباں نے یاوری نہ کی یا اگلی منزل تک پہنچنے کے لئے جسم و جاں جہد طلب پر راضی نہ ہوئے تو بھی شاعر اپنے فن سے پوری طرح سرخرو نہیں ہے۔

غالباً اس طویل و عریض استعارے کو زود تر الفاظ میں بیان کرنا غیر ضروری ہے مجھے کہنا صرف یہ تھا کہ حیات انسانی کی اجتماعی جدّ و جہد کا ادراک اور اس جدّ و جہد میں حسب توفیق شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے

فن اسی زندگی کا ایک جزو اور فنی جدّ و جہد اسی جدّ و جہد کا ایک پہلو ہے۔ یہ تقاضا ہمیشہ قائم رہتا ہے اسی لئے طالب فن کے مجاہدے کا کوئی نروان نہیں اس کا فن ایک دائمی کوشش ہے اور مستقل کاوش۔

اس کوشش میں کامرانی یا ناکامی تو اپنی توفیق و استطاعت پر ہے لیکن کوشش میں مصروف رہنا بہرطور ممکن بھی ہے اور لازم بھی

یہ چند صفحات بھی اسی نوع کی ایک کوشش ہیں ممکن ہے کہ فن کی عظیم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کے مظاہرے میں بھی نمائش یا تعلّی اور خود پسندی کا ایک پہلو نکلتا ہو لیکن کوشش کیسی بھی حقیر کیوں نہ ہو، زندگی یا فن سے فرار اور شرمساری پر فائق ہے۔

سنٹرل جیل حیدرآباد
۱۶ ستمبر ۱۹۵۲ء

فیض



مختار زمن

غالب

[ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان کی بیورو سروس کی جانب سے مختار زمن نے کراچی کے انگریزی روزنامے ڈان کے لئے فیض احمد فیض سے غالب کے موضوع پر انگریزی میں جو گفتگو کی تھی ذیل کا ترجمہ بھی مختار زمن ہی کی کاوش ہے۔]

س: فیض صاحب، مرزا غالب کا شمار صفِ اوّل کے شعرا میں ہوتا ہے۔ دیوانِ غالب جب بھی پڑھئے اُس میں تازگی محسوس ہوتی ہے۔ کیا آپ کو اس خیال سے اتفاق ہے؟ اور اگر ہے تو غالب کی عظمت اور اس کے کلام میں تازگی اور تنوع کا راز کیا ہے؟

فیض: تنوع اور تازگی عظیم شاعری کی خصوصیات ہیں۔ اگرچہ ہر بڑے شاعر کی عظمت کے اسباب یکساں نہیں ہوتے لیکن بعض خصوصیات یکساں ہوتی ہیں۔ غالب کی عظمت کا راز بھی حقائق کا ملہ سے ہم آہنگی میں مضمر ہے۔

س: آپ حقیقت کی کیا تعریف کرتے ہیں۔

فیض: میں حقیقت کو ادبی معنی میں استعمال کر رہا ہوں یعنی سماج کے کسی خاص دور میں انسانیت کا نچوڑ۔ اسے آپ اُس دور کی روح کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ سماجی احساس بھی کہہ سکتے اور حقیقت پسندی کے عنوان سے بھی پکار سکتے ہیں ایک ہی حال کو ادا کرنے کی یہ مختلف صورتیں ہیں۔ جیسا کہ ایک دانا نے کہا ہے کہ بڑا مصنف ایک خاص دور کے حقائق اور انسانی تجربات کا مرقع پیش کرتا ہے۔ اسی لئے اُن شعرا کے کلام میں جنہوں نے بھرپور انسانی تجربات کی روح کو تاریخ کے کسی بھی عہد میں اپنے قالو میں کرلیا آج بھی وہی تازگی پائی جاتی ہے جو اُن کے اپنے زمانے میں تھی۔ اس لئے کہ انسانی تجربات کا سلسلہ ہمیشہ جاری و ساری رہتا ہے اور بڑے قدیم شعرا کے تجربات ہمارے دور کے تجربات ہی کی ایک کڑی ہوتے ہیں۔ یہ تجربات کیا ہیں؟ ایسے ساتھیوں کی آس اور یاس، حصول اور مایوسی، درد اور خوشی جسے نہ صرف ہم سمجھ سکتے ہیں بلکہ واقعی یا تخیل میں ہم خود بھی اُن تجربات میں شریک و شامل ہوتے ہیں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے یہ بات غالب کے سلسلے میں ہمارے لئے تو خاص طور پر صحیح ہے۔ اُس کی شاعری نے جاگیردارانہ نظام کے سماجی اور سیاسی انحطاط کے آخری دور کا احاطہ کیا۔ سترھویں صدی عیسوی کے وسط سے انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک اُردو شاعری کے کلاسکی دور میں جو تجربات ہوئے اُس کی شاعری میں اُن کا نچوڑ موجود ہے۔ ولی سے لے کر اُس کے اپنے زمانے تک اُردو کے تمام بڑے شعرا کا جو موڈ تھا غالب نے اُسے مجتمع کر کے اُس پر ادوسان رکھ دی۔ اگر آپ اِس تمام "موڈ" کو ایک فقرے میں ادا کرنا چاہتے ہیں تو اسے جاگیردارانہ جمالیات کا نام دے سکتے ہیں۔

س: تو کیا آپ کے خیال میں اُس دور کے شعرا جن میں غالب بھی شامل ہے جاگیردارانہ نظام کے پرستار اور اس کے استحکام کے خواہاں تھے؟

فیض: میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ شعرا اُس تہذیب، اُن اقدار اور اُس پورے نظامِ زندگی کو دم توڑتے ہوئے دیکھ رہے تھے جس کے وہ عادی تھے۔ لیکن اُن کی نظر اُن بنیادی سیاسی اسباب پر نہ تھی جو اِس انحطاط کے ذمہ دار تھے اور نہ ہی وہ اُس صورت اور سماجی نظام کے ڈھانچے کو دیکھ سکے تھے جو اِس نظام کی جگہ لے رہا تھا جس کے وہ عادی تھے۔ اُن کے اِس موڈ میں تین اہم خصوصیات نظر آتی ہیں۔

(۱) جانی پہچانی چیزوں سے لگاؤ اور محبت جو اُن کی نظروں کے سامنے ختم ہو رہی تھیں اور سماجی اقدار کو بدل رہی تھیں۔ اِس صورتِ حال نے اُن کے دل میں سوز و گداز اور درد و ملال کا عنصر پیدا کر دیا۔

(۲) حال کے خلاف بے اطمینانی، بدگمانی اور عدمِ اعتماد جس کا مطلب تھا انتشار، افراتفری اور بعضوں کے لئے اقتصادی بدحالی۔ اِس سے جو فلسفیانہ عناصر پیدا ہوئے وہ یہ ہیں۔ ماورائیت دنیا کی، انسانی زندگی کی بے ثباتی کا خیال۔ جان و مال کو پرِکاہ اور دُنیاوی عزّ و جاہ کو بیکار محض سمجھنا۔

(۳) اور آخر میں امید و بیم۔ امید خصوصاً غالب کا حصہ ہے مگر عام طور



پران دیکھی چیزوں اور نامعلوم مستقبل کے متعلق خوف کا پایا جانا عام موڈ تھا۔ غالب اُس عہد میں آخر میں پیدا ہوا۔ اس نے پرانے تجربات کا نچوڑ پیش کیا مگر ساتھ ہی اُس نے ایک نئے ڈھنگ کا تعارف بھی کرایا اس لئے کہ قدامت کے رحم میں ایک نیا دور جنم لے رہا تھا۔ یہی وہ بات ہے جو غالب کو دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔

زمن : کیا آپ غالب کے طرزادا اور طریقۂ بیان پر بھی کوئی تبصرہ کریں گے ؟

فیض ۔ ہاں ضرور! میں نے اب تک جو کچھ کہا ہے وہ غالب کا جذباتی اور تجرباتی پہلو ہے۔ لیکن دوسرا پہلو اُس کی خاص طرزِادا ہے۔ یعنی اُس کی شاعری کی تشکیل اور قاعدہ ۔ شاعروں کو کئی وجوہ سے اشاریت اور پہلو دار طرزِ ادا اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اوّل تو یہ کہ اپنے تجربے کو بلا واسطہ اور صاف سیدھے طریقے سے بیان کرنا بعض مواقع پر سیاسی مصلحتوں کے خلاف ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ نئے نئے تجربوں کے مقابلے میں جانے پہچانے طریقوں کے ذریعہ اظہار خیال کرنا زیادہ آسان ہے ۔ تیسرے یہ کہ شاعر کے لئے حقیقت داخلی اور جذباتی شے ہوتی ہے لیکن غالب کے یہاں اِس داخلی اور ذاتی طریقِ کار میں سماجی احساس کا عنصر بھی ملتا ہے ۔ اِسی لئے اُس کا کلام تنگ نظر اور اپنی ذات تک محدود ہونے کے بجائے کُل سماج کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ غالب کی طرزِ ادا کا ذکر کرتے وقت یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس نے منجملہ اور باتوں کے اُردو شاعری کو ابتذال اور خود فریبی کے پنجے سے آزاد کرایا۔ اُس نے استعارے کا نیا استعمال یعنی (TRANSFERED EPITHET) شروع کیا۔ (جیسے جنبشِ نگاہ و فرودِ گوش) ـــ اچھی شاعری کی وہ خصوصیت یعنی تشبیہہ و استعارے سے مضمون آفرینی غالب کے یہاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ اِن سب کے علاوہ غالب نے شاعروں کی سستی زبان سے شاعری کو نجات دلائی۔ اس لئے کہ اُس نے وہ لفظی شعبدہ بازیاں ترک کر دیں جو مشاعروں کے اُن سامعین پر جن کا ردِ عمل معلوم و معروف ہے اثراندازی کے لئے استعمال کی جاتی ہیں اِس طور پر اُس نے "بلند سنجیدگی" کی شاعری کا راستہ ہموار کیا۔

ہم شاعروں میں غالب وہ پہلا شخص ہے جس نے شاعر کا مرتبہ بحیثیت ایک "غیر سرکاری سماجی قانون ساز" کے پہچان لیا۔ حالانکہ شاعر کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ شاعر محض ایک درباری، مصاحب یا عام تماشہ گر کی قسم کا ذرا بہتر نمونہ ہے۔

زمن غالب کے قصائد کے بارے میں آپ کیا کہیں گے ؟

فیض اُس کے قصیدے محض روزی پیدا کرنے کے ذریعے تھے۔ اُس کا تعلق اُس کی عظیم شاعری سے نہیں ہے۔

زمن فیض صاحب کیا آپ اکثر غالب کا کلام پڑھتے ہیں؟ اور کیا آپ کی اپنی شاعری پر اس کا کوئی اثر پڑا ہے۔

فیض : دیوان غالب کا ایک نسخہ ہمیشہ میرے سرہانے رہتا ہے۔ میں اکثر بلکہ بعض حالات میں روزانہ اُس کا مطالعہ کرتا ہوں۔ یہ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ غالب کا مقتی ہوگیا۔ میں اپنی شاعری میں اُسے شعوری اور غیر شعوری طور پر استعمال کرتا ہوں۔

زمن فیض صاحب سیاسی طور پر برصغیر ہند و پاک تقسیم ہوگیا لیکن ہمارے ثقافتی ورثے اور ہند کی روایت کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں ؟ اب ہم اِس سلسلے میں کس منزل پر کھڑے ہیں ؟

فیض ۔ دراصل سوال یہ ہے کہ ہمارے ثقافتی اور سیاسی مسائل اور بنیادی گتھیوں کا حل کیسے تلاش کیا جائے ، لیکن ابھی تک کوئی بھی اِس کام کے لئے تیار نہیں ہے۔ اِس کا اطلاق غالب ہی پر نہیں ہوتا۔ یہ تو ہمارے کلچر کی پوری تاریخ کا معاملہ ہے۔ ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ ہمارے کلچر اور ثقافت کی تاریخ کہاں سے شروع ہوتی ہے ؟ لیکن آپ جہاں سے بھی شروع کریں۔ ہند کی تاریخ کا ایک حصہ ہماری تاریخ کا بھی حصہ ہے اور ہماری تاریخ کا ایک حصہ ہند کی تاریخ سے منطبق ہے یہی بات ایران اور عرب کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے۔

ثقافتی ورثے تاریخ اور جغرافیہ سے منسلک ہوتے ہیں اور وہی کلچر کی حدود ہیں۔ جغرافیائی حدود اٹل ہوتی ہیں لیکن تاریخ کی حدود کے ڈانڈے ضروری نہیں کہ جغرافیہ سے ملیں۔ ہمارے جغرافیہ کی عمر بیس سال ہے مگر ہماری تاریخ پانچ ہزار سال پُرانی ہے۔

میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنی ثقافتی اور تاریخی ہستیوں سے متعلق اہم تاریخوں کا ایک کیلنڈر مرتب کرنا چاہیئے۔ یہ ایک وسیع میدان ہے جو محمد بن قاسم سے قائداعظم تک ، خسرو سے اقبال تک جس میں ابوالفضل، فیضی، میر اور غالب بھی شامل ہیں اور مان سنگھ سے روشن آرا بیگم تک پھیلا ہوا ہے۔ ہمیں اپنے بڑے بڑے فن کاروں، مصوّروں، معماروں اور فلسفیوں کو یاد رکھنا چاہیئے جنہوں نے ہمارے کلچر کو مالا مال کیا۔

میں کچھ فیضِ سخن کو نذر کر دوں
خدا مجھ کو لبِ اظہار دیدے

اقبال عارفی



اُردو کے صوفیانہ اشعار

فیض احمد فیض

تصوف اُردو شعراء کے اپنے ذہن یا تجربے کی پیداوار نہیں۔ بلکہ حسبِ معمول فارسی شعراء کی پیروی کا نتیجہ ہے۔ فارسی میں صوفیانہ شاعری گیارہویں صدی (عیسوی) میں شروع ہوئی، اور چودھویں اور پندرھویں صدی میں پورے اوج پر پہنچ گئی۔ ان دنوں تصوف ایک زندہ چیز تھی۔ شعراء نے اُسے محض ایک عقیدے کے طور پر قبول نہیں کیا تھا بلکہ ایک حقیقت ایک تجربے کے طور پر محسوس کرتے تھے۔

تصوف کے چار مختلف پہلو ہیں۔ اوّل حقیقت یا خدا کے متعلق ایک روحانی اور جذباتی نقطۂ نظر۔ دوم وہ روحانی اور وجدانی کیفیت جو اُس حقیقت سے دوچار ہونے اُسے سمجھنے یا اُس سے تعلق پیدا ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ سوم وہ فن یا طریقۂ کار جس سے اُن تجربات کی پیدائش اور افزائش میں مدد ملتی ہے۔ چہارم وہ مسائل یا اُصول یا نظامِ فکر جو اُن تجربات سے ہمیں حاصل ہوتے ہیں

ان مسائل میں زیادہ اہم یہ ہیں۔ وحدتِ وجود یعنی خدا کا ہر جگہ اور ہر چیز میں موجود ہونا۔ انسان اور خدا کا تعلق۔ دُنیا اور حیاتِ انسانی کی بے ثباتی۔ فقر اور دُنیا سے کنارہ کشی کے فوائد وغیرہ وغیرہ۔

بدقسمتی سے ہمارے اُردو شعراء میں ایک بھی ایسا نہیں جسے صحیح طور پر صوفی شاعر کہا جا سکے۔ تصوف کے مسائل سبھی بیان کرتے ہیں لیکن تصوف کی کیفیت کسی کو حاصل نہیں ہے۔ ایران کے صوفی شعراء درباروں سے منہ موڑ کے الگ ہو بیٹھے تھے تاکہ اپنی اور دنیا کی حقیقت پر غور کر سکیں۔ لیکن ہمارے شعراء یا درباروں سے وابستہ تھے یا درباری طریقے سے۔ یہ دربار ایسے نہیں تھے کہ اُن میں گہرے جذبات وخیالات پنپ سکیں۔ نیا زمانہ آیا تو مغربی تعلیم کی وجہ سے عقل و شعور کو ہر چیز کی کسوٹی قرار دیا گیا اور کشمکشِ حیات اتنی تلخ ہو گئی کہ فقر و قناعت کی زندگی بسر کرنے کا امکان ہی جاتا رہا۔ چند مسائل اور عقیدے ہیں۔ جنہیں بعض شعراء نے خوبی سے نظم کر دیا ہے۔ کبھی کبھی ایک آدھ شعر میں کیفیت بھی آ جاتی ہے لیکن وہ فارسی کی سی بات نہیں کہ

ما در پیالہ عکسِ رخِ یار دیدہ ایم
اے بے خبر ز لذتِ شُربِ مُدام ما

اب اُردو کے اشعار سُنیئے۔ صوفیا کہتے ہیں کہ موت یا عدم کا ہونا لازمی ہے اس لئے ہر قدم ایک نئے وجود کا پیش خیمہ ہے۔ میر فرماتے ہیں۔

موت اک زندگی کا وقفہ ہے — یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

خواجہ میر درد انسانی زندگی کی بے کسی اور بے ثباتی پر لکھتے ہیں۔

کس لئے آئے تھے اور کیا کر چلے — تہمتیں چند اپنے ذمّے دھر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

خدا سے ملنے کے اشتیاق اور نہ مل سکنے کی حسرت کو نہایت پُر درد انداز میں ادا کیا ہے۔

خوابِ عدم سے جاگے تھے ہم تیرے واسطے — آخر کو جاگ جاگ کے ناچار سو گئے

مذاہب کے اختلاف محض اس لئے ہیں کہ خدا کی حقیقت کا کسی کو مکمل طور پر پتہ نہیں۔ اگر حقیقت بے نقاب ہو جائے تو اس کے متعلق جھگڑے بھی ختم ہو جائیں۔ ایک مُغل شاہزادے کا شعر ہے۔

حرم و دیر کے جھگڑے ترے چھپنے سے پڑے — تُو اگر پردہ اُٹھا دے تو تُو ہی تُو ہو جائے

جسے خدا کا جلوہ نظر آئے وہ اپنی ہستی سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اُسے اپنی دُنیا، زندگی اور دُنیاوی شخصیت اجنبی معلوم ہونے لگتی ہے۔ قربان علی سالک کہتے ہیں

تم آ گئے تو ہوش کہاں میزباں ہو کون — آج آپ اپنے گھر میں کچھ مہماں سے ہم

خدا کی موجودگی کا احساس عموماً اُس وقت ہوتا ہے جب انسان دُنیا سے بے نیاز اس کے دھیان میں لگا ہو۔ مومن کا مشہور ترین شعر ہے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اصغر گونڈوی مرحوم ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ اور اُن کے بعض اشعار صوفیانہ کیفیت سے خالی نہیں۔

بیانِ عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظِ ناداں — ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھ دی

چند صوفیانہ اشعار کا مزید انتخاب۔

جگر

یہاں تک جذب کر لوں کاش تیرے حُسنِ کامل کو — تجھی کو سب پکار اُٹھیں گزر جاؤں جدھر ہو کر

حسرت

ہم کیا کریں تری نہ اگر آرزو کریں — دُنیا میں اور بھی کوئی تیرے سوا ہے کیا
دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد — ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

فانی

وہ ہے مختار سزا دے کہ جزا دے فانی — دو گھڑی ہوش میں آنے کے گنہگار ہیں ہم

حفیظ

ناآشنا ہیں رتبۂ دیوانگی سے لوگ — نادان جانتے نہیں کیا ہو گیا ہوں میں

حقیقت سے ملنے کی آرزو، خدا کے وصال کا اشتیاق۔ یہ مضامین جس سوز وگداز کے ساتھ اقبال مرحوم نے ادا کئے ہیں ان کی مثال دنیا میں بھی نہیں ملتی۔ علامہ اقبال کو صحیح معنوں میں صوفی شاعر نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن حقیقتِ ابدی کے متعلق اُن کا تڑپ خلوص اور والہانہ پن بہت کم صوفی شعراء کو نصیب ہوا ہے۔ شعر سُنیئے۔

خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرتِ پرویز — خدا کی دین ہے سرمایۂ غمِ فرہاد
نہ چھین لذتِ آہِ سحر گہی مجھ سے — نہ کر نگہ سے تغافل کو التفات آمیز
نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے — خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے



فیض احمد فیض

میرا پیغام محبت ہے

ہم لوگ جو ادیب، قلمکار یا فنکار کہلاتے ہیں۔ ہم لوگ جن کے پاس نہ طبل و علم ہے۔ نہ ملک و مال جو صرف محبت کرنا اور اپنا دل جلانا جانتے ہیں اور ہم جنہیں یہ دعویٰ ہے کہ

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔

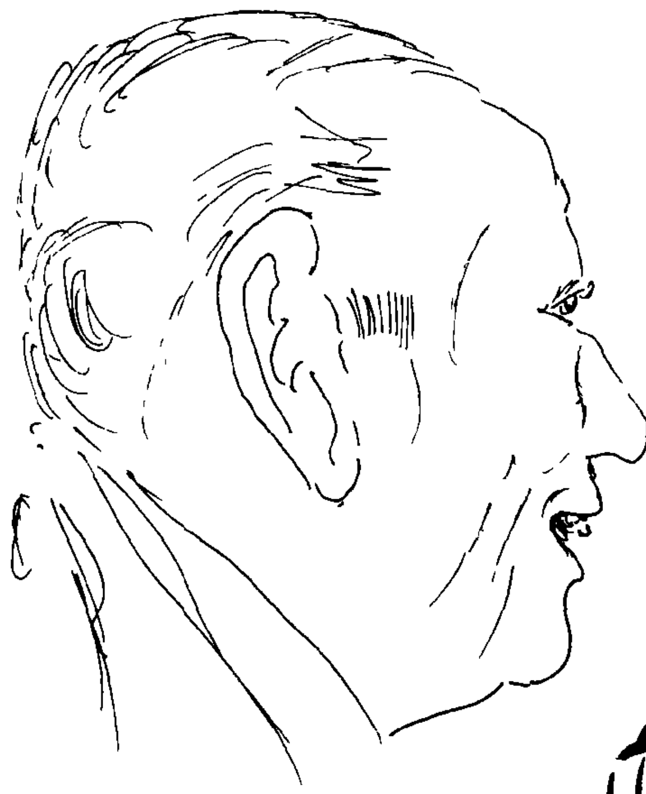
ہم اپنے اپنے دیس میں بستے ہیں اور اپنی اپنی قوم کا بھلا چاہتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ دنیا والوں کی نظر میں ہماری ایک عالمگیر برادری بھی ہے جس کا دل ہر دکھی کے ساتھ دکھتا ہے اور ہر سکھی کے ساتھ خورسند ہوتا ہے۔ یہ دکھ سکھ ہمارے اپنے ضمیر اور اپنے دل و دماغ کی تخلیق ہوتا ہے جسے نہ مختلف حکومتوں کی سیاسی مصلحتوں سے واسطہ ہے نہ سیاسی جماعتوں کے مخصوص تقاضوں سے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اگر ساتھ والے گھر میں کوئی ماں کوئی باپ کوئی بہن کوئی بیٹی دکھ درد سے کراہ رہی ہو اور ہم اُس کی طرف سے اپنا دل پتھر کر لیں،؟

اس وقت پاکستان میں کوئی نوّے ہزار گھرانے ایسے ہیں جن میں ان گنت مائیں بہنیں بیویاں بیٹیاں سال بھر سے اُن بچھڑے ہوئے عزیزوں کے فراق میں اشکبار اور سوگوار ہیں جو اس وقت ہمارے ہمسایہ ملک کی اسیری میں ہیں۔ ان میں سے کچھ اسیروں کی خطا یہ ہے کہ وہ اپنے حکام کے کہنے پر ایک دردناک معرکہ میں شریک ہوئے اور اُن کا قصور محض اتنا ہے کہ وہ اُن ہنگاموں کے دوران ایک ایسے دیس میں مقیم تھے جسے وہ اپنے وطن کا حصہ سمجھتے تھے۔

لیکن اُن کی اسیری کے سبب سے مصیبتوں کے پہاڑ ایسی مخلوق پر ٹوٹے ہیں جو قطعی بے خطا ہے اور بے گناہ ہے یہاں بھر سے ہم پاکستان کے ادیب اور فنکار اپنے اور دکھوں کے ساتھ اُن فرقت زدوں کے زخم دل بھی اپنے دل میں لیے پھرتے ہیں اور آج یہی زخم اپنی سرحد کے اُس پار اپنی برادری کے ہم نفسوں کو دکھانا چاہتے ہیں۔ اور ان سے اس کے مداوا میں امداد کے طالب ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ بھارت میں انفرادی طور پر ہر صاحب دل اُس بے جواز اور بے وجہ درد و الم کی تلافی کا خواہاں ہوگا جو اُن قیدیوں کی طویل اسیری کے باعث پیدا ہوئے ہیں اور جس کے سائے ہماری گلی کوچوں اور کھیتوں کھلیانوں پر منڈلا رہے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ انفرادی طور پر اُس تعدی کے خلاف انھوں نے احتجاج بھی کیا ہو اور اپنی حکومت اور ارباب اقتدار کو انصاف اور انسانیت کے نام پر ان اسیروں کی رہائی پر آمادہ کرنے کی کوشش بھی کی ہو لیکن ظاہر ہے کہ ابھی تک یہ صدائیں صدا بہ صحرا سے زیادہ موثر ثابت نہیں ہوئیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ برادری یک زبان ہو کر جماعتی طور سے یہ تقاضہ کرے کہ مصیبت زدوں اور اُن کے عزیزوں کو اس ابتلا سے نجات دلائی جائے۔ بعض اوقات حکومتیں مصلحتوں کی بنا پر اپنے دل کو پتھر اور اپنے ضمیر کو بہرا بھی تو کر لیا کرتی ہیں ایسی صورت میں اُن کے دل اور ضمیر کو بیدار کرنا فنکاروں اور دانشوروں ہی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ بھارت میں اس برادری کے اتنے کثیر اور مقتدر افراد موجود ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو اس ذمہ داری سے یقیناً عہدہ برا ہو سکتے ہیں۔







تمھارے حسن کے نام



سرودِ شبانہ

نیم شب، چاند، خود فراموشی
محفلِ ہست و بود ویراں ہے
پیکرِ التجا ہے خاموشی
بزمِ انجم فسردہ ساماں ہے
آبشارِ سکوت جاری ہے
چار سُو بے خودی سی طاری ہے
زندگی جزوِ خواب ہے گویا
ساری دنیا سراب ہے گویا

سو رہی ہے گھنے درختوں پر!
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز
کہکشاں نیم وا نگاہوں سے
کہہ رہی ہے حدیثِ شوقِ نیاز
سازِ دل کے خموش تاروں سے
چھن رہا ہے خمارِ کیف آگیں
آرزو، خواب، تیرا رُوئے حسیں

○

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

ویراں ہے میکدہ، خُم و ساغر اُداس ہیں
تم کیا گئے کہ رُوٹھ گئے دن بہار کے

اِک فرصتِ گناہ ملی، وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

بھُولے سے مسکرا تو دیئے تھے وہ آج فیض
مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے



مجھ سے پہلی سی
محبت میرے محبوب نہ مانگ

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ
میں نے سمجھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات

تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات

تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے

یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبّت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اَن گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخاب میں بُنوائے ہُوئے

جا بجا بِکتے ہُوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہُوئے خون میں نہلائے ہُوئے

لَوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجے

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبّت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ



چند روز اور مری جاں

چند روز اور مری جان، فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں

اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم
جسم پر قید ہے، جذبات پہ زنجیریں ہیں

فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں



عرصۂ دہر کی جُھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے

اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم
آج سہنا ہے، ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

یہ ترے حسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار

چاندنی راتوں کا بے کار دہکتا ہوا درد

دل کی بے سود تڑپ، جسم کی مایوس پکار
چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز



بول.....

بول، کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہن گر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے، سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول، کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے!

تنہائی

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سوگئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سُراغ
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفّل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا



دعا

آئیے ہاتھ اُٹھائیں، ہم بھی
ہم جنھیں رسمِ دعا یاد نہیں
ہم جنھیں سوزِ محبت کے سوا
کوئی بُت، کوئی خدا یاد نہیں

آئیے عرض گزاریں کہ نگارِ ہستی
زہرِ امروز میں شیرینیٔ فردا بھر دے
وہ جنھیں تابِ گراں باریٔ ایام نہیں
اُن کی پلکوں پہ شب و روز کو ہلکا کر دے

جن کی آنکھوں کو رخِ صبح کا یارا بھی نہیں
اُن کی راتوں میں کوئی شمع منوّر کر دے
جن کے قدموں کو کسی رہ کا سہارا بھی نہیں
اُن کی نظروں پہ کوئی راہ اُجاگر کر دے

جن کا دیں پیرویٔ کذب و ریا ہے اُن کو
ہمتِ کفر ملے، جرأتِ تحقیق ملے
جن کے سر منتظرِ تیغِ جفا ہیں ان کو
دستِ قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے

عشق کا سرِّ نہاں جانِ تپاں ہے جس سے
آج اقرار کریں اور تپش مٹ جائے
حرفِ حق دل میں کھٹکتا ہے جو کانٹے کی طرح
آج اظہار کریں اور خلش مٹ جائے



صبحِ آزادی

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شبِ سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رُکے گا سفینۂ غمِ دل

جواں لہو کی پُر اسرار شاہراہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیارِ حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
پکارتی رہیں باہیں، بدن بُلاتے رہے
بہت عزیز تھی لیکن رخِ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینانِ نور کا دامن
سبک سبک تھی تمنّا، دبی دبی تھی تھکن

سنا ہے ہو بھی چکا ہے فراقِ ظلمت و نور
سنا ہے ہو بھی چکا ہے وصالِ منزل و گام
بدل چکا ہے بہت اہلِ درد کا دستور
نشاطِ وصل حلال و عذابِ ہجر حرام

جگر کی آگ، نظر کی اُمنگ، دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا، کدھر کو گئی
ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی



لوح و قلم

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

اسبابِ غمِ عشق بہم کرتے رہیں گے
ویرانیٔ دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے

ہاں تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہلِ ستم، مشقِ ستم کرتے رہیں گے

منظور یہ تلخی، یہ ستم ہم کو گوارا
دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے

مے خانہ سلامت ہے، تو ہم سرخیٔ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے

باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگِ لب و رخسارِ صنم کرتے رہیں گے

اک طرزِ تغافل ہے سو وہ اُن کو مبارک
اک عرضِ تمنّا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

○

تم آئے ہو، نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر، بار بار گزری ہے

جنوں میں جتنی بھی گزری، بکار گزری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

نہ گُل کھلے ہیں، نہ اُن سے ملے، نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

چمن پہ غارتِ گُلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے



طوق و دار کا موسم

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم، بہار کا موسم

گراں ہے دل پہ غمِ روزگار کا موسم
ہے آزمائشِ حسنِ نگار کا موسم

خوشا نظارۂ رخسارِ یار کی ساعت
خوشا قرارِ دلِ بے قرار کا موسم

حدیثِ بادہ و ساقی نہیں تو کس مصرف
خرامِ ابرِ سرِ کوہسار کا موسم

نصیبِ صحبتِ یاراں نہیں تو کیا کیجے
یہ رقصِ سایۂ سرو و چنار کا موسم

یہ دل کے داغ تو دکھتے تھے یوں بھی پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے ہجرانِ یار کا موسم

یہی جنوں کا، یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر، یہی اختیار کا موسم

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم

صبا کی مست خرامی تہِ کمند نہیں
اسیرِ دام نہیں ہے بہار کا موسم

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم



...تمھارے حسن کے نام

سلام لکھتا ہے شاعر تمھارے حسن کے نام
بکھر گیا جو کبھی رنگِ پیرہن سرِ بام
نکھر گئی ہے کبھی صبح، دوپہر، کبھی شام
کہیں جو قامتِ زیبا پہ سج گئی ہے قبا
چمن میں سرو و صنوبر سنور گئے ہیں تمام
بنی بساطِ غزل جب ڈبو لیے دل نے
تمھارے سایۂ رخسار و لب میں ساغر و جام
سلام لکھتا ہے شاعر تمھارے حسن کے نام!

تمھارے ہاتھ پہ ہے تابشِ حنا جب تک
جہاں میں باقی ہے دلدارئ عروسِ سخن
تمھارا حسن جواں ہے تو مہرباں ہے فلک
تمھارا دم ہے تو دمساز ہے ہوائے وطن
اگرچہ تنگ ہیں اوقات، سخت ہیں آلام
تمھاری یاد سے شیریں ہے تلخئ ایام
سلام لکھتا ہے شاعر تمھارے حسن کے نام!

○

وہیں ہے دل کے قرائن تمام کہتے ہیں
وہ اِک خلش کہ جسے تیرا نام کہتے ہیں

تم آرہے ہو کہ بجتی ہیں میری زنجیریں
نہ جانے کیا مرے دیوار و بام کہتے ہیں

یہی کنارِ فلک کا سیہ تریں گوشہ
یہی ہے مطلعِ ماہِ تمام کہتے ہیں

پیو کہ مفت لگا دی ہے خونِ دل کی کشید
گراں ہے اب کے مئے لالہ فام کہتے ہیں

فقیہِ شہر سے مے کا جواز کیا پوچھیں
کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں

نوائے مرغ کو کہتے ہیں اب زیانِ چمن
کھلے نہ پھول، اسے انتظام کہتے ہیں

کہو تو ہم بھی چلیں فیضؔ، اب نہیں سرِ دار
وہ فرقِ مرتبۂ خاص و عام، کہتے ہیں





چوٹ، موچ، پٹھوں کے کھنچاؤ، جوڑوں اور اعصابی درد میں
آیوڈیکس CMS
جلد آرام پہنچاتا ہے
28g.
IODEX CMS Ointment
INDICATED IN
Neuralgic Pains, Stiff and Swollen Joints, Strains and Sprains, Rheumatic Twinges, Pain in Old Wounds, Unbroken Chilblains
Bland and non-staining does not harden, crack or irritate the skin.
SK&F
IODEX CMS
IODEX
بہت دیر سے آزمایا ہوا آیوڈیکس اب ٹیوب میں بھی دستیاب ہے
SMITH KLINE &FRENCH of PAKISTAN LIMITED
Estate Avenue S.I.T.E. Karachi 16
SK&F



ایرانی طلبہ کے نام

جو امن اور آزادی
... جدوجہد میں کام آئے

یہ کون سخی ہیں ... جیسے
جن کے لہو کی ... سے ظلم کی ...
اشرفیاں، چھن چھن، چھن چھن ...
دھرتی کے پیہم پیاسے ... ان آنکھوں سے اپنے ...
کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں ... ان ...
کشکول کو بھرتی ہیں

...شاہ زنجاں



نثار میں تیری گلیوں کے ....

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چُرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے
ہے اہلِ دل کے لیے اب یہ نظمِ بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقیّد ہیں اور سگ آزاد

بہت ہے ظلم کے دستِ بہانہ جُو کے لیے
جو چند اہلِ جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہلِ ہوس، مدّعی بھی، منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں
مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہوگی
غرض تصوّرِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

یونہی ہمیشہ اُلجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ اُن کی رسم نئی ہے، نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ اُن کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
اِسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل بُرا نہیں کرتے

گر آج تجھ سے جُدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اَوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے
جو بھی چل نکلی ہے وہ بات کہاں ٹھہری ہے

آج تک شیخ کے اکرام میں جو شے تھی حرام
اب وہی دشمنِ دیں، راحتِ جاں ٹھہری ہے

ہے خبر گرم کہ پھرتا ہے گریزاں ناصح
گفتگو آج سرِ کوئے بتاں ٹھہری ہے

ہے وہی عارضِ لیلیٰ، وہی شیریں کا دہن
نگہِ شوق گھڑی بھر کو جہاں ٹھہری ہے

وصل کی شب تھی تو کس درجہ سُبک گزری تھی
ہجر کی شب ہے تو کیا سخت گراں ٹھہری ہے

بکھری اک بار تو ہاتھ آئی ہے کب موجِ شمیم
دل سے نکلی ہے تو کب لب پہ فغاں ٹھہری ہے

دستِ صیّاد بھی عاجز، ہے کفِ گلچیں بھی
بُوئے گُل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

آتے آتے یونہی دم بھر کو رُکی ہو گی بہار
جاتے جاتے یونہی پل بھر کو خزاں ٹھہری ہے

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گُلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گُل ہے تمھارے بام پر آنے کا نام

دوستو، اُس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے، نہ میخانے کا نام

پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصوّر نے لیا اُس بزم میں جانے کا نام

دلبری ٹھہرا زبانِ خلق کھلوانے کا نام
اب نہیں لیتے پری رُو زلف بکھرانے کا نام
اب کسی لیلیٰ کو بھی اقرارِ محبوبی نہیں
اِن دنوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام

محتسب کی خیر، اُونچا ہے اسی کے فیض سے
رند کا، ساقی کا، مے کا، خُم کا، پیمانے کا نام

ہم سے کہتے ہیں چمن والے، غریبانِ چمن!
تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام

فیضؔ اُن کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنھیں
آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام

شیشوں کا
مسیحا کوئی نہیں

موتی ہو کہ شیشہ، جام کہ دُر
جو ٹوٹ گیا، سو ٹوٹ گیا
کب اشکوں سے جُڑ سکتا ہے
جو ٹوٹ گیا، سو چھوٹ گیا

تم ناحق ٹکڑے چُن چُن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

شاید کہ انہی ٹکڑوں میں کہیں
وہ ساغرِ دل ہے جس میں کبھی
صد ناز سے اُترا کرتی تھی
صہبائے غمِ جاناں کی پری

پھر دنیا والوں نے تم سے
یہ ساغر لے کر پھوڑ دیا
جو مے تھی بہا دی مٹی میں
مہمان کا شہپر توڑ دیا

یہ رنگیں ریزے ہیں شاید
اُن شوخ بلوریں سپنوں کے
تم مست جوانی میں جن سے
خلوت کو سجایا کرتے تھے

ناداری، دفتر، بھوک اور غم
ان سپنوں سے ٹکراتے رہے
بے رحم تھا چومکھ پتھراؤ
یہ کانچ کے ڈھانچے کیا کرتے

یا شاید ان ذرّوں میں کہیں
موتی ہے تمہاری عزّت کا
وہ جس سے تمہارے عجز پہ بھی
شمشاد قدوں نے رشک کیا

گم ہے اک کیف میں فضائے حیات
خامشی سجدۂ نیاز میں ہے
حسنِ معصوم خوابِ ناز میں ہے
اے کہ تو رنگ و بو کا طوفاں ہے
اے کہ تو جلوہ گر بہار میں ہے
زندگی تیرے اختیار میں ہے
پھول لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھڑی اور ہے بہارِ شباب
آکہ کچھ دل کی سُن سُنا لیں ہم
آ محبت کے گیت گا لیں ہم
میری تنہائیوں پہ شام رہے؟
حسرتِ دید نا تمام رہے؟
دل میں بیتاب ہے صدائے حیات
آنکھ گوہر نثار کرتی ہے
آسماں پر اداس ہیں تارے
چاندنی انتظار کرتی ہے
آکہ تھوڑا سا پیار کر لیں ہم
زندگی زرنگار کر لیں ہم!

اس مال کی دُھن میں پھرتے تھے
تاجر بھی بہت، رہزن بھی کئی
ہے چور نگر، یاں مفلس کی
گر جان بچی تو آن گئی

اِس کارگہِ ہستی میں جہاں
یہ ساغر، شیشے ڈھلتے ہیں
ہر شے کا بدل مل سکتا ہے
سب دامن پُر ہو سکتے ہیں

کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑ کر
یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اُٹھائی گیروں کی
ہر چال اُلجھائے جاتے ہیں

یہ ساغر، شیشے، لعل و گہر
سالم ہوں تو قیمت پاتے ہیں
یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں، تو فقط
چبھتے ہیں، لہو رُلواتے ہیں

جو ہاتھ بڑھے، یاور ہے یہاں
جو آنکھ اُٹھے، وہ بختاور
یاں دھن دولت کا انت نہیں
ہوں گھات میں ڈاکو لاکھ، مگر

ان دونوں میں رَن پڑتا ہے
نت بستی بستی نگر نگر
ہر بستے گھر کے سینے میں
ہر چلتی راہ کے ماتھے پر

تم ناحق شیشے چُن چُن کر !
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

کب لُوٹ جھپٹ سے ہستی کی
دوکانیں خالی ہوتی ہیں
یاں پربت پربت ہیرے ہیں
یاں ساگر ساگر موتی ہیں

یہ کالک بھرتے پھرتے ہیں
وہ جوت جگاتے رہتے ہیں
یہ آگ لگاتے پھرتے ہیں
وہ آگ بجھاتے رہتے ہیں

یادوں کے گریبانوں کے رفو
پر دل کی گزر کب ہوتی ہے
ک بخیہ اُدھیڑا، ایک سیا
ں عمر بسر کب ہوتی ہے

کچھ لوگ ہیں جو اس دولت پر
پردے لٹکاتے پھرتے ہیں
ہر پربت کو، ہر ساگر کو
نیلام چڑھاتے پھرتے ہیں

سب ساغر، شیشے، لعل و گہر
اِس بازی میں بد جاتے ہیں
اُٹھو [illegible] ی ہاتھوں کو
اِس رَن سے بلاوے آتے ہیں



*

سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں
ہم لوگ سرخرو ہیں کہ منزل سے آئے ہیں

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں، تری محفل سے آئے ہیں

اُٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

ہر اک قدم اجل تھا، ہر اِک گام زندگی
ہم گھوم پھر کے کوچۂ قاتل سے آئے ہیں

بادِ خزاں کا شکر کرو، فیضؔ، جس کے ہاتھ
نامے کسی بہار شمائل سے آئے ہیں

*

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن، نہ تھی تری انجمن سے پہلے
سزا، خطائے نظر سے پہلے، عتاب جُرمِ سخن سے پہلے

جو چل سکو تو چلو کہ راہِ وفا بہت مختصر ہُوئی ہے
مقام ہے اب کوئی نہ منزل، فرازِ دار و رسن سے پہلے

نہیں رہی اب جنوں کی زنجیر پر وہ پہلی اجارہ داری
گرفت کرتے ہیں کرنے والے خرد پہ دیوانہ پن سے پہلے

کرے کوئی تیغ کا نظارا، اب اُن کو یہ بھی نہیں گوارا
بضد ہے قاتل کہ جانِ بسمل فگار ہو جسم و تن سے پہلے

غرورِ سرو و سمن سے کہہ دو کہ پھر وہی تاجدار ہوں گے
جو خار و خس والیِ چمن تھے عروجِ سرو و سمن سے پہلے

ادھر تقاضے ہیں مصلحت کے، اُدھر تقاضائے دردِ دل ہے
زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں، اسیر ذکرِ وطن سے پہلے



ملاقات

یہ رات اُس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے، تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں، گھِر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب، اس کے سائے
میں اپنا سب نور رو چکے ہیں
یہ رات اُس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے، تجھ سے عظیم تر ہے

مگر اسی رات کے شجر سے
یہ چند لمحوں کے زرد پتّے
گرے ہیں، اور تیرے گیسوؤں میں
اُلجھ کے گلنار ہو گئے ہیں
اسی کی شبنم سے خامشی کے
یہ چند قطرے، تری جبیں پر
برس کے، ہیرے پرو گئے ہیں

(۲)

بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
اسی سیاہی میں رُونما ہے
وہ نہرِ خوں جو مری صدا ہے
اسی کے سائے میں نُور گر ہے
وہ موجِ زر جو تری نظر ہے
وہ غم جو اس وقت تیری باہوں
کے گلستاں میں سلگ رہا ہے
(وہ غم، جو اس رات کا ثمر ہے)
کچھ اور تپ جائے اپنی آہوں
کی آنچ تو ...

ہر اک سیہ شاخ کی کماں سے
جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے
جگر سے نوچے ہیں، اور ہر اک
کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے

الم نصیبوں، جگر فگاروں
کی صبح، افلاک پر نہیں ہے
جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن اُفق یہیں ہے
یہیں پہ غم کے شرار کھِل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں پہ قاتل دکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار کرنوں
کے آتشیں ہار بن گئے ہیں

(۳)

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے



○

شامِ فراق، اب نہ پوچھ، آئی اور آکے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا، جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی

بزمِ خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

جب تجھے یاد کر لیا، صبح مہک مہک اُٹھی
جب ترا غم جگا لیا، رات مچل مچل گئی

دل سے تو ہر معاملہ کرکے چلے تھے صاف ہم
کہنے میں اُن کے سامنے بات بدل بدل گئی

[illegible] لیا ہُوا
[illegible] صبح کدھر نکل گئی

○

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہات میں تیرا ہات نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

مشکل ہیں اگر حالات وہاں، دل بیچ آئیں جاں دے آئیں
دل والو کوچۂ جاناں میں کیا ایسے بھی حالات نہیں

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

میدانِ وفا دربار نہیں یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں

[illegible]
گر جیت گئے تو کیا کہنا [illegible] نہیں



اے روشنیوں کے شہر

سبزہ سبزہ، سوکھ رہی ہے پھیکی، زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
دُور افق تک گھٹتی، بڑھتی، اُٹھتی، گرتی رہتی ہے
کُہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر
بستا ہے اِس کہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر

اے روشنیوں کے شہر
کون کہے کس سمت ہے تیری روشنیوں کی راہ
ہر جانب بے نور کھڑی ہے ہجر کی شہر پناہ
تھک کر ہر سُو بیٹھ رہی ہے شوق کی ماند سپاہ

آج مرا دل فکر میں ہے
اے روشنیوں کے شہر
شب خوں سے منہ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رو
خیر ہو تیری لیلاؤں کی، ان سب سے کہہ دو
آج کی شب جب دیئے جلائیں، اُونچی رکھیں لَو

○

شاخ پر خونِ گُل رواں ہے وہی
شوخیِ رنگِ گلستاں ہے وہی

سر وہی ہے تو آستاں ہے وہی
جاں وہی ہے تو جانِ جاں ہے وہی

اب جہاں مہرباں نہیں کوئی
کوچۂ یارِ مہرباں ہے وہی

برق سو بار گر کے خاک ہُوئی
رونقِ خاکِ آشیاں ہے وہی

آج کی شب وصال کی شب ہے
دل سے ہر روز داستاں ہے وہی

چاند تارے اِدھر نہیں آتے
ورنہ زنداں میں آسماں ہے وہی



ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

(ایتھل اور جولیس روزنبرگ کے خطوط سے متاثر ہو کر لکھی گئی)

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

سُولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیری زلفوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی

جب گھلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے، لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم
اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی

دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں پہ مارے گئے

نارسائی اگر اپنی تقدیر تھی،
تیری الفت تو اپنی ہی تدبیر تھی
کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے
ہجر کی قتل گاہوں سے سب جا ملے

قتل گاہوں سے چُن کر ہمارے علَم
اور نکلیں گے عُشاق کے قافلے

جن کی راہِ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے
کر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم
جاں گنوا کر تری دلبری کا بھرم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے





AFRICA COME BACK*

آجاؤ، میں نے سن لی ترے ڈھول کی ترنگ
آجاؤ، مست ہو گئی میرے لہو کی تال

"آجاؤ ایفریقا"

آجاؤ، میں نے دھول سے ماتھا اُٹھا لیا
آجاؤ، میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال
آجاؤ، میں نے درد سے بازو چھڑا لیا
آجاؤ، میں نے نوچ دیا بے کسی کا جال

"آجاؤ ایفریقا"

پنجے میں ہتھکڑی کی کڑی بن گئی ہے گرز
گردن کا طوق توڑ کے ڈھالی ہے میں نے ڈھال

"آجاؤ ایفریقا"

جلتے ہیں ہر کچھار میں بھالوں کے مرگ نین
دشمن لہو سے رات کی کالک ہوئی ہے لال

آجاؤ ایفریقا"

دھرتی دھڑک رہی ہے مرے ساتھ ایفریقا"
دریا تھرک رہا ہے تو بن دے رہا ہے تال
میں ایفریقا ہوں، دھار لیا میں نے تیرا روپ
میں تو ہوں، میری چال ہے تیری ببر کی چال

"آجاؤ ایفریقا"

آؤ ببر کی چال

"آجاؤ ایفریقا"

* افریقی حریت پسندوں کا نعرہ



گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

قفس اُداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

کبھی تو صبح ترے کنجِ لب سے ہو آغاز
کبھی تو شب سرِ کاکل سے مشکبار چلے

بڑا ہے درد کا رشتہ، یہ دل غریب سہی
تمھارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

حضورِ یار ہوئی دفترِ جنوں کی طلب
گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے

مقام، فیض، کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

تری امید، ترا انتظار جب سے ہے
نہ شب کو دن سے شکایت نہ دن کو شب سے ہے

کسی کا درد ہو کرتے ہیں تیرے نام رقم
گلہ ہے جو بھی کسی سے ترے سبب سے ہے

ہُوا ہے جب سے دلِ ناصبور بے قابو
کلام تجھ سے نظر کو بڑے ادب سے ہے

اگر شرر ہے تو بھڑکے، جو پھول ہے تو کھلے
طرح طرح کی طلب، تیرے رنگِ لب سے ہے

کہاں گئے شبِ فرقت کے جاگنے والے
ستارۂ سحری ہمکلام کب سے ہے



آج بازار میں پا بجولاں چلو

چشمِ نم، جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشقِ پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پا بجولاں چلو

دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک بر سر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو

حاکمِ شہر بھی، مجمعِ عام بھی
تیرِ الزام بھی، سنگِ دشنام بھی
صبحِ ناشاد بھی، روزِ ناکام بھی

ان کا دم ساز اپنے سوا کون ہے
شہرِ جاناں میں اب با صفا کون ہے
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے

رختِ دل باندھ لو دل فگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

٭

○

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب، سرِ رہگزار چلے گئے

تری کج ادائی سے ہار کے شبِ انتظار چلی گئی
مرے ضبطِ حال سے رُوٹھ کر مرے غمگسار چلے گئے

نہ سوالِ وصل، نہ عرضِ غم، نہ حکایتیں نہ شکایتیں
ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے

یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِ رہ سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سرِ بزمِ یار چلے گئے

نہ رہا جنونِ رُخِ وفا، یہ رسن یہ دار کرو گے کیا
جنھیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے





پاس رہو

تم مرے پاس رہو
میرے قاتل، مرے دلدار، مرے پاس رہو
جس گھڑی رات چلے،
آسمانوں کا لہو پی کے سیہ رات چلے
مرہمِ مشک لیے، نشترِ الماس لیے
بَین کرتی ہوئی، ہنستی ہُوئی، گاتی نکلے
درد کے کاسنی پازیب بجاتی نکلے
جس گھڑی سینوں میں ڈوبے ہوُئے دل
آستینوں میں نہاں ہاتھوں کی رہ تکنے لگیں
آس لیے
اور بچوں کے بلکنے کی طرح قُلقُلِ مے
بہرِ ناسودگی مچلے تو منائے نہ منے
جب کوئی بات بنائے نہ بنے
جب نہ کوئی بات چلے
جس گھڑی رات چلے
جس گھڑی ماتمی، سنسان، سیہ رات چلے
پاس رہو
میرے قاتل، مرے دلدار مرے پاس رہو!

○

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تنِ داغ داغ لُٹا دیا

مرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

کرو کج جبیں یہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

اُدھر ایک حرف کہ کشتنی یہاں لاکھ عذر تھا گفتنی
جو کہا تو سُن کے اُڑا دیا جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا

جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا



منظر

رہگزر، سائے، شجر، منزل و در، حلقۂ بام
بام پر سینۂ مہتاب کھلا، آہستہ
جس طرح کھولے کوئی بندِ قبا، آہستہ
حلقۂ بام تلے، سایوں کا ٹھہرا ہوا نیل
نیل کی جھیل
جھیل میں چپکے سے تیرا، کسی پتے کا حباب
ایک پل تیرا، چلا، پھوٹ گیا، آہستہ
بہت آہستہ، بہت ہلکا، خنک رنگِ شراب
میرے شیشے میں ڈھلا، آہستہ
شیشہ و جام، صراحی، ترے ہاتھوں کے گلاب
جس طرح دور کسی خواب کا نقش
آپ ہی آپ بنا اور مٹا آہستہ

دل نے دہرایا کوئی حرفِ وفا، آہستہ
تم نے کہا، "آہستہ"
چاند نے جھک کے کہا
"اور ذرا آہستہ"

○

نہ کسی پہ زخم عیاں کوئی، نہ کسی کو فکر رفو کی ہے
نہ کرم ہے ہم پہ حبیب کا، نہ نگاہ ہم پہ عدو کی ہے

صفِ زاہداں ہے تو بے یقیں، صفِ میکشاں ہے تو بے طلب
نہ وہ صبح ورد و وضو کی ہے، نہ وہ شام جام و سبو کی ہے

نہ یہ غم نیا، نہ ستم نیا، کہ تری جفا کا گلہ کریں
یہ نظر تھی پہلے بھی مضطرب، یہ کسک تو دل میں کبھو کی ہے

کفِ باغباں پہ بہارِ گل کا ہے قرض پہلے سے بیشتر
کہ ہر ایک پھول کے پیرہن میں نمود میرے لہو کی ہے

نہیں خوفِ روزِ سیہ ہمیں، کہ ہے فیض ظرفِ نگاہ میں
ابھی گوشہ گیر وہ اک کرن، جو لگن اس آئینہ رو کی ہے



اِنتساب

آج کے نام
اور
آج کے غم کے نام
آج کا غم کہ ہے زندگی کے بھرے گلستاں سے خفا
زرد پتوں کا بن
زرد پتوں کا بن جو مرا دیس ہے
درد کی انجمن جو مرا دیس ہے
کلرکوں کی افسردہ جانوں کے نام
کرم خوردہ دلوں اور زبانوں کے نام
پوسٹ مینوں کے نام
تانگے والوں کے نام
ریل بانوں کے نام
کارخانوں کے بھوکے جیالوں کے نام
بادشاہِ جہاں، والیٔ ماسوا، نائب اللہ فی الارض
دہقاں کے نام
جس کے ڈھوروں کو ظالم ہنکا لے گئے
جس کی بیٹی کو ڈاکو اٹھا لے گئے
ہاتھ بھر کھیت سے ایک انگشت پٹوار نے کاٹ لی ہے
دوسری مالیے کے بہانے سے سرکار نے کاٹ لی ہے
جس کی پگ زور والوں کے پاؤں تلے
دھجیاں ہو گئی ہے
اُن دکھی ماؤں کے نام
رات میں جن کے بچے بلکتے ہیں اور
نیند کی مار کھائے ہوئے بازوؤں میں سنبھلتے نہیں
دُکھ بتاتے نہیں
منتوں زاریوں سے بہلتے نہیں

ان حسیناؤں کے نام
جن کی آنکھوں کے گُل
چلمنوں اور دریچوں کی بیلوں پہ بیکار کھل کھل کے
مرجھا گئے ہیں
اُن بیاہتاؤں کے نام
جن کے بدن
بے محبت ریاکار سیجوں پہ سج سج کے اُکتا گئے ہیں

بیواؤں کے نام

کٹڑیوں   وں، محلّوں کے نام

جن کی نا   خاشاک سے چاند راتوں

کو آ آ   کے کرتا ہے اکثر وضو

جن کے سایوں میں کرتی ہے آہ و بکا

آنچلوں کی حنا

چوڑیوں کی کھنک

کاکلوں کی مہک

آرزومند سینوں کی اپنے پسینے میں جلنے کی بُو

پڑھنے والوں کے نام

وہ جو اصحابِ طبل و علم

کے دروں پر کتاب اور قلم

کا تقاضا لیے، ہاتھ پھیلائے

پہنچے، مگر لوٹ کر گھر نہ آئے

وہ معصوم جو بھولپن میں

وہاں اپنے ننھے چراغوں میں لو کی لگن

لے کے پہنچے جہاں

بٹ رہے تھے، گھٹا ٹوپ، بے انت راتوں کے سائے

اُن اسیروں کے نام

جن کے سینوں میں فردا کے شب تاب گوہر

جیل خانوں کی شوریدہ راتوں کی صرصر میں

جل جل کے انجم نما ہو گئے ہیں

آنے والے دنوں کے سفیروں کے نام

وہ جو خوشبوئے گُل کی طرح

اپنے پیغام پر خود فدا ہو گئے ہیں



یہاں سے شہر کو دیکھو

یہاں سے شہر کو دیکھو تو حلقہ در حلقہ
کھنچی ہے جیل کی صورت ہر ایک سمت فصیل
ہر ایک راہ گزر گردشِ اسیراں ہے
نہ سنگِ میل، نہ منزل، نہ مخلصی کی سبیل

جو کوئی تیز چلے رہ تو پوچھتا ہے خیال
کہ ٹوکنے کوئی للکار کیوں نہیں آئی
جو کوئی ہاتھ ہلائے تو وہم کو ہے سوال
کوئی چھنک، کوئی جھنکار کیوں نہیں آئی؟

یہاں سے شہر کو دیکھو تو ساری خلقت میں
نہ کوئی صاحبِ تمکیں، نہ کوئی والیِ ہوش
ہر ایک مردِ جواں مجرمِ رسن بہ گلو
ہر اک حسینۂ رعنا، کنیزِ حلقہ بگوش

جو سائے دُور چراغوں کے گرد لرزاں ہیں
نہ جانے محفلِ غم ہے کہ بزمِ جام و سبُو
جو رنگ ہر در و دیوار پر پریشاں ہیں
یہاں سے کچھ نہیں کُھلتا یہ پھول ہیں کہ لہو

پھر برق فروزاں ہے سرِ وادیِ سینا
پھر رنگ پہ ہے شعلۂ رخسارِ حقیقت
پیغامِ اجل دعوتِ دیدارِ حقیقت
اے دیدۂ بینا
اب وقت ہے دیدار کا دم ہے کہ نہیں ہے
اب قاتلِ جاں چارہ گرِ کلفتِ غم ہے
گلزارِ ارم پرتوِ صحرائے عدم ہے
پندارِ جنوں
حوصلۂ راہِ عدم ہے کہ نہیں ہے
پھر برق فروزاں ہے سرِ وادیِ سینا، اے دیدۂ بینا
پھر دل کو مصفّا کرو، اس لوح پہ شاید

ما بینِ من و تو نیا پیماں کوئی اُترے
اب رسمِ ستم حکمتِ خاصانِ زمیں ہے
تائیدِ ستم مصلحتِ مفتیِ دیں ہے
اب صدیوں کے اقرارِ اطاعت کو بدلنے
لازم ہے کہ انکار کا فرماں کوئی اُترے

خورشیدِ محشر کی لَو

آج کے دن نہ پوچھو، مرے دوستو
دُور کتنے ہیں خوشیاں منانے کے دن
کھُل کے ہنسنے کے دن، گیت گانے کے دن
پیار کرنے کے دن، دل لگانے کے دن
آج کے دن نہ پوچھو، مرے دوستو
زخم کتنے ابھی بختِ بسمل میں ہیں
دشت کتنے ابھی راہِ منزل میں ہیں
تیر کتنے ابھی دستِ قاتل میں ہیں
آج کا دن زبوں ہے، مرے دوستو
آج کے دن تو یوں ہے، مرے دوستو
جیسے درد و الم کے پُرانے نشاں
سب چلے سوئے دل کارواں، کارواں
ہاتھ سینے پہ رکھو تو ہر استخواں
سے اُٹھے نالۂ الاماں، الاماں
آج کے دن نہ پوچھو، مرے دوستو
کب تمھارے لہو کے دریدہ علم
فرقِ خورشیدِ محشر پہ ہوں گے رقم
از کراں تا کراں کب تمھارے قدم
لے کے اُٹھے گا وہ بحرِ خوں یم بہ یم
جس میں دھُل جائے گا آج کے دن کا غم
سارے درد و الم سارے جور و ستم
دُور کتنی ہے خورشیدِ محشر کی لَو
آج کے دن نہ پوچھو مرے دوستو



جس روز قضا آئے گی

کس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی
شاید اِس طرح کہ جس طور کبھی اوّلِ شب
بے طلب پہلے پہل مرحمتِ بوسۂ لب
جس سے کھُلنے لگیں ہر سَمت طلسمات کے در
اور کہیں دُور سے انجان گلابوں کی بہار
یک بیک سینۂ مہتاب کو تڑپانے لگے

شاید اس طرح کہ جس طور کبھی آخرِ شب
نیم وا کلیوں سے سرسبز سحر
یک بیک حجرۂ محبوب میں لہرانے لگے
اور خاموش دریچوں سے بہ ہنگامِ رحیل
جھنجھناتے ہُوئے تاروں کی صدا آنے لگے

کس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی
شاید اس طرح کہ جس طور تہِ نوکِ سناں
کوئی رگ واہمۂ درد سے چِلّانے لگے
اور قزّاقِ سناں دست کا دھندلا سایہ
از کراں تا بہ کراں دہر پہ منڈلانے لگے

جس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی
خواہ قاتل کی طرح آئے کہ محبوب صفت
دل سے بس ہوگی یہی حرفِ وِداع کی صورت
للہِ الحمد بانجامِ دلِ دل زدگاں
کلمۂ شکر بنامِ لبِ شیریں دہناں



اے شام مہرباں ہو

اے شام مہرباں ہو
اے شامِ شہر یاراں
ہم پہ مہرباں ہو
دوزخی دوپہر ستم کی
بے سبب ستم کی
دوپہر درد وغیظ وغم کی
بے زباں درد وغیظ وغم کی
اِس دوزخی دوپہر کے تازیانے
آج تن پر دھنک کی صورت
قوس در قوس بٹ گئے ہیں
زخم سب کھُل گئے ہیں
داغ جانا تھا چھٹ گئے ہیں
ترے توشے میں کچھ تو ہوگا
مرہمِ درد کا دوشالہ
تن کے اُس انگ پر اُڑھا دے
درد سب سے سوا جہاں ہو
اے شام مہرباں ہو
اے شامِ شہر یاراں
ہم پہ مہرباں ہو

دوزخی دشت نفرتوں کے
بے درد نفرتوں کے
کرچیاں دیدۂ حسد کی
خس و خاشاک رنجشوں کے
اتنی سنسان شاہراہیں،
اتنی گنجان قتل گاہیں
جن سے آئے ہیں ہم گزر کر
آبلہ بن کے ہر قدم پر
یوں پاؤں کٹ گئے ہیں
رستے سمٹ گئے ہیں
مخملیں اپنے بادلوں کی
آج پاؤں تلے بچھا دے
شافیٔ کربِ رہرواں ہو
اے شام مہرباں ہو

اے مہِ شب نگاراں
اے رفیقِ دلفگاراں
اِس شام ہمزباں ہو
اے شام مہرباں ہو
اے شام مہرباں ہو
اے شامِ شہر یاراں
ہم پہ مہرباں ہو



ربّا سچّیا

ربّا سچّیا توں تے آکھیا سی
جا اوئے بندیا جگ دا شاہ ہیں توں
ساڈیاں نعمتاں تیریاں دولتاں نیں
ساڈا نائب تے عالیجاہ ہیں توں
ایس لارے تے ٹور کد پچھیا ای
کیہہ ایس نمانے تے بیتیاں نیں
کدی سار وی لئی اُو ربّ سائیاں
تیرے شاہ نال جگ کیہہ کیتیاں نیں

کتنے دھونس پولیس سرکار دی اے
کتے دھاندلی مال پٹوار دی اے

اینویں ہڈّاں وچ کلپے جان میری
جیویں پھاہی وچ کونج کرلاوندی اے
چنگا شاہ بنایا ای ربّ سائیاں
پولے کھاندیاں وار نہ آوندی اے

مینوں شاہی نئیں چاہیدی ربّ میرے
میں تے عزت دا ٹکّر منگناں ہاں
مینوں تاہنگ نئیں محلاں ماڑیاں دی
میں تے جیویں دی نکّر منگناں ہاں

میری منّیں تے تیریاں میں منّاں
تیری سونہہ جے اِک وی گل موڑاں
جے ایہہ مانگ نئیں پجدی تیں ربّا
فیر میں جاداں تے ربّ کوئی ہور لوڑاں



کچھ عشق کیا کچھ کام کیا

وہ لوگ بہت خوش قسمت تھے
جو عشق کو کام سمجھتے تھے
یا کام سے عاشقی کرتے تھے
ہم جیتے جی مصروف رہے
کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا،
کام عشق کے آڑے آتا رہا
اور عشق سے کام اُلجھتا رہا
پھر آخر تنگ آ کر ہم نے
دونوں کو اُدھورا چھوڑ دیا

ہمیں سے اپنی نوا ہم کلام ہوتی رہی
یہ تیغ اپنے لہو میں نیام ہوتی رہی

مقابلِ صفِ اعداء جسے کیا آغاز
وہ جنگ اپنے ہی دل میں تمام ہوتی رہی

کوئی مسیحا نہ ایفائے عہد کو پہنچا
بہت تلاش پسِ قتلِ عام ہوتی رہی

یہ برہمن کا کرم، وہ عطائے شیخِ حرم
کبھی حیات کبھی مے حرام ہوتی رہی

جو کچھ بھی بن نہ پڑا، فیض، لُٹ کے یاروں سے
تو رہزنوں سے دعاؤ سلام ہوتی رہی



دلِ من مسافرِ من

مرے دل، مرے مسافر
ہُوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رُخ نگر نگر کا
کہ سُراغ کوئی پائیں
کسی یار نامہ بر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتا تھا اپنے گھر کا
سرِ کوئے ناشنایاں
ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا
کبھی اُس سے بات کرنا
تمھیں کیا کہوں کہ کیا ہے
شبِ غم بُری بلا ہے
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت
جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا بُرا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا!

کوئی عاشق کسی محبُوبہ سے

گلشنِ یاد میں گر آج دمِ بادِ صبا
پھر سے چاہے کہ گل افشاں ہو تو ہو جانے دو
عمرِ رفتہ کے کسی طاق پہ بِسرا ہوا درد
پھر سے چاہے کہ فروزاں ہو تو ہو جانے دو
جیسے بیگانہ سے اب ملتے ہو ویسے ہی سہی
آؤ دو چار گھڑی میرے مقابل بیٹھو

گرچہ مل بیٹھیں گے ہم تم تو ملاقات کے بعد
اپنا احساسِ زیاں اور زیادہ ہوگا
ہم سخن ہوں گے جو ہم دونوں تو ہر بات کے بیچ
اَن کہی بات کا موہوم سا پردہ ہوگا
کوئی اقرار نہ میں یاد دلاؤں گا نہ تم
کوئی مضمون وفا کا نہ جفا کا ہوگا

گردِ ایام کی تحریر کو دھونے کے لیے
تم سے گویا ہوں دمِ دید جو میری پلکیں
تم جو چاہو تو سنو، اور جو نہ چاہو نہ سنو
اور جو حرف کریں مجھ سے گریزاں آنکھیں
تم جو چاہو تو کہو، اور جو نہ چاہو نہ کہو



اِک ترانہ۔ پنجابی کسان کے لئے

اُٹھ اُتاں نوں جٹّا
مردا کیوں جا ئیں
بھولیا! تُوں جگ دا اَن داتا
تیری باندی دھرتی ماتا
توں جگ دا پالن ہار
تے مردا کیوں جا ئیں
اُٹھ اُتاں نوں جٹّا
مردا کیوں جا ئیں

جرنل، کرنل، صوبیدار
ڈپٹی، ڈی سی، تھانیدار
سارے تیرا دِتّا کھاون
تُوں سجے نہ بیجیں، توں سجے نہ گاہویں
بُھکھے، بھانے سب مرجاون
ایہہ چاکر توں سرکار
مردا کیوں جا ئیں
اُٹھ اُتاں نوں جٹّا
مردا کیوں جا ئیں

وِچ کچہری، چونکی تھانے
کیہہ اَن بھول تے کیہہ سیانے
کیہہ اشراف تے کیہہ نمانے

سارے کھجّل خوار
مردا کیوں جا ئیں
اُٹھ اُتاں نوں جٹّا

ایکا کر لَو، ہو جاوَ کٹھّے
بُھل جاوَ رانگڑ، چیمے، چٹھّے
سبھّے دا اک پریوار
مردا کیوں جا ئیں

جے چڑھ آون فوجاں والے
توں وی چھوّیاں لمب کرالے
تراحق تری تلوار
تے مردا کیوں جائیں
دسے اللہ ہُو دی مار
تے مردا کیوں جائیں

اِس وقت یُوں لگتا ہے

اِس وقت تو یُوں لگتا ہے اب کچھ بھی نہیں ہے
مہتاب نہ سُورج ، نہ اندھیرا نہ سویرا

آنکھوں کے دریچوں پہ کسی حُسن کی چلمن
اور دل کی پناہوں میں کسی درد کا ڈیرا

ممکن ہے کوئی وہم تھا ، ممکن ہے سنا ہو
گلیوں میں کسی چاپ کا اِک آخری پھیرا

شاخوں میں خیالوں کے گھنے پیڑ کی شاید
اب آکے کرے گا نہ کوئی خواب بسیرا

اِک بَیر، نہ اِک مہر، نہ اِک ربط نہ رشتہ
تیرا کوئی اپنا ، نہ پرایا کوئی میرا

—

مانا کہ یہ سُنسان گھڑی سخت کڑی ہے
لیکن مرے دل یہ تو فقط اِک ہی گھڑی ہے
ہمّت کرو، جینے کو تو اِک عمر پڑی ہے



○

نہیں نگاہ میں منزل تو جستجو ہی سہی
نہیں وصال میسّر تو آرزو ہی سہی

نہ تن میں خون فراہم نہ اشک آنکھوں میں
نمازِ شوق تو واجب ہے، بے وضو ہی سہی

کسی طرح تو جمے بزم میکدے والو
نہیں جو بادہ و ساغر تو ہاؤ ہُو ہی سہی

گر انتظار کٹھن ہے تو جب تلک اے دل
کسی کے وعدۂ فردا کی گفتگو ہی سہی

دیارِ غیر میں محرم اگر نہیں کوئی
تو فیض ذکرِ وطن اپنے رُو برُو ہی سہی



○

گو سب کو بہم ساغر و بادہ تو نہیں تھا
یہ شہر اُداس اتنا زیادہ تو نہیں تھا

گلیوں میں پھرا کرتے تھے دو چار دِوانے
ہر شخص کا صد چاک لبادہ تو نہیں تھا

منزل کو نہ پہچانے رہِ عشق کا راہی
ناداں ہی سہی ایسا بھی سادہ تو نہیں تھا

تھک کر یونہی پل بھر کے لیے آنکھ لگی تھی
سو کر ہی نہ اٹھیں یہ ارادہ تو نہیں تھا

واعظ سے رہ و رسم رہی رند سے صحبت
فرق ان میں کوئی اتنا زیادہ تو نہیں تھا

○

پھر آئنۂ عالم شاید کہ نکھر جائے
پھر اپنی نظر شاید تا حدِّ نظر جائے

صحرا پہ لگے پہرے اور قفل پڑے بن پر
اب شہر بدر ہو کر دیوانہ کدھر جائے

خاکِ رہِ جاناں پر کچھ خوں تھا گرو اپنا
اس فصل میں ممکن ہے یہ قرض اُتر جائے

دیکھ آئیں چلو ہم بھی جس بزم میں سُنتے ہیں
جو خندہ بلب آئے وہ خاک بسر جائے

یا خوف سے در گزریں یا جاں سے گزر جائیں
مرنا ہے کہ جینا ہے اک بات ٹھہر جائے

—— اِنتہا ——





ایک نظم

فیض صاحب کے رنگ میں
فیض صاحب کے لئے

سرمد صہبائی

کیا خبر ہم سے ملے وہ نہ ملے
کیا خبر ہم سے ملے
رات کے شہر میں مہتاب کی عریانی میں
محملِ خواب لیے ہالۂ آغوش لیے
ابرِ رفتار لیے قامتِ زرپوش لیے
جلوۂ رنگِ حنا عطرِ ملاقات لیے
ہجر کی رُت میں ملے وصل کی سوغات لیے
کیا خبر ہم سے ملے وہ نہ ملے
کیا خبر ہم سے ملے
ماتمِ گُل میں کہیں موسمِ افسوس لیے
اشکِ محروم کی دھندلائی ہوئی اوس لیے
کیا خبر صبحِ سفر ساحلِ رخصت پہ ملے
چشمِ بینا سے پرے منزلِ حیرت پہ ملے
جانے اب کون سی مہلت پہ ملے
کیا خبر ہم سے ملے وہ نہ ملے
شہر در شہر ملے ہانپتی تنہائی میں
جشنِ تعزیر یا جلسۂ رُسوائی میں
جانے کس آن میں کس موجِ جنوں میں آتے
عکسِ خورشید لیے شیشۂ خوں میں آتے
کیا خبر ہم سے ملے
ہر رگِ جاں میں تڑپتے ہُوئے دم لیتے ہوئے
تختۂ دار کی بانہوں میں جنم لیتے ہُوئے
کیا خبر ہم سے ملے وہ نہ ملے



ضیا فتح آبادی، نئی دہلی

فیض بے فیض

ہو گیا رخصت چمن سے فیض احمد فیض بھی   بادِ تند ایسی چلی دیوارِ زنداں ڈھا گئی
اسکی خوش الحانیوں سے تھی فضاؤں میں مہک   اُڑ گیا پنچھی، قریب و دور اداسی چھا گئی

کون اب خوابوں کو لفظی پیرہن پہنائے گا   کون اب دے گا خرد کو دعوتِ حسن و جمال
کون اب انسانیت کا دے گا انساں کو سبق   کون اب ان ٹوٹتے رشتوں کا رکھے گا خیال

ہائے وہ فکر و نظر کی شمعیں روشن جس نے کیں   اپنے پیچھے اک اندھیرا چھوڑ کر گم ہو گیا
ہائے وہ تارا جو منزل آشنائے نور تھا   وسعتِ افلاس میں جانے کہاں اب کھو گیا

اے ضیاؔ ہر سمت بکھراؤ ہے، ہر سو انتشار   آخری تو کارواں سالار کو کرلے سلام
وہ گیا، اس کا پلٹ کر آنا ناممکن مگر   دھڑکنوں میں دل کی زندہ ہے کلامِ باپیام

جب نہیں ہے فیضؔ ہی تو انجمن بے فیض ہے
آبدیدہ کیوں نہ ہو فنِ سخن بے فیض ہے



نذرِ فیض

فیض کی زندگی میں ان کی خدمت میں پیش کی گئی

کوچۂ یار سے کچھ زخم وہ دل نے پائے
اب کے بھی موسم گل میں جو نہ سلنے پائے
ایک مدت ہوئی ہم تازہ بہاروں کے رسول
ایسے بچھڑے ہیں کہ اب تک نہیں ملنے پائے
کیسے اس فصل بہاراں کو تو پھر کیا کہیے
چند گل بھی تو شاخ نہ کھلنے پائے
یہ بھی اک طرز کا اعجاز مسیحائی ہے
سل گئے ہونٹ مگر زخم نہ سلنے پائے
صاحب دشت نوا جرأت گفتار کی خیر !!!
ہونٹ پھر ہونٹ ہیں زنجیر نہ ہلنے پائے
تم نے ہر حلقۂ زنجیر میں رکھ دی ہے زباں
یہ صدا اس کے بڑے حوصلے دل نے پائے

نقاش کاظمی

فیض

جاوید شاہین

وہ ہم سے ملتا رہا آزمائشوں میں کبھی
سیاہ ساعتوں میں زرد منظروں میں کبھی
سفید خامشی میں سرخ راستوں میں کبھی
جو کچھ بھی رنگ ملاقات تھا گوارا تھا
یہی تسلی تھی دل کو یہی سہارا تھا
کہ درد موسموں میں جب اسے پکارا تھا
وہ لے کے آ گیا مرہم یا جو بھی چارا تھا
زمیں سے آسماں تک رات کا افق پھر ہے
جو تھا وہ تیرگی والوں کا ہم پہ حق پھر ہے
ہمارے خون کی میلی بہت شفق پھر ہے
اسے بلایا ہے پھر سے کہ سینہ شق پھر ہے
مگر وہ گرم نگہ نرم لب نہیں آیا!
دلوں میں وہم کوئی بے سبب نہیں آیا
کوئی تو بات ہے وہ بیچ شب نہیں آیا



فیض میرے ہونے کا یقیں

جاوید شاہین

رات جب درد نے پھر زور کیا
اور ظلمات نے اپنی لو کو
تیز کچھ اور کیا
دل نے ہولے سے پکارا اس کو
یوں لگا
جیسے بہت پاس ہے وہ
مرہمِ درد لئے شمعِ دل گرم لئے
سنگ دشنام کی بارش میں سخن نرم لئے
سرد مردہ سی زبانوں سے ٹپکتی چپ میں
جرأتِ حرف کا پیغام مرے نام لئے
سب رقیبوں کے لبادوں پر سیاہی مل کر
تہمتِ عشق کا الزام سرِ عام لئے
رات کے دل میں بہت دور تلک
روشنی بن کے کھٹکنے والا
چار سو دھند کے اندر میرے ہونے کا یقیں
موت کا ہاتھ جھٹکنے والا

فیض احمد فیض
کے لئے

احمد ضیاء

جب بھی شب سیہ کا اندھیرا ڈرائے گا۔
تیرا سخن ہی صبح کا رستہ دکھائے گا۔
جب بھی چلے گا زندہ صحافت کا تذکرہ
اہلِ وطن کو نام تیرا یاد آئے گا
میں سوچتا ہوں وقت کی آندھی کا سلسلہ
سورج کی روشنی کو بھلا کیا چھپائے گا
جو تیرا راستہ وہی خوشبو کا راستہ
سچائی بن کے نام تیرا پھیل جائے گا
تو جاگتا ہے آج فلسطین کے لیے
کوئی تیرے خلوص کو کیسے بھلائے گا۔
تیری ہی رسم تازہ کرے گا جہان میں
گہرا سکوت جب بھی کوئی توڑ جائے گا
وہ دور بھی گذر گیا لمحوں کے ساتھ ساتھ
احمد ضیاؔ یہ دور بھی اب بیت جائیگا



وہ گواہ رات مکر گیا

نسیم شاہد

مرے عشق کا وہ مزاج داں
وہ وکیل میرے گناہ کا
وہ ستارہ صبح کی راہ کا
یہ قدم قدم پہ عدالتیں
وہ گلی گلی میں کچہریاں
مرے ہر سخن میں مشیر تھا
مرے ہر بیان میں ہم زباں
ابھی سر پہ ہیں وہ جرح کے دن
ابھی روزِ عدل میں دیر ہے
شبِ ہجر ہے شبِ تار ہے
بڑا بوجھ ہے بڑا بار ہے
وہ چراغ ہے شبِ ہجر کا
وہ پیام ہے مرے وصل کا
ابھی روزِ عدل میں دیر ہے
یہ جو فردِ جرم کا ڈھیر ہے

کئی موسموں کی جدائیاں
کئی منزلوں کی مسافتیں
ابھی دور ہیں وہ جرح کے دن
ابھی سو رہو دلِ مطمئن
مرے عشق کا وہ مزاج داں
جو گواہ بھی ہے وکیل بھی
جو دلیل بھی ہے سبیل بھی
سرِ خواب کس نے جگا دیا
ابھی دور ہے میرا فیصلہ
وہ ستارہ صبح کی راہ کا کھو گیا ہوا.
وہ وکیل میرے گناہ کا کھو گیا ہوا
وہ گواہ جو میرے حق میں تھا کھو گیا ہوا
وہ گواہ رات مکر گیا
وہ ستارہ ٹوٹ کے مر گیا



فیض صاحب کے انتقال کی خبر سن کر

بیادِ فیض

تمنّا ش کاظمی

شبِ انجمن سے چراغِ جاں وہ جو لے کے تا بہ سحر گیا
اسی شہرِ یار کو ڈھونڈیے کہ ستارے آنکھوں میں بھر گیا
کبھی وہ بھرا تھا قفس قفس لئے قتل گاہوں کا بانکپن
کبھی ہو گیا وہ جلا وطن تو لہو لہو میں بکھر گیا ۔ !
بڑی کشمکش میں ہیں چارہ گر صفِ دشمناں بھی اداس ہے
جو زمین کے بیٹوں کی لاج تھا وہ زمیں کے دل میں اتر گیا
وہ نقیبِ کوچۂ امن تھا، وہ حریفِ بادۂ ظلم تھا
جو رکا تو کوہِ گراں رہا جو چلا تو جاں سے گذر گیا
رہِ یار میں تو قدم قدم کوئی دو گھڑی کا حساب تھا
مرے محتسب تری خیر ہو وہی قرضِ جاں تو اتر گیا
پسِ مرگ دامنِ کوہ میں کوئی جوشؔ کو یہ خبر کر دو
تپِ شوق میں ترا فیضؔ بھی یہ خبر اڑی ہے، کہ مر گیا

نعیم اظہر

فیض احمد فیضؔ

خود کو یوں پیکرِ تصویر کیا ہے تو نے
ایک عالم کو گلو گیر کیا ہے تو نے
دردِ انساں تھا کہ تھا راہِ محبت کا جنون
جو بھی پایا وہ ہمہ گیر کیا ہے تو نے
مدتوں ڈھونڈیں گے ہم اسکی تمازت کے نقوش
فن کو جس سوز سے تطہیر کیا ہے تو نے !
دیگا اک عصر کو وہ حسنِ فراست کا شعور
جو محل شعروں سے تعمیر کیا ہے تو نے
کون کہتا ہے یہ آہو نہیں قابو آتے
جذبہ و فکر کو زنجیر کیا ہے تو نے
فیض تو زندہ ہے پائندہ رہے نام ترا
زیست کو حاصلِ توقیر کیا ہے تو نے
پورے اس عہد کو نخچیر کیا ہے تو نے
اک اظہر ہی تیرے غم سے نہیں ہے گھائل



جو تجھ سے مجھ سے عظیم تر ہے





سید سجاد ظہیر

(یہ مضمون ... روزنامہ سیاست ... میں شائع ہوا ... [illegible])

فیض، شامِ غزل

دہلی میں ایک حیدرآبادی نوجوان گلوکار صاحب نے کمال کر دکھایا ہے۔ تقریباً ایک سال سے ہر ماہ "شامِ غزل" کے نام سے ایک محفل سجاتا ہے جس کا پروگرام کچھ اس طرح ترتیب دیا جاتا ہے۔ جس میں اُردو کے کسی ایک شاعر کی غزلیں گا کر سنائی جاتی ہیں۔ گانے والے سب استاد نہیں ہوتے بلکہ اقبال بانو، حفیظ خاں، ... دہلوی وغیرہ۔ گذشتہ مہینے ہم نے فیض کا کلام سنا۔ سکندر علی وجد بھی تشریف رکھتے تھے۔ اقبال بانو نے دراصل کمال کر دکھایا۔ ساری محفل پر وجد و حال طاری تھا۔

اُسی شام میں نے فیض کے متعلق ایک چھوٹا سا مضمون پڑھا وہ یہیں لکھ رہا ہوں:]

آج شام ہم سب فیض کا کلام سننے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ یعنی قول فیض کے ہوں گے آواز ہماری استاد اقبال بانو کی۔ اگر اردو شاعری کی اصطلاح میں بات کریں تو لوگ کہیں گے یہاں پر قتل ہونے کے سب سامان بہم ہیں۔ تاہم ان محفلوں کی یہ بھی ایک روایت بن گئی ہے کہ سرود و خوانی سے پہلے متعلقہ شاعر کے متعلق حاضرین کو کچھ بتایا بھی جائے۔ اس کام کے لئے ہمارے اچھے میزبان ... اور مریم بی بی نے مجھے چنا اور چند روز پہلے انہوں نے ٹیلی فون پر مجھے اطلاع دی کہ آج رات مجھے یہ خدمت انجام دینی ہوگی۔ اس انتخاب کا سبب یہ ہے کہ میں اس محفل میں فیض کا سب سے پرانا دوست ہوں۔ ہماری ادبی، سیاسی اور ذاتی زندگی کی راہیں کافی مدت تک ایک یا یکساں رہی ہیں۔ ہم نے ایک ساتھ مل کر بہت سے کام کئے۔ ایک مقصد یا نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے کبھی بڑی دشوار اور تکلیف دہ اور بہم "تاریک راہوں" سے کبھی پرافشاں اور پیچیدہ پگڈنڈیوں سے گذرے ہیں، کبھی لطف اور کیف کے گلستانوں میں ساتھ رہے ہیں۔

لب پہ حرفِ غزل دل میں قندیلِ غم

لیکن اس قرب کے باوجود جو ہمارے مابین ہے ان الفاظ کو لکھتے وقت میں سخت الجھن میں مبتلا ہوں۔ فیض کا تقریباً سارا کلام ان کے چار مجموعوں میں ہے۔ نقشِ فریادی، دستِ صبا، زندان نامہ اور دستِ تہِ سنگ۔ یہی ان کی تخلیقی زندگی کی مکمل داستان ہے۔ خوش قسمتی سے ہم میں سے بہتوں نے جسے بار بار پڑھا ہے۔ یہ ان کے اپنے لفظوں میں بیان کی ہوئی داستان ہے۔ اصل، سچی، اندرونی، نجی، دلچسپ اور بڑی خوبصورت داستان۔ اس کے علاوہ اور اس سے بہتر میں یا کوئی دوسرا شخص کیا کہہ سکتا ہے؟ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ آخر لوگ کسی فن کار کی خارجی روزمرہ کی زندگی، اس کے عادات و خصائل، اس کی سماجی حیثیت، اس کی چال ڈھال، اس کے بات کرنے یا شعر پڑھنے کے انداز، وہ کہاں پیدا ہوئے، اس نے کتنی اور کہاں تعلیم پائی۔ علانیہ اور خفیہ کتنی عورتوں سے اس نے محبت کی۔ اس کا سیاسی اور سماجی نقطۂ نظر کیا ہے اور اسی قسم کی بہت سی باتیں معلوم کرنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں۔ یقیناً ہم ان باتوں کے معلوم ہو جانے کے بعد اس فنکار کے کردار کو سمجھ لیں گے اور یہ بھی جان لیں گے کہ اس پر کیسے کیسے اثرات پڑے جس نے اس کے فکر و نظر کو متاثر کیا۔ یہ بھی جان لیں گے کہ وہ کیسا آدمی ہے لیکن دانے اور مٹی اور ہوا اور پانی اور سورج کی روشنی کے بارے میں سب کچھ معلوم کرنے کے بعد بھی ہم پھول اس کے رنگ کی دل آویزی، اس کی پنکھڑیوں کی نرمی اور ملائمت اس کی اُڑتی ہوئی مہک یعنی اس کی مجموعی لطافت اور اس کے حسن کا اندازہ کیسے لگا سکتے ہیں؟ وہ بانو انہی چیزوں کے میل سے ہے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے لیکن ان سے کسی قدر مختلف ہے۔

انسان اخلاق کے میدان میں عام طور پر ایک بات کو سخت ناپسند کرتے ہیں اور وہ ہے قول اور عمل کا تضاد۔ یعنی ہم کہیں کچھ اور دعویٰ کریں کچھ اور اور عمل کریں کچھ اور۔ ہمارا دیس رشیوں منیوں، صوفیوں اور اولیائے اللہ، درویشوں، بھگتوں، اور مہاتماؤں کا دیس ہے۔ لیکن ہمارے ہی دیس میں بگلا بھگت کی اصطلاح بھی رائج ہے اور ہم میں سے اکثر نے خود گذشتہ تیس چالیس برس میں یہ ماجرا دیکھا کہ ہمارے ملک میں ایک خاص قسم کی ٹوپی اور لباس جو کبھی دیش بھگتی اور پاکیزگی اور انکساری کی علامت سمجھے جانے لگے اب عام



ہندوستانیوں کی نظروں میں بالکل ان کے متضاد باتوں کے نشان سمجھے جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان اور پاکستان بلکہ ان ملکوں کے باہر بھی جہاں فیض کے متعلق لوگوں کو علم ہے فیض کی غیر معمولی مقبولیت اور لوگوں کو ان سے والہانہ محبت کا ایک سبب ان کی شاعری کی خوبیوں کے علاوہ یہ بھی ہے کہ لوگ فیض کی زندگی اور ان کے عمل، ان کے دعوؤں اور ان کے اقوال میں تضاد نہیں دیکھتے۔ گو کہ میری رائے میں اگر یہ تضاد ہوتا بھی تب بھی اس وجہ سے کہ فن کی دنیا کے قوانین، مروجہ اخلاقی قوانین سے اگر مختلف نہیں تو دوسری ہی سطح کے ہوتے ہیں ان کی شعری حیثیت میں کوئی فرق نہ آتا۔

میں مثال کے طور پر چند واقعات آپ کو بتانا چاہتا ہوں فیض ۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو لاہور میں اپنے مکان سے اچانک گرفتار کر لئے گئے۔ اس وقت وہ پاکستان کے دو سب سے اہم اخباروں پاکستان ٹائمز اور امروز کے ایڈیٹر تھے۔ ان کے ساتھ پاکستانی فوج کے چیف آف دی جنرل اسٹاف جنرل اکبر خان اور کئی دوسرے فوجی افسران بھی بڑے ڈرامائی انداز میں گرفتار کر لئے گئے۔ سارا پاکستان ہل گیا۔ اخباروں میں روز یہ افواہیں شائع ہونے لگیں کہ ان سب لوگوں کو فوجی بغاوت کی سازش کے جرم میں فوراً گولی مار دی جائے گی۔ میں اس وقت لاہور میں تھا اور مجھ سے لوگوں نے آکر بتایا کہ کسی کو اس کا علم نہیں فیض کس جیل میں ہیں۔ کئی ہفتے تک ان کی بیوی اور بچیوں کو بھی اس کا علم نہ تھا۔ نہ کسی کو فیض سے ملنے کی اجازت تھی۔ یہ بھی سنا گیا کہ فیض کو جیل میں جسمانی ایذا پہنچائی جا رہی ہے۔ (بعد کو معلوم ہوا کہ یہ بات غلط تھی) البتہ دوسری باتیں صحیح تھیں یعنی وہ بالکل تنہا اور تکلیف دہ حالات میں رکھے گئے تھے۔ کوئی کتاب (سوا قرآن مجید کے) اخبار رسالے یا کاغذ، قلم دوات تک ان کو نہیں دیا گیا تھا۔ نہ خود کچھ لکھ سکتے نہ کسی کو کوئی خط وغیرہ بھیج سکتے۔ مختصر یہ کہ حالات بہت ہی روح فرسا تھے۔ انہیں حالات میں فیض نے وہ اپنا مشہور قطعہ کہا ہے

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے!
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے!
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے!

اور اسی مضمون کی وہ غزل بھی کہی۔

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے	جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
ہاں تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی!	ہاں اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے
مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیٔ مے سے	تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے

میں نے فیض کا یہ کلام خود ان کی زبانی حیدرآباد سندھ کے جیل میں سنا۔ اس لئے کہ ان کی گرفتاری کے تقریباً تین مہینے بعد مجھ کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔

اور راولپنڈی سازش کیس کے کل قیدی ایک اسپیشل ٹرین میں لاہور سے حیدرآباد سندھ پہنچائے گئے۔ یہ اسپیشل ٹرین اور اس کا سفر بھی عجیب و غریب اور دراصل اسپیشل تھا۔ ہم پندرہ قیدی ایک ہی ٹرین کے الگ الگ ڈبوں میں تھے۔ ہر ایک قیدی دو اسٹین گن سے مسلح سپاہیوں اور ایک انسپکٹر پولس کے ساتھ فرسٹ کلاس کے ایک ڈبے میں حراست میں تھا۔ ہم ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے تھے اور نہ ہم کو یہ پتہ تھا کہ دوسرے ڈبے میں کون ہے۔ لیکن یہ موقع ان باتوں کے بیان کرنے کا نہیں اور نہ اب اس کی کوئی خاص اہمیت ہے جیل کے اندر ہماری ملاقات ہوئی اور جب ہم نے اپنی آپ بیتیاں سنانے کے بعد فیض سے پوچھا کہ شاعری کا کیا حال ہے تب انہوں نے ہم کو اپنی یہ تازہ چیزیں سنائیں۔ کاغذ قلم نہ ہونے کی وجہ سے ان تین مہینے میں کیا ہوا۔ کلام دراصل لوحِ دل پر ہی لکھا ہوا تھا۔ حیدرآباد میں جیل قلم اور کاغذ رکھنے کی اجازت ملی تب یہ کلام صاف میں قلم بند کیا گیا۔

حیدرآباد سندھ کے جیل خانے میں ہم تقریباً دو سال رہے۔ ایک اسپیشل ٹریبونل جو جیل کے اندر ہی بیٹھتا تھا۔ اس کے سامنے ہم کو روزانہ پیش ہونا پڑتا تھا اور ہم وکیل سرکار کی بحث اور جرح اور صفائی کے وکیلوں کا جواب سیکڑوں گواہوں کی گواہیاں، یہ سب سنتے رہتے تھے۔ عام طور پر یہ چند گھنٹے نہایت بور کرنے والے ہوتے تھے۔ ملزموں کے کٹہرے میں ہم سب پندرہ ملزم دو صفوں میں بیٹھتے تھے۔ ہم اور فیض آخری صف کے بائیں سرے پر بیٹھے اور فیض پاس پاس بیٹھے سرگوشیاں کرتے رہتے اور سامنے پڑی ہوئی کاپی پر کبھی کارٹون بناتے کبھی گواہوں کی شہادت پر نوٹ لیتے۔ ہم تعزیرات پاکستان کی بے شمار دفعات میں ماخوذ تھے جن میں سب سے سنگین فوجی بغاوت کے ذریعہ حکومت پاکستان کا تختہ الٹنے کی سازش اور فوج میں بغاوت پھیلانے کا الزام تھا جس کی سزا موت تھی۔ ہمیں اس وقت ہنسی آتی تھی جب ہمارے خلاف جھوٹی گواہیاں پیش ہوتی تھیں ان موقعوں پر کبھی کبھی ہم یا ہمارے ساتھی بے ساختہ ہنس دیتے جو عدالت کی توہین کے مترادف سمجھا جاتا۔ اس پر اسپیشل ٹریبونل کے صدر جسٹس عبدالرحمٰن جن کو ہائی بلڈ پریشر کی شکایت تھی غصے سے بالکل لال پیلے ہو جاتے (وہ بہت گورے چٹے تھے) اور زور زور سے چلا کر ہم کو خاموش رہنے کی ہدایت کرتے اور اگر اس پر بھی کسی کو اور زیادہ ہنسی آتی تو وہ دھمکی دیتے تھے۔

اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے والے

جج کو ناراض کر لینا اور بھڑکانا کوئی دانشمندی نہیں تھی لیکن ہم بھی آخر مجبور تھے۔

ان دنوں ہم لوگ ہر پندرہ دن پر چھٹی کے دن ایک طرح مشاعرہ کرتے تھے جس کے لئے شعر کہنا ہر قیدی کے لئے لازمی تھا۔ دراصل یہ فیض کے خلاف ایک سازش تھی تاکہ ان کو شعر لکھنے پر مجبور کیا جائے۔ ان ہی حالات میں فیض نے وہ غزل لکھی



ہم آئے ہو نہ شب انتظار گذر رہی ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گذری ہے

اور آپ اب بھی یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس مشہور شعر کے محرک کون سے حالات تھے۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

ان ہی دنوں ایک دن ہم نے اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ ۱۱ مارکل میں ایک خوبصورت لڑکی جس کے کندھوں پر بالوں کی گھٹا چھائی تھی ہنستی ہوئی گزر رہی تھی۔ ایک مولانا کسی دکان پر بیٹھے تھے۔ ان کو یہ منظر دیکھ کر خوش ہونے کے بجائے سخت غصہ آیا اور اس بے پردگی میں انہیں اسلام کی توہین نظر آئی۔ چنانچہ وہ ایک قینچی لئے ہوئے اپنی جگہ سے کودے اور لپک کر اس بیچاری لڑکی کی زلفیں کاٹ دیں۔ خیر اس واقعہ پر مولانا پکڑے گئے اور ان کو سزا ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے فیض اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنی غزل میں یہ شعر لکھا۔

دلبری ٹھہری زبانِ خلق کھلوانے کا نام
اب نہیں لیتے پری رو زلف بکھرانے کا نام

ظاہر ہے کہ ان حالات میں سب سے زیادہ روحانی تکلیف ہمیں اس وقت ہوتی تھی جب ہم پر غداری یا وطن دشمنی کا الزام لگایا جاتا تھا۔ اس کی صفائی ہم اس عدالت میں کیا پیش کرتے جو بنائی ہی اس لئے گئی تھی کہ خاص قانون کی مدد سے کر راولپنڈی سازش کے مقدمے کے لئے ایک خاص قانون بنایا گیا تھا جس کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ یہ مقدمہ خفیہ طور پر چلایا جائے گا اور اس کی روداد کے کسی حصے کو بھی مشتہر کرنا بجائے خود جرم ہوگا۔ تمام ملزموں کو کسی نہ کسی طرح سزا دی جائے لیکن فیض چپ چاپ بیٹھے اور اپنی متعدد نظموں، غزلوں، قطعات اور مفرد اشعار میں انہوں نے ایسی بے مثال صفائی پیش کی کہ ان پر الزام لگانے والے خود ہی مجرم نظر آنے لگے۔ اس قسم کی نظموں میں "دو عشق" اور "نثار میں تیری گلیوں پہ" خاص طور پر ان کیفیتوں کا اظہار کرتی ہیں۔ "دو عشق" میں فیض نے نئے اور بے مثال استعاروں کا استعمال کیا ہے

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دلِ زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دستِ صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں باہیں

تنہائی کی کیفیتوں کا بیان ہر شاعر اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے اور آج کل کے بعض شاعروں اور مفکروں نے تو اس کو باقاعدہ فلسفہ بنالیا ہے اور اپنی مفروضہ تنہائی کو اتنی اہمیت دیتے ہیں جتنا ایک خدا کو ماننے والے مسلمان اللہ تعالیٰ کی تنہائی اور یکتائی کو دیتے ہیں لیکن آپ ذرا فیض کی اس دردناک لیکن حسین تنہائی کا تصور کیجئے جس میں دستِ صبا کی نرمی اور ٹھنڈک محبوبہ کے ہاتھوں کی یاد دلاتی ہے اور چاند کے خم کو دیکھ کر دوست کی غیر موجودگی میں اس کے گلے میں باہیں ڈال دینے کو جی چاہتا ہے۔

انسانی آزادی اور انسانی وقار کی قدر و منزلت، انسانی رشتوں میں خلوص و محبت، شرافت اور پاکیزگی، انسان پر ہونے والے ہر قسم کے جبر و ظلم و استحصال بلکہ فرعونیت کے خاتمے اور ان مقاصد اور اس نصب العین پر پہنچنے کے لئے ایسی کاوش اور سپردگی جیسی کہ عاشق تقریباً محویانہ طور پر اور سخت روحانی، نفسانی اور جسمانی مجاہدے مجادلے کی کیفیت میں کرتے ہیں۔ فیض کی بہترین شاعری کے موضوعات یہی ہیں۔ ان کا لہجہ کبھی نرم، ملائم اور کبھی سخت، تند، تیز اور رواں دواں۔ ان کے علائم اور تمثیلات کبھی سادہ، کبھی پیچیدہ بات کبھی براہ راست اور خطیبانہ کبھی تہہ بہ تہہ ہزاروں پردوں اور نقابوں میں ڈھکی چھپی۔ مثلاً دیکھئے اس قطعہ کا آہنگ کتنا بلند اور پُر شور ہے۔

بہائے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی خجل
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاجِ شہی
ہمیں سے سنتِ منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کج کلہی

اور کبھی اس بات کو آہستہ سے مسکرا کر یوں کہہ دیتے ہیں۔

عجزِ اہلِ ستم کی بات کرو
عشق کے دم قدم کی بات کرو
بزم ثروت کے خوش نشینوں سے
عظمتِ چشم نم کی بات کرو
جان جائیں گے جاننے والے
فیض فرہاد و جم کی بات کرو

فیض کی سہل اور سادہ شاعری کی بات آئی تو ایک دلچسپ واقعہ اور سن لیجئے۔ حیدرآباد سندھ کے جیل میں ہم پر پہرہ دینے کے لئے جو وارڈر مقرر تھے ان میں ایک صاحب تھے جن کو سب لوگ نواب صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ حضرت گورے چٹے اور کافی موٹے تازے تھے۔ ہر وقت پان کھائے رہتے تھے اور سندھی اور پنجابی پہرہ داروں کے درمیان ویسی ہی وردی میں ملبوس ہونے کے باوجود اپنی صاف و شستہ اردو اور اس کے لہجے کی وجہ سے فوراً پہچانے جا سکتے تھے۔ دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ وہ لکھنؤ کے ہیں اور شیش محل کے نوابوں کے خاندان کے۔ ویسے پاکستان پہنچ کر یوپی اور حیدرآباد دکن سے آئے ہوئے مہاجرین میں سے بہت سے لوگ نواب بن گئے ہیں۔ بہرحال ان صاحب کو جب معلوم ہوا کہ فیض شاعر ہیں اور ہم لکھنؤ کے ایک جانے بوجھے شیعہ خاندان کا فرد تو ہم دونوں میں خاص دلچسپی لینے لگے۔ ہم بھی وارڈروں کی تلاش میں رہتے تھے۔ جن کے جذبۂ ہمدردی سے فائدہ اٹھا کر ہم ان سے چھوٹے موٹے غیر قانونی



کام لے سکیں (جسے جیل کی اصطلاح میں تگڑم کہتے ہیں) ظاہر ہے کہ نواب صاحب شاعر بھی تھے۔ اپنی ہلکی پھلکی غزلیں فیض کو سنانے اور فیض سے کلام سنانے کی فرمائش کرتے لیکن فیض کا کلام سن کر تھوڑی سی رسمی تعریف کرکے چپ سادھ لیتے۔ ایک دن انہوں نے چپکے سے مجھ سے کہا حیدرآباد میں ایک مشاعرہ ہونے والا ہے۔ فیض صاحب ذرا اچھی سی غزل لکھ دیں (یعنی ویسی نہیں جیسی فیض عام طور سے کہتے ہیں جو نواب صاحب کو زیادہ پسند نہیں آتی تھی) تو بڑا اچھا ہو اور نواب صاحب اُسے مشاعرے میں پڑھ دیں گے۔ میں نے فیض کو نواب صاحب کا پیغام پہنچا دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ اس لکھنؤ والے پر تمہارے کلام کا کوئی رعب نہیں پڑا ہے۔ اگر اسے خوش رکھنا ہے تو اس کے مطلب کی کوئی چیز کہو۔ فیض بولے بھئی تم لکھنؤ والوں کو خوش کرنا میرے لئے بہت مشکل ہے۔ آخر میں سیالکوٹ کا پنجابی ہوں لیکن چلو کوشش کرتے ہیں۔ البتہ نواب صاحب سے کہہ دو اس کے عوض میں ہمارے لئے ایک شراب کی بوتل فراہم کریں۔

نہ گل کھلے ہیں نہ اُن سے ملے نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اس کے بہار گذری ہے

دو ایک دن ہی میں فیض نے نواب صاحب کی فرمائش پوری کردی اور یہ غزل لکھی ؎

تری صورت جو دل نشیں کی ہے
آشنا شکل ہر حسیں کی ہے!

اس غزل میں نواب صاحب کی خاص پسند کے یہ دو شعر تھے ؎

شیخ سے بے ہراس ملتے ہیں
ہم نے توبہ ابھی نہیں کی ہے
ذکرِ جنت بیانِ حور و قصور
بات گویا یہیں کہیں کی ہے

نواب صاحب بھی وعدے کے پکے نکلے۔ ایک دن شام کو چپکے سے جن کی ایک بوتل جیب میں رکھ لائے اور میرے حوالے کردی۔ گرمیوں کے دن تھے ہم نے بڑے اہتمام سے اُسے شام کے وقت شربت میں ملا کر پی۔ لیکن اس دن کے بعد پھر جیل میں پینے سے توبہ کرلی۔ شراب دراصل آزادی اور خوش دلی کے ماحول میں پینے کی چیز ہے۔ دل گرفتگی اور حبس اور سو ہزار محرومیوں کے عالم میں اس کے اثر سے دل کی خرابی میں اضافہ ہوتا ہے۔

دیر ہو رہی ہے۔ اب مجھے ختم کرنا چاہیئے۔ ان حکایتوں اور لطیفوں کی تو پوری کتاب لکھی جاسکتی ہے اور آپ شاید انہیں سن کر بور بھی نہ ہوں۔ فیض کو اتنا جو چاہتے ہیں۔ لیکن ختم کرنے سے پہلے میں آپ کو پھر یاد دلادوں کہ میری رائے میں فیض کی شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لئے ان کی شاعری کو ان واقعات اور حالات اور محرکات سے وابستہ کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے (حالانکہ انہوں نے اس کی تحلیل میں مدد کی ہے کہ ان کی تخلیق ایک خاص سرزمین میں پیوست ہونے کے باوجود اس سے الگ مختلف اور منفرد ہے۔ اس شعر و شاعری کی محرکات اس کا لازمی جزو تھیں) لیکن فیض کے تخلیقی حِس سے گذرنے کے بعد ان کی حیثیت ثانوی اور فروعی ہوجاتی ہے اور جو چیز ہم کو ملتی ہے وہ ہے فیض کی روح اور نفس اور فکر اور تخیل کی تعمیر کا حیرت ناک اچھوتا پن اور بے مثل صناعی اور حسن و لطافت اور پاکیزگی اور طہارت کی ایک بے پایاں جستجو۔ جیسے کہ بہار کے موسم میں مختلف پھولوں سے روشن کسی باغ میں ملی جلی انجانی مہک سے بھری عطر بیز ہواؤں کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں ہوتی ہے۔ آپ اسے محسوس کرسکتے ہیں اس کو پکڑنا اور سمجھنا سا مشکل ہے اس لئے کہ ان کی جیسی اور کوئی دوسری چیز نہیں اور نہ ہی فن کا عروج ہے۔

فیضؔ

یونہی گاتا رہوں گاتا رہوں تیری خاطر
گیت بُنتا رہوں بیٹھا رہوں تیری خاطر
پر مرے گیت ترے دُکھ کا مداوا ہی نہیں
نغمہ جرّاح نہیں، مونس و غم خوار سہی
گیت نشتر تو نہیں، مرہمِ آزار سہی
تیرے آزار کا چارہ نہیں، نشتر کے سوا
اور یہ سفّاک مسیحا مرے ہاتھ میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی روح کے قبضے میں نہیں
ہاں مگر تیرے سوا، تیرے سوا، تیرے سوا



فیض احمد فیض

کی غزل

ڈاکٹر سہیل احمد

اردو میں فیض کا ظہور رومان گلشن کی طرح پایا تہذیبی اور اس ... اجتماعی احساسات اور ذاتی تجربات کو ملا کر ایک نئے لہجے میں ڈھلی ہیں۔ فیض کے بارے میں ایک بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ انہوں نے نظموں میں بھی غزل ... دوسرے ادوار کو غزل میں ایک نئے اسلوب کا مستقل رو پی قرار دیا جاتا ہے ان کی شاعری میں سماجی شعور بھی دیر تک آتی ہے اور عالمی حالات کے اثر اور حوادث کے تسلسل مراحل پر فیض کا رد عمل مظلوم طبقوں کے لئے ان کی محبت اور ان کے دیگر معتقدات کا ساتھ ... فیض کی شاعری ... مددگار ہیں یا ہم فیض کے شعری تجربے ... کی ... کو سمجھتے ہوئے سماجی پس منظر اور عقائد کے ساتھ ضرور ... ان کی شاعری کا اسلوبیاتی مطالعہ بھی ہو جانا ہے اور ایک تحریک کے ساتھ وابستگی ... ان کی بعض روایتوں کے ساتھ ساتھ ... مطالعہ ہونا چاہیئے۔ اس کی تعلیم ہو جانی چاہئیے اس حقیقت کو تو عام طور پر بیان کیا گیا ہے کہ فیض کی شاعری واقعیت سے مملو ہے مگر ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھا جانا ہے کہ فیض نے اس واقعیت کو رمزیت میں ڈھال دیا ہے۔ ان کے لہجے کی سرشاری "تلخی ایام سے فرار نہیں" سے تابع ہو کر اس سے ساتھ صدہا حاصل کرنے کی کاوش ہے

فیض کی غزل گوئی کی بعض رمزیت اردو غزل کا ایک سا رجحان بن کر ابھری اور اس شمع سے کئی شمعیں جلی گئیں مگر خود اس شمع میں مختلف رجحانات کی جو روشنیاں آئیں مل کر رنگین دائرے بنا دیں اس کی تحسین کے ● اردو غزل کی بعض روایتوں تک جا پہنچے گا ۱۸۵۷ء کے بعد جب علمی اور اصلاحی رجحانات نے ہماری تہذیب کے ہر گوشے پر ... معیار کی تو کچھ نئی سمتیں ظاہر ہونے کے ساتھ بہت سی سمتیں نگاہوں سے اوجھل بھی ہو گئیں معاشرتی احوال میں کچھ ایسی اتھل پتھل تھی کہ عقلیت اور اصلاح پسندی کے دائرے سے آگے جانا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ ان رویوں کی وجہ سے ادب اور ... کی حدود کا بھی از سر نو تعین کرنے کی کوشش کی گئی حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں غزل کی معنویت کو تسلیم کیا مگر ساتھ ہی یہ کہا کہ غزل میں کچھ علامات کی بار بار تکرار نے ان کو ... کر دیا ہے کہ ان میں کوئی حقیقی معنی موجود نہیں رہے خود حالی نے اخلاقی اور ... مضامین کے ذریعے غزل کی صنف کو نئی جہت دینے کی کاوش کی جو ان کے دھیمے اور ہمدردانہ لہجے کی وجہ سے کہیں کہیں پُر تاثیر ہے مگر کہیں سپاٹ بھی ہو جاتی ہے اس سے اگلا مرحلہ وہ آیا جب مغربی تنقید کے بعض اصولوں کو لے کر غزل کی صنف ہی کو رد کر دیا گیا غزل کی علامتوں کو بظاہر غیر منطقی کیفیات اور اس کی پریشان



خیالی کے نام پر یہ کہا جانے لگا کہ یہ صنف جدید احساسات کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ ایک طرف تو یہ ہاؤ ہو تھی اور دوسری طرف رسمی غزل گوئی کے درمیان کچھ ایسی آوازیں بھی اٹھتی رہیں جو غزل کو سنبھالا دے کر اس میں تازگی پیدا کرتی رہیں یہ چیز جسے غزل کی نشاۃ الثانیہ کہا جاتا ہے، اپنی کچھ ابتدائی شکلوں سے گزرتی ہوئی حسرت کی کاوشوں میں ایک باقاعدہ رجحان بنتی نظر آتی ہے۔ اسی دور میں اقبال نے غالب کے فکر انگیز لہجے کے بعض پہلوؤں کو اپنے فلسفیانہ اسلوب کی تہہ دار ابعاد سے ملا کر اردو غزل کو فکری لحاظ سے نئی جہتیں بخش دیں۔ اقبال اور حسرت کے بعد فیض نے غزل کا ایک نیا امکان ظاہر کر کے اس صنفِ سخن کو جدید دور کے لیے نہ صرف قابلِ قبول بلکہ ناگزیر بنا دیا ہے اسی زمانے میں فراق نے جدید احساسات کی لطیف ترین معنویتوں کو غزل میں اس انداز سے سمو دیا کہ غزل گوئی کی ایک اور نئی راہ سامنے آ گئی ان تمام شعراء کے اپنے امتیازی رجحانات ہیں مگر بحیثیتِ مجموعی کچھ دوسرے شعراء مثلاً یگانہ فانی اور اصغر کے ساتھ ان کا احساس یہ ہے کہ انہوں نے بیسویں صدی کے شعور کی تبدیلیوں کے مختلف مراحل کو غزل کا حصہ بنا دیا

خیر تو ذکر تھا فیض کی غزل کا فیض نے جہاں اقبال سے یہ سیکھا کہ قدیم علامتیں اور تلازمات ایک خلاق فن کار کے ہاتھوں میں بالکل نئی طاقت سے ظاہر ہو سکتے ہیں نیز غزل میں فکر کی عمیق ترین صورتیں منطبق ہو کر کائناتی وسعتوں اور عظمتِ انسانی کے تصورات دکھانا بھی ممکن ہے وہاں حسرت سے انہوں نے یہ ادا سیکھی کہ محبوب کے پیراہن، چلمنوں اور رنگِ حنا جیسے عناصر جنہیں لکھنوی شاعری کے رسمی نمائندے پامال کر چکے تھے نئی احساساتی دھنوں کے ساتھ استعمال ہو سکتے ہیں پھر حسرت نے اردو کے کلاسکی غزل گو شعراء کے انتخاب مرتب کر کے جس سے غزل گوئی کے مختلف لہجوں سے نئے قارئین کی شناسائی کے لئے ایک نیا باب کھلا خود حسرت کے ہاں ان رنگوں کو ملانے کی بھی کاوش نظر آتی ہے اِس پس منظر میں دیکھئے تو فیض کے مخصوص طرزِ احساس اور ان کے ہاں حواسِ خمسہ کی مختلف صورتوں کا دائرہ حسرت اور جرأت کے حوالے سے عاشقانہ شعوری طور پر معشوق کی حیثیت تک پھیلتا دکھائی دیتا ہے۔ رنگ، فلک کی سیاہی میں چاند کا ہونا محبوب کے پیراہن کا عاشق کو مسحور کرنا ہے۔ حسن یا مرہ کے سامنے سامنے جس سامنے کا استعمال بھی ان کے ہاں کافی ہے اور "خوشبو" یا "بو" کا لفظ ان کے ہاں کئی تلازمات کو ابھارتا ہے مصحفی کو فراق نے غروبِ آفتاب کے وقت کے رنگوں سے تشبیہ دی ہے فیض کے ہاں بھی شعری تمثالیں شفق کی سرخی یا جھیل کی سطح پر چاندنی کا رنگ لئے ہیں حسرت نے عشقیہ تجربے کے بیان میں واقعیت کا جو نیا لہجہ پیدا کیا تھا وہ بہت تازگی لئے ہوئے ہے مگر سیاسی رنگ میں ان کی واقعیت کی دستاویزی اہمیت اپنی جگہ پھر بھی یہ واقعیت کہیں کہیں کھردری نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے حسرت پر اپنے ایک مضمون میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ حسرت کے ہاں سیاسی معنویت صرف ان اشعار میں نہیں جو واقعیت کا رنگ لئے ہوئے ہیں بلکہ انہوں نے غزل کے مختلف تلازمات کی رمزی کیفیات کو بھی سیاسی واقعات کے بیان کے لئے استعمال کیا ہے۔ یہ بات قابلِ قبول ہے اور حسرت کی غزل کی سیاسی معنویت کے دائرے کو پھیلاتی بھی ہے مگر یہاں یہ کہنا بے محل نہیں کہ حسرت کے ہاں یہ رمزی کیفیت جاندار ہونے کے باوجود ذرا سے خلا کا احساس دلاتی ہے جیسے ایک لہجے کا امکان ظاہر ہو چکا ہے مگر اس کی تکمیلی صورت بس کہیں کہیں ہی ظاہر ہو سکی ہے اس امکان کو جیسے فیض کا انتظار تھا اور فیض نے اس امکان کے بعض نادریافت شدہ پہلوؤں کو اتنا چمکا دیا کہ اب یہ اسلوب عموماً ان سے مخصوص سمجھا جانے لگا فیض کے لئے کٹھن مرحلہ نئے تجربوں نئے احساسات اور نئی عصری صداقتوں کے لئے مناسب علامتیں تلاش کرنے کا تھا۔ فیض نے یہ مرحلہ اپنی مہارت سے طے کیا کہ یہ اوپر سے تھوپی گئی شے معلوم نہیں ہوتا

فیض کے شعری طریقِ کار نے ترقی پسند تحریک کے شاعروں کی ایک پوری نسل کے لیے غزل کو نامیاتی بنا دیا اس رجحان کے تحت پھسپھسی شاعری بھی بہت ہوئی مگر ایک نیا رجحان ضرور ابھرا۔ فیض کی رجائیت آبرو بن کے دلوں میں اتر گئی ان کا رچا ہوا مہذب لہجہ جس پر اردو کی عشقیہ شاعری کے بعض لطیف عناصر کی چھوٹ پڑ رہی تھی چیخے چنگھاڑتے اسلوب سے زیادہ پُرتاثیر نکلا ان کی رمزیت کی تہہ داری واقعیت کے یک رخے اسلوب سے زیادہ پائیدار ثابت ہوئی

غزل میں تلازمات کے جو مختلف دائرے ہیں ان کے عظیم خزانے سے آگ لے کر فیض نے اپنی غزلوں کی مشعلیں روشن کیں ظاہر ہے انہیں اپنے سیاسی معتقدات اور اپنی احساساتی کیفیات کے لئے جن عناصر کی تلاش تھی ان کی توجہ ان سے مماثل تلازمات کی طرف رہی فیض نے بطورِ خاص مندرجہ ذیل تلازمات سے زیادہ کام لیا ہے۔

رند، ساقی، پیمانہ، انجمن، محفل، کوئے یار، واعظ، ناصح، محتسب، قاتل، زنداں، قفس، دار و رسن، طوق، گلشن، خار و خس، سرو و سمن، خزاں، بہار، گل، رات، چاند، تارے، صبح، صبا، جنوں، رہرو، رہبر، عدو، شام، زلف، لب، رخسار، حرم، گناہ، مکاں، رقص، باغباں، پیراہن

ان تلازمات کے وسیلے سے فیض نے آزادی اور حریت کی تڑپ، جبر اور گھٹن کے ماحول کی عکاسی، آنے والے روشن مستقبل کی امید اور اپنے عصر کے کتنے ہی حوادث اور واقعات کو غزلیہ لہجے میں ڈھال دیا ہے۔ بیسویں صدی میں اردو غزل کی تجدید کے ضمن میں فیض کے شعری طریقِ کار کی بھرپور اہمیت محسوس ہوتی رہے گی اور غزل کا مؤرخ فیض کی اس تاریخی اہمیت کو نظرانداز نہیں کر سکے گا۔

● ● ● ●





ایگزانڈر سرکوف ۔ ترجمہ: سحر انصاری

ایک حوصلہ مند دل کی آواز

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

ماسکو میں دسمبر کی ایک سرد اور دھندلی شام کو زندگی میں پہلی بار فیض کے ان ولولہ خیز اشعار نے میرے دل میں اضطراب پیدا کیا تھا۔ ۱۹۵۴ء کا سال رخصت ہو رہا تھا اور برف کا ایک طوفان پشکن کے سرمئی مجسمے کے گرد لہرا رہا تھا۔ پہرہ دار سپاہی چوراہوں پر کھڑے سردی سے کانپ رہے تھے۔ ماسکو کے ایک گرم اور آرام دہ فلیٹ میں مشرقی سوویت کی روسی جمہوری ریاستوں کے شعرا اور بیرونی مشرقی ممالک سے آئے ہوئے مہمانوں سے محفل میں ہندوستان کے شاعر علی سردار جعفری ایک ناآشنا زبان کے اشعار تقریباً گنگنانے کے انداز میں پڑھ رہے تھے اشعار سب کے دلوں کو مسحور کرتے جا رہے تھے۔ ان اشعار میں محبت کے نازک جذبوں کی کسک بھی، زنداں کی تنہا کوٹھڑی میں مقید انسان کا غم تمنا تھا اور ایک انقلابی کا شعلہ خیز غیظ و غضب بھی تھا۔ یہ اشعار فیض احمد فیض کے تھے جو ہماری صحبت میں شامل نہ ہو سکے تھے اور ماسکو سے بہت دور منٹگمری جیل میں تنہائی کے شب و روز بسر کر رہے تھے۔ اسی لمحہ شاید وہ سلاخوں سے باہر کا منظر دیکھ رہے ہوں گے، وہ درخشندہ تاروں سے معمور آسمان کو تک رہے ہوں گے یا پھر اپنے حوصلہ مند دل پر سوز کی گہرائی میں جنم لینے والے مصرعے سرگوشی کے انداز میں دہرا رہے ہوں گے

تین ماہ بعد . . وقت وہی تھا جو ماسکو میں گذشتہ موسم سرما کی ہواؤں کی موجودگی میں تھا . . . میں نے ایک بار پھر ایسے اشعار سنے جو دل کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں اور ان کے تاثر کی توانائی ہی سے مفہوم اور منزلیں طے ہونے لگتی ہیں۔

اس وقت میں دہلی میں تھا۔ مارچ کا آغاز تھا۔ سیاہ جنوبی آسمان پہ بے شمار تارے جھلملا رہے تھے اور اس پس منظر میں سدا بہار درخت رات کی دھند میں سادہ نظر آ رہے تھے۔ لال قلعہ کی دور افتادہ اور سنگین دیواروں کے سامنے بیل گاڑیاں خاموشی سے گزر رہی تھیں اور رکشا چھلاووں کی طرح بھاگ رہے تھے وہ سب اس مقام کی سمت رواں دواں تھے جہاں قمقموں سے روشن وسیع و عریض رنگا رنگ پنڈال، سبزے کے قطعات اور بے شمار نرگس پھولوں سے لدے ہوئے نامانوس درخت اپنی بہار دکھا رہے تھے

پنڈال میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا یکے بعد دیگرے شاعر مائیکروفون پر آ رہے تھے اور مشاعرے میں جان پڑتی رہی اور پھر جعفری نے چند ایسی نئی نظموں کا آغاز کیا جو منٹگمری جیل کے تنہا کمرے کی اداس اور سنگین دیواروں میں مقید رہ کر لکھی گئی تھیں

اب فیض وہاں اپنی اسیری کا پانچواں سال گزار رہے تھے

رنگ برنگے پنڈال میں اچانک سناٹا اور ارتعاش پذیر سکوت چھا گیا ہر لفظ صاف سنائی دے رہا تھا ایک ایک لفظ دلوں میں اترتا چلا جا رہا تھا اور ایسے مقامات پر جہاں شاعر کے اشعار احساس کی گہرائی میں ڈوب جاتے اور پھر غیظ و غضب کی بازگشت بن کر ابھرتے تو جیسے سارا پنڈال ایک دم بیدار ہو جاتا اور نغمہ گر کی آواز کے ساتھ ساتھ بڑے جوش و خروش سے داد دینے لگتا

اس وقت میں فیض احمد فیض کے بارے میں کیا جانتا تھا؟

یہی کہ اپنے عوام کو نوآبادیاتی نظام کی غلامی سے آزاد کرانے کی جدوجہد میں وہ جوانی کے زمانے سے ہی تن دہی کے ساتھ شامل ہیں مجھے معلوم تھا کہ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں فاشزم سے اپنی نفرت کے اظہار کے لئے وہ بدیسی اینگلو انڈین فوج میں ایک افسر بن گئے تھے اور جنگ کے بعد کرنل کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے تھے وہ ایک پرجوش صحافی تھے جو نوآبادیاتی شکنجے اور مفاد پرست آقاؤں کی غلامی سے اپنے عوام کو آزاد کرانے کے تصورات کو فروغ دینے کے لئے جان و مال سے سرگرم عمل ہیں

فیض اپنی سیاسی تحریروں اور ایک پرخلوص انقلابی کی حیثیت سے اپنی سرگرمیوں کے ذریعے پاکستان کے بہترین فرزنداں وطن کے دوش بدوش بے غرضی اور جوش و خروش کے ساتھ جدوجہد میں مصروف ہیں رجعت پسند اس باکمال شاعر کی قوتِ صداقت اور توانائی الفاظ سے خوف زدہ تھے چنانچہ عذابِ تنہائی اور جبری بیکاری کا شکار بنانے کے لئے انہوں نے منٹگمری اور حیدرآباد کی جیلوں میں فیض پہ پانچ سال کی طویل اسیری مسلط کر دی تھی لیکن شاعر کے زندہ اور حیات پرور دل کی دھڑکنوں پہ سنگلاخ زنداں کی تاریک رات غالب نہ آ سکی اور نہ ایامِ اسیری کی بے حسی اور



جابر خاموشی ان کے نغموں پر کوئی مہرِ سکوت ثبت کر سکی

زنداں کی سنگین دیواروں میں سے بھی ان کے حوصلہ مند دل سے وہ نغمے بے تاب ہو کر نکلتے رہے جو عوام' زندگی اور مادرِ وطن کی محبت سے لبریز تھے ان کے نغمات کے پیروں کی سرسراہٹ پاکستان اور متعدد دوسرے ممالک کی سرزمین پر سنائی دیتی رہی اور لاکھوں انسانوں کے دلوں کو گرماتی رہی۔

آخر کار رجعت پسندی کی تیرگی اور انقلابی شاعری کی روشنی کی جنگ میں شاعر ہی کامران و فتح مند رہی۔ خطرے اور وہ بھی موت کے مسلسل خطرے سے عبارت پانچ سال کی قید و بند کی صعوبتیں ختم ہوئیں اور محبِ وطن شاعر آزاد ہو گیا ایک بار پھر ماضی کی طرح، بلکہ اس سے بھی زیادہ جوش اور ولولے کے ساتھ اس جدوجہد کو جاری رکھنے کے لئے جس کی خاطر اس نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ اپنے ہم وطنوں کے لئے تمام اقوام کے مابین دوستی کو فروغ دینے کے لئے اور تمام انسانوں کے لئے امن کی فضا پیدا کرنے کے لئے اور ایک رنگ جور و زنجیروں اور ہتھکڑیوں کی گرفت سے آزاد ہو کر وہ زندہ رہا اور وہ لڑائی اور جذبے کی سچائی کے ساتھ اسے شعلہ صفت ممالک فضا میں بکھیرتا رہا۔

۱۹۵۱ء کے موسم خزاں کے بعد ماسکو میں افریقی ایشیائی ادیبوں کا مشہور اجلاس ہوا جس میں فیض نے ایک معتمد وفد کی حیثیت سے شرکت کی۔ وہاں سے پہلی بار میری ملاقات ہوئی۔ اس شاعر سے ملاقات بڑی حسین تھا تصور میں اسے دل میں بسائے ہوئے تھا

فیض کے لئے وہ نسبتاً آزادی کا زمانہ تھا۔ پاکستان میں حکومت کا تختہ الٹ کر غیر جمہوری طاقتوں نے اقتدار سنبھال لیا تھا

ماسکو میں ادیبوں کی انجمن کے ایک کمرے میں ہم بیٹھے ہوئے تھے ہم دونوں نظمیں پڑھ رہے تھے اور روسی زبان میں فیض کی نظموں کا ایک مجموعہ شائع کرنے کی بات چیت کر رہے تھے مگر اتفاقاً ہماری گفتگو کا رخ نظموں سے ہٹ کر اس دور کی سیاست کی طرف ہو گیا

تو پھر مستقبل قریب میں آپ کا کیا ارادہ ہے؟

فیض نے اپنی سیاہ آنکھوں سے، جن کی گہرائی میں قدرے اداسی بھی تھی، میری طرف دیکھا لیکن ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ موجود تھی

بس پہلے تو لندن جاؤں گا، وہاں اپنے بعض دوستوں سے ملوں گا جو ابھی ابھی پاکستان سے آئے ہیں اس کے بعد ظاہر ہے کہ میں کراچی، لاہور، اپنے وطن واپس چلا جاؤں گا . .

"ولیکن آپ جانتے ہیں کہ اب وہاں "

ان کے ہونٹوں کے کناروں پر دبی ہلکی سی مسکراہٹ تھی

ظاہر ہے کہ اس صورت میں تو مجھے وطن ہی واپس جانا چاہئے

تو پھر جیل یقینی ہے . .

"شاید . . . اور اگر کسی بڑے مقصد کی خاطر انسان کو جیل بھی جانا پڑے تو ضرور جانا چاہئے :

"لیکن اگر . . . جیل سے بھی بدتر کچھ ہو تو . . . ؟"

شاعر نے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا جہاں باغ کے وسط میں ہمالیائی کا مجسمہ نصب تھا، سرد اور خزاں زدہ آسمان پر نظر ڈالی۔ مسکراہٹ بدستور موجود تھی چند لمحے کے توقف کے بعد انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں آہستہ سے کہا "اگر جیل سے بھی بدتر کوئی چیز ہوئی تو پھر یقیناً بُرا ہو گا۔ لیکن تم جانتے ہو جدوجہد بہرحال جدوجہد ہے . .

یہ تھا ان کا پُرسکون لیکن پر اعتماد جواب۔

میں اپنی زندگی میں ایسے متعدد افراد سے مل چکا ہوں ان میں سے بہت سے نڈر بے باک اور جرأت مند بھی تھے اور اپنی زندگی کے نصب العین کی تکمیل پر جان و دل سے مہمک بھی وہ ہر قسم کی اذیت یہاں تک کہ ناگزیر موت برداشت کرنے کا بھی حوصلہ رکھتے تھے۔

فیض میں یہ ضبط و تحمل اور یہ اعتماد اذیت کوشی اور موت سے برد آزمائی کی بدولت پیدا ہوا ہے ایک ایسی صفت جو جدوجہد کے لئے خود کو وقف کر دینے والوں کے لئے ناگزیر ہوتی ہے۔

تاہم مصائب و ابتلا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی جو جرأت فیض میں تھی اُس نے میرے سارے وجود کو ڈگمگا دیا۔

فیض کی شاعری کا ترجمہ کرنے کی غرض سے میں نے ان کا ایک ایک مصرع بڑے غور سے پڑھا میری کوشش یہ تھی کہ جہاں تک ممکن ہو سکے ترجمہ شدہ مصرعوں میں ان کے حساس اور حوصلہ مند دل کی دھڑکن برقرار رہے اس کوشش میں یہ صرف ان کے جذبات کا عدہ بیانی زیرِ دم جیسے دوسری زبان میں منتقل کرنا تقریباً ناممکن ہے بلکہ ایک جانباز اور شاعر انسان کا پُرسکون اور واضح ضبط و تحمل میری روح پر گہرے نقش چھوڑنے لگا۔ شاعر، جس نے ایک انقلابی کی حیثیت سے خود اپنی زندگی کو ایک نغمے میں ڈھال لیا اور اسے نغمے کو جدوجہد کا ایک مؤثر ہتھیار بنا دیا ہے جدوجہد کے مراحل سے گزرتے ہوئے مشرق کے ایک ممتاز ترین ترقی پسند شاعر فیض احمد فیض کے نغمات کو سوویت قارئین سے روشناس کراتے ہوئے مجھے بے پایاں مسرت ہو رہی مطالعہ کے دوران فیض کی شاعری میں ابتلائے اسیری کا تاثر بھی محسوس ہوتا ہے جس سے دل اداس ہو جاتا ہے لیکن یہ شعلہ خروش وجہ، اس تاثر پر غالب آ جاتا ہے۔

تیرگی کا استعارہ ان کی شاعری میں بار بار آتا ہے لیکن وہ استعارہ زیادہ تاریک جس میں شاعر کے وطن پر طلوع ہونے والی سحر کے نور افشاں کا خیر مقدم کیا گیا ہے مطالعہ کرنے والا یقیناً محسوس کرے گا کہ آزادی کی محبت اور شاعر کے مصائب زدہ وطن کو حقیقی شاعری کس طرح ہم آہنگ و ہم رنگ کر دیتی ہے۔



فیضؔ

وی جی کیرنن / ترجمہ ناصر لغشاری

میں فیض سے کوئی بیس برس قبل اس وقت متعارف ہوا تھا جب وہ ایم اے۔ او کالج امرتسر میں لیکچرار تھے ایک اور پرانے دوست جو اس وقت فیض کے رفیقِ کار تھے، کل اچانک ایڈنبرا میں دکھائی دیئے اور ان سے مل کر مجھے بیتے ہوئے دن یاد آ گئے۔ معلوم ہوا کہ فیض کو یہ دعوت دارین موصول ہوئی تھی کہ وہ اس قدیم دوست کی ایڈنبرا میں آمد سے مجھے مطلع کریں گے، لیکن وہ بھول گئے۔ اس زمانے میں بھی وہ اپنی بھول جانے کی عادت اور غائب دماغی کی وجہ سے خاصے مشہور تھے لیکن ان کے طالب علم ان کی اس عادت کو آسانی سے درگزر کر دیتے تھے کیونکہ اگر کوئی پروفیسر یہ بھول جائے کہ اسے طلبہ کو لیکچر دینا تھا تو انہیں کبھی اس کا افسوس نہیں ہوتا۔ اسی طرح تانگہ چلانے والوں کا بھی ان کے ساتھ یہی رویہ تھا کیونکہ وہ کسی کے گھر جا کر باتوں میں مصروف ہو جاتے اور بھول جاتے کہ باہر تانگہ کھڑا ہوا ہے اور اس طرح تانگے والوں کا کرایہ بڑھتا رہتا تھا اور ادبی لوگ انہیں یوں معاف کر دیتے تھے کہ وہ اس وقت بھی ایک اہم شاعر تھے۔

مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ اس ہفتے لندن میں ایک ادبی تقریب ان کے اعزاز میں منعقد کی جا رہی ہے اور مجھے اس کا افسوس ہے کہ میں خود وہاں حاضر ہونے سے قاصر ہوں۔ گذشتہ بار کوئی پانچ سال قبل جب وہ انگلستان آئے تھے تو ایک ایسی ہی تقریب میں شریک ہونے کا مجھے شرف حاصل ہوا تھا اس تقریب کے فوراً بعد فیض یورپ روانہ ہو رہے تھے تاکہ وطن واپس جا سکیں جہاں انہیں جیل میں ڈال کر ان کا پُرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ کئی ادبی شخصیتوں کی زندگی میں اس قسم کی خفیف غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہی ہیں اس بار وہ نسبتاً زیادہ طویل مدت کے لئے انگلستان میں قیام کر رہے ہیں تاکہ خوش قسمتی سے ان کے دوستوں کو مستقبل قریب میں اس قسم کی غلط فہمی کا خوف باقی نہ رہے اور کسی محبِ وطن شاعر کو اپنے وطن سے خواہ کتنا ہی لگاؤ کیوں نہ ہو یہ امر صاف دل خوش کن ہوتا ہے کہ بعض اوقات وہ کسی دوست کی طرح، بہت قریب سے جائزہ لینے کی بجائے چار یا پانچ ہزار میل کے فاصلے سے اپنے وطن کے بارے میں غور و خوض کرے۔

یہ امر شبہ افسوس ناک ہے کہ مع اہل عیال ہمارے یہاں کے متعدد پُرسکون اور سرمان انگیز مقامات مثلاً میرے آبائی شہر مانچسٹر یا لیک ڈسٹرکٹ جہاں ایک زمانے میں اتنے شاعروں نے عروج پایا، سب سے بڑھ کر ایڈنبرا میں رہنے کے بجائے لندن میں سکونت اختیار کر رہے ہیں اسی شہر میں جو اجنبیوں، کہر، شور و غل اور بالیاں لندن کا ایک دیوہیکل مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر جانسن کہا کرتے تھے کہ جب آدمی لندن سے اکتا جائے تو وہ زندگی سے اکتا جاتا ہے لیکن یہ اٹھارویں صدی میں ہوتا تھا آج تو یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ جب آدمی زندگی سے اکتا جائے تو وہ لندن کا رخ کرتا ہے۔

فیض بلا کے سگریٹ نوش واقع ہوئے ہیں یہ بڑی عادت لندن کے کہر اور دھند کے ساتھ مل کر کہیں ان کی انتہائی تابناک صلاحیتوں کو ماند نہ کر دے تاہم مجھے کامل یقین ہے کہ اپنی بیوی اور بچیوں کی مدد سے وہ اس مسئلے پر قابو پا لیں گے۔ نیز یہ کہ ایک ادبی شخصیت کی حیثیت سے اس ملک میں ان کا قیام حقیقی معنوں میں تخلیقی ثابت ہوگا۔ وہ اب تک بہت کچھ کر چکے ہیں لیکن انہیں ابھی اور بہت کچھ کرنا ہے اور اب جب کہ وہ دوسرے ہنگاموں سے آزاد ہیں انہیں یقیناً احساس آئے گا کہ ان سے کس قدر زیادہ توقع کی جا سکتی ہے ان گذشتہ برسوں میں مجھے یقین ہے کہ میں نے انہیں اس قسم کے موضوعات پر کم از کم بیس کتابیں لکھنے کا مشورہ دیا ہے جدید معاشرے میں فن کار کا مرتبہ، تاریخِ ادبِ اردو یا مغربی تہذیب کے مقابلے میں اسلامی تہذیب کی نوعیت وغیرہ وغیرہ

ہر شخص کو جو ان سے واقف ہے فطری طور پر یہ توقع بھی ہوگی کہ وہ اپنے فرصت کے اوقات میں مزید نظمیں لکھیں گے۔ میری ہمیشہ سے یہ خواہش بھی رہی ہے کہ وہ دوسرے ممالک کی بعض نظمیں خصوصاً ہمارے عہد کی ترقی پسند شاعری کا ترجمہ اردو میں کریں جو اسی روایت یا عالمی تحریک سے تعلق رکھتی ہو جس سے خود ان کی شاعری وابستہ ہے۔ ویسے جارج بارو، جنہوں نے آئرستان، ڈنمارک اور دوسرے علاقوں کی شاعری کو انگریزی میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے، اپنی ایک کتاب لیونگرو (LAVENGRO) میں لکھتے ہیں کہ ترجمہ زیادہ سے زیادہ ایک بازگشت ہی ہوتا ہے، تمام ترجمہ کرنے والے یقیناً یہی محسوس کرتے ہوں گے لیکن کچھ نہ ہونے سے بازگشت بھی بہرحال بہتر ہے اور فیض کی پیدا کردہ بازگشت کم از کم مترنم ضرور ہوگی۔ گذشتہ دنوں ان سے یہ سن کر کہ میں بے حد متاثر ہوا کہ خود ان کی بعض نظمیں سواحلی زبان میں ترجمہ ہونے کے بعد مشرقی افریقہ میں پڑھی جا رہی ہیں جہاں ایک ملک گیر زبان کی حیثیت سے سواحلی کا مستقبل بہت تابناک نظر آتا ہے مجھے امید ہے کہ جلد ہی دوسری زبانوں میں بھی ان کے کلام کا ترجمہ ہو جائے گا

ایک اسکاٹ خاتون نے، جو کئی سال تک افغانستان میں رہی ہیں فیض کے والد کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے جو اس زمانے میں وہاں وزیرِ اعلیٰ تھے مصنفہ کے بیان کے مطابق وہ بڑے پختہ عزم و ارادہ کے مالک تھے اور انتہائی انتشار کے ماحول میں نظم و نسق قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے امرتسر کی آزادانہ زندگی کے زمانے سے فیض بھی دوسرے متعدد باحوصلہ انسانوں کے دوش بدوش اس جدوجہد میں مصروف ہیں کہ ہمارے جدید عہد کے انتشار میں ضبط و توازن قائم کیا جائے جو کبھی کبھی افغانستان کے دورِ قدیم سے زیادہ مایوس کن نظر آتا ہے میں ایک اور پشت کو سرگرم عمل دیکھنے کا خواہاں ہوں اور حسنِ تصور سے فیض کی بیٹیوں کو اپنی اپنی رغبت کے عظیم کارناموں کی تکمیل سے منہمک دیکھ بھی رہا ہوں ان میں ایک کو غالباً پاکستان کی پہلی عظیم مصورہ کی حیثیت سے اور دوسری کو شاید پہلی خاتون صدر کی حیثیت سے۔

دراصل اتنا فیض کے دوستوں کو ہر ہفتے کے حساب سے ان سے دریافت کرتے رہنا چاہیئے کہ انہوں نے کتنے صفحات لکھ لیے ہیں اور ہر روز شام کو معلوم کرتے رہنا چاہیئے کہ انہوں نے کتنے کم سگریٹ پیئے ہیں۔



سرِ آغاز

سید سجاد ظہیر

مقدمۂ سازش۔ راولپنڈی کے دنوں میں فیض کے ساتھ میں بھی سنٹرل جیل (حیدرآباد سندھ) میں تھا۔ دسمبر ۱۹۵۱ء تک ہمارے مقدمے کی سماعت ختم ہو چکی تھی۔ ہمیں روز روز اسپیشل ٹریبونل کے اجلاس میں جا کر ملزموں کے کٹہرے میں گھنٹوں بیٹھے رہنے اور اس دوران گواہوں کی شہادتوں، وکیلوں کی جرح اور بحث اور معترضوں کی فاضلانہ قانونی موشگافیوں سے نجات مل گئی تھی۔ ابھی فیصلہ نہیں سنایا گیا تھا اور ہم امید و بیم کے عالم میں تھے۔ "چھٹی" وار تھی۔ انہیں دنوں ایک دن یہ اطلاع ملی کہ "دستِ صبا" شائع ہو گئی۔ گو ہم اس کی تمام چیزیں فیض کے منہ سے سن چکے تھے اور انہیں بار بار پڑھ چکے تھے، لیکن اس خبر سے ہم میں سے تمام قیدیوں کو جو اسے بے حد پسند رکھتے تھے، ایک غیرمعمولی مسرت ہوئی۔ جیل کے حکام سے اجازت لے کر ہم نے ایک پارٹی بھی کر ڈالی جس میں ہم تمام قیدیوں نے مل کر فیض کو "دستِ صبا" کی اشاعت پر مبارکباد دی۔ اس موقع پر کھلا اور پاروں لے منہ سے نہ کہا گیا۔ عرصہ گزر جانے کے بعد جب لوگ راولپنڈی سازش کے مقدمے کو بھول جائیں گے اور پاکستان کا مورخ ۱۹۵۲ء کے اہم واقعات پر نظر ڈالے گا تو غالباً اس سال کا سب سے اہم تاریخی واقعہ نظموں کی اس چھوٹی سی کتاب کی اشاعت کو ہی قرار دیا جائے گا۔

بہت دنوں سے لوگ، جن میں بعض نیک اندیش اور بعض بداندیش ہیں، اُردو ادب اور خاص طور پر اس کی ترقی پسند صنف پر جمود طاری ہونے یا اس کے انحطاط کی باتیں کر رہے ہیں۔ میں اس نقطۂ نظر کو صحیح نہیں سمجھتا۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ اُردو ادب کا جدید دور اس کے روشن ترین ادوار میں سے ہے۔ یہ دور تقریباً ۱۹۳۶ء سے شروع ہوتا ہے اور ابھی تک جاری ہے اور اگر ہم گزشتہ چار پانچ سال کو ہی لے لیں تو بہرحال اس عرصے میں "دستِ صبا" اور "زنداں نامہ"، ندیم قاسمی کی "شعلۂ گل"، سردار جعفری کی "پتھر کی دیوار"، احتشام حسین کی "تنقید اور عملی تنقید" اور مجنوں گورکھپوری کی "نقوش و افکار" (اسی طرح دیگر کتابوں کے) اس دعویٰ میں کافی ہیں کہ تخلیق کا سرچشمہ

"جس میں گرمی بھی ہے، حرکت بھی، توانائی بھی"

ناسازگار حالات میں نہ دھیما ہوتا ہے اور نہ گھٹتا ہے بلکہ جہل و رجعت کی کالی آندھیاں اُسے اور بھی بھڑکا دیتی ہیں اور اس طرح مجاہدہ اور تصادم کے طوفانوں سے گزر کر اور اس پیکار سے قوت و حرارت حاصل کرکے حق و صداقت کا نور پہلے سے بھی زیادہ درخشاں ہو جاتا ہے اور اس کے حسن اور تاثر میں صد رنگ سی تابناکیاں جھلملانے لگتی ہیں۔

"زنداں نامہ" کی بیشتر منظومات فیض نے منٹگمری سنٹرل جیل اور لاہور سنٹرل جیل میں قیام کے دوران لکھیں۔ یعنی جولائی ۱۹۵۲ء سے مارچ ۱۹۵۵ء تک کی لکھی ہوئی چیزیں اس میں ہیں۔ اس درمیان میں ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے کیونکہ ہم دونوں کو چار چار سال قید بامشقت کی سزا دینے کے بعد اہلِ اقتدار نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم ایک ساتھ جیل میں نہ رکھے جائیں۔ فیض کو پنجاب میں منٹگمری جیل کو بھیجا گیا اور مجھے حیدرآباد سندھ سے بلوچستان کے سنٹرل جیل مچھ کو۔ ہم ایک دوسرے سے خط و کتابت بھی نہ کر سکتے تھے۔ تاہم دوسرے دوستوں کے خطوں اور بعض اردو رسالوں کے ذریعے مجھے فیض کی چند غزلیں اور نظمیں جو اس زمانے میں لکھی گئیں، پڑھنے کا موقع مل جاتا تھا۔

اب کہ حالاتِ زندگی میرے لیے کافی خوشگوار ہیں اور میں آزاد فضا میں سانس لے سکتا ہوں، اس کے باوجود جب میں اُن ذہنی، جذباتی اور روحانی کیفیات کا خیال کرتا ہوں جو مجھ پر اس وقت طاری ہوتی تھیں جب اپنے اس محبوب ترین دوست اور ہمدم کا کلام پڑھتا تھا تو اس کا اظہار مشکل معلوم ہوتا ہے۔ شاید لوگ تقدس کے لیے یہ اچھا بھی نہیں ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ چونکہ ہمارے بہت سے تجربے، زندگی اور اپنے وطن کو تمبیار اور حسین بنانے کے متعلق ہمارے خواب، ہمارا درد، ہماری مسرتیں اور رفعتیں مشترک تھیں، اس لیے فیض کے ان اشعار سے میں غیرمعمولی طور پر متاثر ہوتا تھا۔ اگر میرا دل کبھی خون کے آنسو روتا تھا کہ قید و بند کے مصائب اور صعوبتیں اس کا حصہ کیوں ہیں جو اپنی حسن کاری سے سب کی زندگی کو اتنی فیاضی سے مرصع کر دیتا ہے، اور اپنی نغمگی سے ہم سب کی رگوں میں سرور کی برقی لہر دوڑا دیتا ہے، تو کبھی سراپا ہیں اس کی تخیل کی اُن پہنائیوں اور فرمان گل کاریوں سے کسبِ شعور کرتا جن میں طبقاتی علم کی صفا پاشیاں، انسانیت کے شریف ترین جذبات سے اس طرح مل گئی ہیں جیسے شراب میں سے خمارت۔

فیض کی ان نظموں کو مجموعی حیثیت سے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک اُن اقدار کا تعلق ہے جن کو شاعر نے ان میں پیش کیا ہے، وہ تو وہی ہیں جو اس زمانے میں تمام ترقی پسند انسانیت کی اقدار ہیں، لیکن فیض نے ان کو اسی خوبی سے اپنایا ہے کہ وہ نہ تو ہماری تہذیب و تمدن کی بہترین روایات سے الگ نظر آتی ہیں اور نہ شاعر کی انفرادیت، اس کا رم، تیری اور مترنم اندازِ کلام کہیں بھی آن سے جدا ہوتا ہے۔ اُس کے متحرک اور رواں استعاروں میں ہمارے وطن کے پھولوں کی خوشبو ہے، اُس کے خیالات میں اُن سچائیوں اور ان جمہوری مقاصد کی چمک ہے جن سے ہماری قوم کی عظیم اکثریت کے دل روشن ہیں۔ اگر تہذیبی ارتقا کا مطلب یہ ہے کہ انسان مادی اور روحانی عسرت سے نجات حاصل کرکے اپنے دلوں میں گداز، اپنی بصیرت میں حق شناسی اور اپنے کردار میں استقامت و رفعت پیدا کریں اور ہماری زندگی مجموعی اور انفرادی حیثیت سے بیرونی اور اندرونی طور پر مصفا بھی ہو اور منظم بھی، تو فیض کا شعر عالیشان تمام تہذیبی مقاصد کو چھو لینے کی کوشش کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان اور ہندوستان میں اس کی غیرمعمولی مقبولیت کا سبب یہی ہے۔ البتہ فیض کے تمام چاہنے والے، "نقشِ فریادی"، "دستِ صبا" اور "زنداں نامہ" کے شیدا ہونے کے باوجود اُن سے یہ توقع اور امید رکھتے ہیں کہ کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے ان کی وہ تخلیقیں جو ابھی نہیں ہوئیں، ان کے مقابلے میں، جو وہ کر چکے ہیں، زیادہ گراں قدر ہوں گی۔



سابق میجر محمد اسحاق

رودادِ قفس

کیمیا گر بغصہ مردہ و رنج
ابلہ اندر خرابہ یافتہ گنج

فیض صاحب کی کسی تصنیف کا دیباچہ لکھنے کی سعادت ایک خوار پایہ کم کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کی دقتوں کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب لکھنے بیٹھا۔ کہتے ہیں پرانے زمانے کے راجے مہاراجے جب کسی برگشتہ بخت سفید پوش کی پریشاں حالیوں میں اضافہ کرنا چاہتے تھے تو اسے ایک عدد ہاتھی بخش دیا کرتے تھے۔ معاملہ بعینہٖ ایسا تو نہیں ہے، لیکن ایک سیدھے سادے فوجی آدمی کے لیے فیض کے کلام کے بارے میں کچھ لکھنا کافی پریشانی کا باعث ہو سکتا ہے اور پھر ایک کسان اور خاص کر نوآبادیاتی ملک کے کسان کے بیٹے کی تربیت ہی کیا ہوتی ہے۔ دیہاتی سکولوں کی تعلیم، اور وہ بھی توہم پرستی اور جہالت کے گھٹا ٹوپ سایوں تلے، ایسے ماحول میں جس میں عزت و ناداری کے طفیل پڑھنے لکھنے کی نسبت ہل کی لکیر سیدھی کھینچنا، ڈھور ڈنگر کی نگہبانی کرنا اور بیلوں کے لیے چارہ لانا زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، جہاں ہر نئی شے اور ہر نئے خیال کا حقارت آمیز تمسخر اڑایا جاتا ہے، جہاں دنیا کا بلند ترین خیال اور پاکیزہ ترین جذبہ دو گھماؤں زمین کے پیمانے سے ناپا جاتا ہے۔ میرا تعلیمی پس منظر ایسا ہی تھا۔ فنونِ لطیفہ میرے اساتذہ کے بس کی بات نہیں تھے، میرا ان سے مَس کیا ہوتا۔ کتابیں زندگی کا حصہ نہیں تھیں، صرف امتحان پاس کرنے کا ذریعہ تھیں۔ لائبریریاں، علمی مجلسیں، علمی مباحثے، مشاعرے، ڈرامے، موسیقی، رقص، آرٹ گیلریاں سو رہ گئیں مفقود۔ اور چاروں طرف ساہوکاروں اور ان کے ملکی ایجنٹوں کے اقتصادی بوجھ تلے کراہتی ہوئی مخلوق۔

ایسی روکھی پھیکی تعلیم کے بعد آٹھ دس سال کی فوج کی مصاحبت بہادری نے رہی سہی کسر نکال دی۔ وہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا تھا۔ اور "کالا لوگ" کی دوسری زبانوں کو اپنے دیس میں ہی دیس نکالا ملا ہوا تھا، ان کی حیثیت انگریزی زبان کی لونڈیوں، باندیوں کی سی تھی۔ جیل کے چار سال اس لحاظ سے مفید رہے کہ یکسوئی سے مطالعہ کا موقع مل گیا۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ دو ایک روفیسر بھی ساتھ ہی قابو آگئے تھے۔

زنداں نامہ کا دیباچہ لکھنے کے بارے میں اسی بے مائیگی نے لکھنے کا ارادہ نہیں کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی مشاہدے کی صحیح جانچ اسی وقت ہو سکتی ہے جب شاہد کے مقام اور اس کی صلاحیتوں کا پورا پورا تعین کر لیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میں کچھ نہیں

کم چار سال دن رات فیض کے ساتھ رہا ہوں۔ یہ طویل عرصہ ہم نے جیل کے ایک ہی احاطے میں ملحقہ کوٹھڑیوں میں گزارا ہے، سینکڑوں بار صبح سویرے سب سے پہلے ایک دوسرے کے منہ لگے ہیں، اپنی موسیقی اور غم باہم بانٹنے پر مجبور رہے۔ جیل کے باہر آدمی سینکڑوں لوگوں کو روزانہ ملتا ہے۔ ملتا نہیں تو دیکھ ضرور لیتا ہے۔ کئی قسم کی آوازیں سنتا ہے، مختلف معاملات سے واسطہ پڑتا ہے۔ کسی سے نفرت ہے تو کنی کترا کے نکل سکتا ہے، کسی سے محبت ہے تو ملاقات کی راہیں ڈھونڈ لیتا ہے یا ان کی تلاش میں ہی سلا رہتا ہے۔ جیل میں آدمی کی مرضی اس سے چھین لی جاتی ہے اور اس کی نقل و حرکت محدود کر دی جاتی ہے۔ وہاں کی کائنات دو چار قیدی، دو چار پہرے دار، کچھ کوٹھڑیاں اور کچھ دیواریں، ایک آدھ درخت، ایک دو گلہریاں، نصف درجن کے قریب چھپکلیاں اور کچھ کوّے اور دوسرے پرندے ہوتے ہیں، جن میں مہینوں بلکہ سالوں تک تبدیلی نہیں آتی۔ مجھے اس چھوٹی سی دنیا میں فیض صاحب کے ساتھ مسلسل چار سال تک رہنے کا موقع ملا ہے۔ لیکن اس طول قرب کے باوجود ضروری نہیں ہے کہ میں اپنے موضوع سے پورا انصاف کر سکوں۔ ایک اندھا کائنات کی رنگا رنگی میں عمر گزار کر بھی رنگوں کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ کئی لوگ اچھی بھلی نظر رکھتے ہوئے بھی بعض رنگوں کو نہیں پہچان سکتے۔ ریڈیو پروگرام سننے کے لیے طاقتور ریڈیو اسٹیشن ہی نہیں چاہیے، ریسیونگ سیٹ بھی نقائص سے پاک ہونا چاہیے۔

یہاں پر زنداں نامہ کی نظموں اور غزلوں پر تنقید و تبصرہ اگرچہ میرا مقصود نہیں، پھر بھی شاعر کے بیان میں ان کا ذکر ناگزیر ہے۔ فیض کی لطافت کا بیان میرے بس کی بات نہیں ہے۔ اثر لکھنوی کی زبان میں "فیض احمد فیض کی شاعری ترقی کے مدارج طے کر کے اب اس نقطۂ عروج پر ہے جس تک شاید ہی کسی دوسرے ترقی پسند شاعر کی رسائی ہوئی ہو۔ تخیل نے صناعت کے جوہر دکھائے ہیں اور معصوم جذبات کو حسین پیکر بخشا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پریوں کا ایک غول، ایک طلسمی فضا میں اس طرح مست پرواز ہے کہ ایک پر ایک کی نگاہ، وٹ پڑ رہی ہے اور قوسِ قزح کے عکاس بادلوں سے ست رنگی بارش ہو رہی ہے ..." ہر کوئی نقد بر طرف اس لطافت سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اپنے فہم کے مطابق چیدہ چیدہ نظموں کا پس منظر بیان کر دوں۔ اتنا خیال رہے کہ صحیح ادب اپنے پس منظر کی حدود و قیود کو توڑ کر بہت آگے نکل جاتا ہے۔ فیض کی شاعری کو اس کے پس منظر کے سانچے میں محدود کر کے دیکھنا ظلم ہے۔ اس لیے میری کاوشوں کو ایک سائن بورڈ سے زیادہ حیثیت نہیں دینی چاہیے۔ آگے راستہ سب



کا اپنا اپنا باب اور اپنی اپنی ہمت۔

فیض صاحب ۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو قید ہوئے اور اپریل ۱۹۵۵ء میں رہا ہوئے۔ اس طرح ان کی اسیری کے دن کچھ اوپر چار سال بنتے ہیں۔ اس عرصہ میں وہ پہلے تین مہینے سرگودھا اور لائل پور کے جیلوں میں قیدِ تنہائی میں رہے۔ اس کے بعد جولائی ۱۹۵۳ء تک حیدر آباد (سندھ) جیل میں راولپنڈی سازش کیس کے باقی اسیروں کے ساتھ رہے۔ جولائی ۱۹۵۳ء میں ہم سب کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹ کر لاہور، منٹگمری، مچھ (بلوچستان) اور حیدر آباد کے جیلوں میں بھیج دیا گیا۔ فیض صاحب کے لیے میرے اور کیپٹن خضر حیات کے ہمراہ منٹگمری سنٹرل جیل کا انتخاب کیا گیا۔ لیکن وہ چونکہ بغرضِ علاج کراچی چلے گئے تھے، اس لیے کہیں ۱۹۵۴ء میں جا کر ہمارے پاس منٹگمری پہنچے۔ یہاں سے ہم اکٹھے رہا ہوئے۔

مجھے فیض صاحب کی گرفتاری کے کوئی تین ماہ بعد مئی ۱۹۵۱ء میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس لیے خلقِ خدا کی سرگوشیاں سنتا رہا۔ فیض صاحب کے ساتھ اس دوران میں ان کے عزیزوں دوستوں کو ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ نہ ہی وہ کسی سے خط و کتابت کر سکتے تھے۔ ان کے متعلق طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں اور قید میں ان کے ساتھ سلوک کے بارے میں عجیب عجیب دلخراش قصے مشہور تھے۔ جب پہلی بار ان سے حیدر آباد جیل میں ملاقات ہوئی تو بڑا اطمینان ہوا۔ وہی چوڑی پیشانی، وہی چمکتی ہوئی آنکھیں، وہی گہری مسکراہٹ جس کا نور سب طرف پھیل رہا تھا اور پھر وہ فاتحِ عالم محبت، جس سے ان کے جاننے والے مانوس ہیں۔

جیل ایک طرح کا طلسماتی آئینہ خانہ ہوتا ہے، جہاں صورتوں کے بیس بیروں کے عکس عجیب و غریب شکلیں بنا کر ظاہر ہوتے ہیں۔ کسی کی طبع جھگڑے کی طرف مائل ہے تو وہ ہر کسی سے لڑائی مول لینے کی فکر میں ہوگا۔ کوئی بزدل طبع کا ہے تو وہ گور کے کیڑے کی طرح ہر وقت سر چھپانے کی دھن میں ہوگا۔ کسی کے مزاج میں قنوطیت ہے تو وہ ہر اچھی بری خبر سے اپنی دلشکنی کے اسباب ڈھونڈ لائے گا۔ کسی کو کوئی خبط ہے تو وہ دیوانگی کی حد تک ترقی کر جائے گا۔ طبیعتوں میں کمینگی اور تنگ نظری خاص طور پر پھلتی پھولتی ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنے ساتھیوں اور جیل والوں سے جھگڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انسان کی ساری کائنات جیل کی چار دیواری میں محدود کر دی جاتی ہے اور اس کے فکر و نظر میں تنگی آ جاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انسانوں پر حیوانی بندشیں عائد کر دی جاتی ہیں۔ کوٹھڑی میں بند کرنا، ایک احاطے میں محصور کر دینا، بیڑیوں کا استعمال، عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات پر پابندیاں، بے بسی کا عالم، یہ سب چیزیں اسیروں کے دل پر نوکِ سوزن کا کام کرتی ہیں۔ جیل کے بعض افسر بھی قیدیوں کی دل شکنی کے مواقع ڈھونڈتے رہتے ہیں اور قیدی کی عزتِ نفس اور وقار کو ٹھیس پہنچانے میں ماہر ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ بات سب کے بارے میں صحیح نہیں۔

اس حالت میں ایک آدمی بند ہو کر اگر اپنی روزمرہ کی شخصیت قائم نہ رکھ سکے تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔ کمال ان لوگوں کا ہے جو جیل جا کر بھی وضعداری قائم رکھ سکتے ہیں۔ جن لوگوں کو میں جیل جانے سے پہلے جانتا تھا ان میں فیض صاحب ہی ایسے تھے جو سعابرش سے مس نہ ہوئے۔ لیکن عام لوگوں کی طرح طبیعتوں کا بوجھ کم کرنے کے لیے لڑائی جھگڑے، دنگا فساد اور اسی قسم کے دوسرے سیفٹی ویلو (SAFETY VALVE) استعمال نہ کرنے سے فیض صاحب پر جو ذہنی اور جسمانی فشار پڑا وہ ان کے دوستوں سے مخفی نہیں۔ شاعری غنیمت تھی، جس کے ذریعے دل کا غبار نکال لیا کرتے تھے لیکن شاعری بذاتِ خود دل و جگر کے ایندھن پر چلائی جاتی ہے ؎

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے!

حیدر آباد میں دورانِ مقدمہ کے دن بھی عجیب دن تھے۔ تین مہینوں سے ٹوڈی قسم کے لوگ اخباروں، اشتہاروں، جلسوں، جلوسوں میں ہمیں گولی کا نشانہ بنانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ بعض اخباروں نے غدار نمبر نکال دیے تھے۔ کچھ اس قسم کا ماحول پیدا کر دیا گیا کہ ملک میں ہر مرد آزاد یہ سمجھنے لگا تھا کہ اس کو بھی سازش میں دھر لیا جائے گا۔ چاروں طرف ایک دہشت اور سراسیمگی کی فضا تھی اور ہمارے رشتہ دار اور دوست ہماری جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ لیکن جیل کے اندر ہماری ایسی یہ حالت تھی کہ گویا کسی پکنک پر آئے ہوئے ہیں۔ سب طرف ہنسی مذاق تھا، قہقہے تھے، امید تھی، حوصلہ تھا۔ قوالیاں ہوتی تھیں، سوانگ بھرے جاتے تھے! اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ ہمیں اپنی بریت پر بھروسہ تھا اور دوسری شاید یہ ہو سکتی ہے کہ بہت بڑے خطرے کے سامنے آدمی عموماً دو ہی راستے اختیار کرتا ہے یا تو الٹے پاؤں بھاگ اٹھتا ہے یا مقابلے کی ٹھان لیتا ہے۔ مؤخر الذکر کی بھی آگے دو صورتیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہم میں بعض ایسے بھی ہوں گے جو مصائب کی ہولناکیوں کے زور سے لرز لرز کر ہنس رہے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے کہ

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ!
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

یہ صورتِ حال حیدر آباد سے مخصوص نہیں تھی، لاہور کے چند روز کے قیام میں بھی ہماری یہی حالت رہی تھی۔ چنانچہ لاہور کی برڈ وڈ بیرکس (BIRDWOOD BARRACKS) میں پولیس کی تحویل میں دیے جانے کے کوئی پانچ ہفتے بعد مئی ۱۹۵۱ء میں گرفتار ہونے والے ساتوں کے ساتوں فوجی افسر ظفر اللہ پوشنی کی قیادت میں بعض قسم کے فوجی کورس (CHORUS) الاپ رہے تھے (اس قسم کی بے ضرر لغویات کی چھوٹے فوجی افسروں کو خاص موقعوں پر اجازت ہوتی ہے) لاہور جیل کا ایک واقعہ یاد کرتا ہوں تو اب بھی ہنسی آ جاتی ہے۔ وہاں ہمیں بم کیس (BOMB CASE WARD) میں رکھا گیا (یہ وارڈ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کیلئے خاص طور پر تعمیر کیا گیا تھا)۔ اس کے صحن میں ایک بارہ دری سی ہے، جس کے دروازوں میں لوہے کی مضبوط جالی لگی ہوئی ہے۔ رات کو ہم یہیں سویا کرتے تھے۔ ایک دن سونے کی تیاری میں تھے کہ ایک بوڑھا سنتری جالی سے لگ کر اندر جھانکنے لگا۔ خضر حیات نے پوچھا۔ بابا تمہیں ہم قید میں دکھائی دیتے ہیں؟ اس نے کہا جی ہاں صاحب۔ خضر حیات بولا لیکن بابا ہمیں، تو تم قید میں نظر آتے ہو۔ اس پر بوڑھا



سنتری پہلے تو بوکھلا سا گیا۔ پھر اس زور سے ہنسنے لگا کہ ہم بھی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ ایک نشہ تھا جس میں سب مگن تھے ؂

جو ہم سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

لاہور ہی کا ایک اور لطیفہ یاد آ گیا۔ ایک دن ہمیں ریمانڈ کے لیے عدالت میں لے جایا جانا تھا۔ اطلاع ملی کہ سید سجاد ظہیر بھی ساتھ جائیں گے۔ جیل کے بڑے دروازے کے اندر پولیس کی قیدی ڈھونے والی گاڑی کھڑی تھی۔ ہم وہاں رک گئے اور سید صاحب کا انتظار کرنے لگے۔ اتنے میں پھانسی کی کوٹھیوں کی طرف سے سفید شلوار کرتے میں ملبوس، سر پر خاکی کیپ جمائے، ایک بھاری بھرکم، زندگی سے مطمئن شخص آتا دکھائی دیا۔ ہمارے درمیان چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ کیا یہ سجاد ظہیر ہو سکتا ہے۔ ہم میں سے ان کے ساتھ کسی کی بھی جان پہچان نہیں تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ کمیونسٹ نہایت قبیح صورت، درندہ سیرت انسان ہوتے ہیں۔ داہنے بائیں پستول لگاتے ہیں۔ پیٹ پر چیتھڑوں کی پیٹی باندھتے ہیں۔ بڑی بڑی مونچھیں اور خونخوار آنکھیں رکھتے ہیں۔ اور ان کا موضوعِ سخن قتل و غارت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ سجاد ظہیر چونکہ پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری تھے، اس لیے ان لوگوں کے خیال میں ان کے منہ سے ہر سانس میں آگ نکلنی چاہیے تھی۔ اور ان کو اس قسم کا انسان ہونا چاہیے تھا کہ ڈنکی لگائے رسی سے باہر چلا جائے۔ یہ شخص جو نرم چال، پاکیزہ خدوخال اور ایک عدد عالمانہ توند لیے ہوئے تھا سجاد ظہیر کیسے ہو سکتا تھا۔ ہمارے یہ ساتھی اپنی رائے پر اس شدت سے مُصر تھے گویا یہ ان کا جزوِ ایمان ہے۔ چنانچہ چارو ناچار ہم سب نے تسلیم کر لیا کہ یہ سجاد ظہیر نہیں ہو سکتے، کشمیری بازار کے شیخ ہوں گے یا پولیس کے کوئی خفیہ صورت ایجنٹ۔ چنانچہ عدالت تک تمام سفر میں ہم گم سم بیٹھے ان کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے رہے۔ عدالت میں جب وہ کھڑے ہو کر کہنے لگے کہ "جنابِ والا پندرہ دن ہو گئے ہیں اور مجھے ابھی تک نہیں بتایا گیا کہ میں کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہوں۔ یہ بالکل لغو (PREPOSTEROUS) بات ہے"، تو ہمیں یقین ہوا کہ وہ سجاد ظہیر ہیں۔ ریمانڈ کے لیے ہمیں جج صاحب کی کوٹھی میں لے جایا گیا تھا۔ وہاں پولیس گارڈوں اور گاڑیوں کی اتنی گہماگہمی تھی کہ کوٹھی کی اوپر کی منزل میں بہت سے لوگ تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ ضیاء الدین نے اشارے سے مجھے بلا کر کہا، "بھئی ایسے بیٹھے ہو جیسے مویشی چرانے آئے ہو۔ سیدھے ہو کر بیٹھو۔ کالر ٹھیک کرو۔ ذرا ذرا مسکراؤ۔ دیکھتے نہیں پبلک دیکھ رہی ہے" اور خود بھی تن کر ایسے بیٹھ گیا کہ گویا تصویر اتروانے آیا ہو۔ ائیرکموڈور جنجوعہ سے میری پہلی ملاقات وہیں ہوئی۔ انھوں نے مصافحہ کرتے وقت میرے ہاتھ کو اس پھرتی سے نچوڑا کہ اب تک یاد ہے۔

حیدرآباد میں عدالت کی عمارت جیل کے اندر تھی۔ عدالت کا وقت آٹھ سے بارہ بجے تک ہوتا تھا۔ ہفتہ اور اتوار کے دن خالی ہوتے تھے۔ شام کے وقت کبھی کبھی ہمارے وکلاء مشورے کے لیے آ جایا کرتے تھے۔ باقی وقت ہمارا اپنا ہوتا تھا۔ ایک ہی احاطے میں سب کے لیے جگہ نہیں تھی اس لیے فیض صاحب، محمد حسین عطا، جنرل اکبر خان، بریگیڈیئر صادق خان، کرنل ضیاء الدین، کرنل نیاز محمد ارباب، میجر حسن خان، کیپٹن ظفر اللہ پوشنی، کیپٹن خضر حیات ——— اور میں ایک احاطے میں رکھے گئے اور سید سجاد ظہیر، جنرل نذیر احمد، ائیرکموڈور جنجوعہ اور بریگیڈیئر لطیف خان کو ایک دوسرا احاطہ دیا گیا۔ بیگم اکبر خان کے لیے علیحدہ انتظام تھا۔ کھانے کا بندوبست ہماری طرف تھا۔ ہمیں ظہور احمد اور عادل خان دو قیدی نہایت اچھا پکانے والے ملے ہوئے تھے اور کھانے کا انتظام ایک باقاعدہ آفیسرز میس (OFFICERS MESS) کی طرز پر تھا۔ جس کا سیکرٹری گاہے گاہے چنا جاتا تھا۔ شام کے وقت والی بال اور بیڈمنٹن بھی ہمارے احاطے میں ہی کھیلے جاتے تھے۔ چنانچہ مشترکہ سرگرمیوں کا مرکز یہی احاطہ تھا۔ مشاعرے، قوالیاں، ڈرامے عموماً یہیں ہوتے تھے۔ سید سجاد ظہیر والے احاطے میں ہم چھٹی کے دن کی صبح کو جایا کرتے تھے جہاں کافی اور بسکٹ سے تواضع ہوتی تھی اور ادبی اور سیاسی گفتگوئیں ہوتی تھیں۔

مرزا سودا کے غنچے کی طرح فیض صاحب کی بیاض برداری کا کام میرے سپرد تھا۔ جب وہ محفلِ مشاعرہ کی طرف یا سجاد ظہیر کے ہاں جاتے تو میں نوٹ بک اٹھائے پیچھے پیچھے ہوتا۔ دوسرے رفیق جب ہمیں اس طرح جلوس میں چلتا دیکھتے تو چاروں طرف خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ اس لیے کہ جیل میں فیض صاحب کے تازہ کلام کا ورود جشن سے کم نہیں ہوتا تھا اور پھر جس ادا سے ہم چلتے تھے، وہ بھی خوش طبعی کی ایک اچھی خاصی مزاحیہ صورت ہوتی تھی۔ فیض صاحب خراماں خراماں مسکراتے ہوئے، گھبرائے سے، شرمائے سے چلتے تھے اور میں ایک لمحہ سدھائے کی طرح گردن اکڑائے، ناک آسمان کی طرف اٹھائے لوگوں کے سروں کے اوپر سے دیکھتا ہوا چلتا تھا اور جب تک فیض صاحب کے تشریف رکھنے پر نہایت مؤدب لیکن باوقار انداز میں بیاض ان کی خدمت میں پیش نہیں کر لیتا تھا، مسکراتا تک نہیں تھا۔ سال غنچہ اور مجھ میں اتنا فرق ضرور تھا کہ مرزا سودا جب کسی پر ناراض ہوا کرتے تھے تو غنچہ کو صرف قلمدان آگے بڑھانا ہوتا تھا۔ باقی میرزا خود نمٹا لیا کرتے تھے۔ یہاں یہ صورت تھی کہ فیض صاحب تو ہمیشہ سے "با دشمناں مروت با دوستاں مدارا" کے قائل رہے ہیں اور خود کسی سے ناراض ہوتے ہی نہیں اور غنچہ ثانی ان دنوں دوست دشمن سب کی سرکوبی کو ہر وقت مستعد رہتے تھے۔

حیدرآباد میں فیض صاحب، میں اور عطا ملحق کمروں میں رہتے تھے۔ میں اور عطا ان کے سب موڈوں سے واقف ہو گئے تھے۔ شعر کا عالم طاری ہوتا تھا تو فیض صاحب خاموش ہو جایا کرتے تھے۔ البتہ اٹھتے بیٹھتے گنگنا چکنے کے بعد ادھر ادھر دیکھنے لگتے۔ ہم بھانپ لیتے تھے کہ سامعین کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ہم دونوں کسی کا غیر لسوں اور لگاتار سرگوشیوں کے بعد موقع کی مناسبت کا اندازہ لگا کر، گورونانک دیوجی کے بھائی بالا اور مردانہ کی طرح حضورِ شاعر پہنچ جاتے تھے اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد غزل یا نظم کا مطالبہ شروع کر دیا کرتے تھے کہ اب بہت عرصہ ہو گیا ہے اور لوگ کیا کہیں گے وغیرہ وغیرہ۔ اگر نظم یا غزل تیار ہوتی تھی تو ایک آدھ شعر سنا دیا کرتے تھے ورنہ حکم ہوتا کہ بھاگ جاؤ۔ ہم سمجھ جاتے تھے کہ اس انکار میں اقرار مخفی ہے اور بات پھیلا دی جاتی تھی کہ



معنی کی سرزمیں پہ نزولِ سروش ہے

اس کے نواح میں شور و غوغا، دنگا فساد، لڑائی جھگڑا، حتی الامکان سد کر دیا جاتا تھا۔ فیض صاحب نے بہت نازک طبع پائی ہے۔ ہمسائے میں تُو تُو میں میں ہو رہی ہو، دوستوں میں تلخ کلامی ہو، یا یونہی کسی نے سوری عزّت رکھی ہو تو ان کی طبیعت ضرور خراب ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی شاعری کی کیفیت کافور ہو جاتی ہے۔ جو لوگ فیض کو اور مجھے جانتے ہیں وہ زیرِ لب مسکرا رہے ہوں گے کہ یہ حضرات جن کو شاعری دکھ بانٹے تو سٹریں منہ چھپا لے، فیض کی طبیعت پر کیونکر بارِ بس ہو جاتے تھے اس کا بھید فیض صاحب ہی کھول سکتے ہیں۔

حیدر آباد میں فریباً ہر پندرھواڑے ایک مجلسِ مشاعرہ منعقد کرنے کا رواج ہو گیا تھا۔ یہ مشاعرہ کبھی طرحی ہوتا تھا کبھی غیر طرحی اور سبھی کو اس میں حصّہ لینا پڑتا تھا "دستِ صبا" میں مندرجہ ذیل مصرعوں پر کہی ہوئی غزلیں موجود ہیں

۱ "نذرِ جاں گر قبول کر دیں نہ کروں"

۲ - "آج کیوں مشہور ہے ہر ایک دیوانے کا نام"

۳ - "دیکھنا وہ نگہِ ناز کہاں ٹھہری ہے"

۴ - "اگرچہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں"

فیض کی غزل "وہیں ہے دل کے قرائن تمام کہتے ہیں" حسرت موہانی کی ایک غزل پر کہی گئی ہے۔

میرے ذہن میں فیض صاحب کی جیل کی شاعری کے چار رنگ ہیں (ناموڑ کو ییجیے)

پہلا رنگ سرگودھا اور لائل پور کے جیلوں میں ان کی ہم جنسوں کی قیدِ تنہائی کا ہے وہ بہت مشکل دن تھے۔ کاغذ، قلم، دوات، کتابیں، اخبار، خطوط سب ممنوع تھیں۔ انھوں نے اس طرف اشارہ بھی کیا ہے

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

صرف ایک شمس الدین تھے جو زانوں، جوتوں بھولوں، دیودوں، پریوں، عاملوں معمولوں سے اپنے معاملات کے قصّے سنا کر فیض صاحب کا جی بہلایا کرتے تھے۔

حیدر آباد میں تو فیض صاحب ان کے ذکر سے بھرپور تھے۔ آج کل بھی اکثر یاد کرتے رہتے ہیں۔ اس قیدِ تنہائی کا ان پر اتنا اثر ہوا تھا کہ حیدر آباد پہنچ کر وہ اکیلا رہنے سے بہت وحشت کھاتے۔ اپنی اپنی کوٹھڑیوں کے علاوہ ایک ہال بھی ہمارے سپرد کیا گیا تھا ہمیں اجازت بھی کہ جہاں چاہیں بستر جمائیں۔ ہم اپنے اپنے کمرے میں رہنا چاہتے تھے لیکن فیض صاحب ہال میں رہنے پر مُصر تھے۔ کہتے تھے تمہیں میری طرح تنہائی میں رہنا پڑتا تو دوستوں کی صحبت کی قدر ہوتی۔ لیکن ان پر یہ حالت زیادہ دیر طاری نہ رہی اور کچھ عرصے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلے گئے اب ان کا بیشتر وقت ہمیں اپنے کمرے سے نکالنے میں صرف ہوتا تھا۔

فیض صاحب کہتے ہیں کہ اُن دنوں ان کی طبیعت بہت زوروں کی آمد تھی اور طرح طرح کے مضامین سوجھ رہے تھے۔ اس دوران کا کلام کچھ تو ان کے ذہن سے اُتر گیا۔ جو بچ گیا وہ "دستِ صبا" میں مندرجہ ذیل عنوانات پر مشتمل ہے

متاعِ لوح و قلم
دامنِ یوسف
طوق و دار کا موسم (پہلا حصّہ)
ترا جمال نگاہوں میں لے کے اُٹھا ہوں
تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے
تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
شفق کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارۂ شام

کچھ کلام ایسا بھی ہے جو صرف سینہ بسینہ چل سکتا ہے اور جس سے فیض صاحب صرف مخصوص دوستوں کو نوازتے ہیں۔

ان کی شاعری کا دوسرا رنگ حیدر آباد کا ہے۔ یہاں ہمیں ہر طرح کا جسمانی آرام جو جیل میں ممکن ہو سکتا ہے، میسّر تھا۔

"گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے"

کی سی حالت تھی کہ ظاہری آرام و آسائش کے پردے میں ہزاروں حسرتوں کا خون اور لاکھوں تمناؤں کا قبرستان تھا۔ ہمارے خلاف کئی تعزیری دفعہ ایسی لگی ہوئی تھیں جن کی سزا موت تھی۔ اس کے ساتھ صفائی پیش کرنے کی سہولتیں بہت حد تک ہمیں میسّر نہیں تھیں۔ لیکن ہم نے سمجھ رکھا تھا کہ ؎

در بیاباں گر بشوقِ کعبہ خواہی زد قدم
سرزنشہا گر کند خارِ مغیلاں غم مخور

اور وقتی طور پر شور و غوغا، ہاؤ ہُو، گالی گلوچ کے ذریعے آنے والے خطرے کی آہٹ کو دبائے ہوئے تھے۔ ڈیڑھ دو سال ہمارا موضوع بس صرف مقدمہ رہا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میرے سامنے کسی نے کبھی شکست کا ذکر کیا ہو۔ ہم سمجھتے تھے کہ ایسا ذکر ایک دفعہ شروع ہو گیا تو روکے نہیں رُکے گا۔ ہم فوج کے اس مشہور مقولے پر عمل کر رہے تھے کہ جب مدافعت کی صورت نہ رہے تو دھاوا بول دو۔ چنانچہ شروع دن سے ہم عدالت کے اندر حسبِ توفیق غلغلہ اندازی کرتے رہے۔ فیض صاحب نے اس میں بہت کم حصّہ لیا۔ لیکن ہمیں کبھی روکا بھی نہیں۔ وہ ایسا جوش و ولولہ اپنے شعروں میں منعکس کر لیا کرتے تھے۔

پھر حشر کے ساماں ہوئے ایوانِ ہوس میں
بیٹھے ہیں ذوی العدل، گنہگار کھڑے ہیں
ہاں جرمِ وفا دیکھیے کس کس پہ ہے ثابت
وہ سارے خطاکار سرِ دار کھڑے ہیں

یہی جنوں کا یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر یہی اختیار کا موسم



قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم
بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے

ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی خجل
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاجِ شہی
ہمیں سے سنتِ منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کج کلہی

اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آپہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اچھالے جائیں گے

پھر اہلِ ستم کی بات کرو
عشق کے دم قدم کی بات کرو

دیکھنے والے دیکھیں گے کہ "دستِ صبا" کے دوسرے حصے میں جوش و خروش کا وہ عالم نہیں جو پہلے نصف میں ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ کچھ عرصہ مقدمہ کی سماعت ہو چکنے کے بعد ہمیں امید ہو چلی تھی کہ اگر عدالت کی کارروائی میں ڈھیل ہو تو شاید رہائی کی کوئی صورت نکل آئے۔ اس لیے سوچ بچار نے تو ریدہ سری پر سبقت لے لی تھی۔ اس کی دوسری وجہ ان کے بھائی کی اندوہناک موت تھی۔ وہ حیدرآباد ان سے ملنے آئے تھے اور اسے ایک روحانی پیشوا کی طرف سے ان کی رہائی کی خوشخبری لائے تھے۔ ابھی حیدرآباد میں ہی تھے کہ ۱۰ جولائی ۱۹۵۲ء کی صبح کو نماز پڑھتے ہوئے اس دنیا سے رحلت کر گئے۔ فیض صاحب کو ایسا صدمہ ہوا کہ مہینوں تک نیم مردہ حالت میں رہے۔ ایک دن تو چارپائی سے اترتے ہوئے بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑے۔ آوازیں سن کر ہم اور عطا بھاگے بھاگے گئے اور زمین سے اٹھا کر بستر پر لٹایا۔ یہ گھاؤ ابھی تک بھرا نہیں ہے، گو انہوں نے حسبِ عادت اسے کیموفلاج (CAMOUFLAGE) کر لیا ہے۔

فیض صاحب کی کیموفلاج کرنے کی عادت بھی عجب ہے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ سگرٹ ختم ہو گئے لیکن بجائے اس کے کہ ساتھیوں سے مانگ لیں، بے قراری دور کرنے کے لیے احاطے کے چکر کاٹنے شروع کر دیے۔ اس بے قراری کی تشخیص میں ہمیں کافی عرصہ لگا۔ ان کو چھپکلیوں سے بہت گھن آتی تھی۔ میرے حساب میں خوف کھاتے تھے۔ ایک دن ہم سب برآمدے میں چارپائیاں ڈال کر سونے کی تیاری میں تھے کہ فیض صاحب نے دفعتاً اٹھ کر ادھر ادھر چکر کاٹنے شروع کر دیئے۔ عطا کی چارپائی پاس ہی تھی۔ اس نے سوچا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ ہاتھ کی طرف دیکھا تو سگرٹ سلگ رہا تھا۔ فیض صاحب کی نظروں کا پیچھا کیا۔ دیکھا کہ ان کی نظریں بار بار چھت کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ وہ چارپائی کے پاس آتے تھے اور آگے نکل جاتے تھے اور گھوم کر یہی عمل دہراتے تھے۔ عطا نے چھپکلی کو دیکھ لیا اور اٹھ کر فیض صاحب کی چارپائی کھینچ کر ایک طرف کر دی۔

تیسرا رنگ کراچی کا ہے جہاں فیض صاحب دو ماہ کے لیے مقیم رہے۔ دراصل یہ رنگ دوسرے اور چوتھے کی درمیانی کڑی ہے۔ کراچی ہسپتال میں فیض صاحب جیل کی نسبت قدرے آزاد فضا میں رہے۔ دوستوں کے ساتھ بغیر کسی صاحب کے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ وہاں انہیں نوجوہ آزادی کی نعمتوں کا شدت سے احساس ہوا۔ اس شدید احساس کے بعد جب وہ منٹگمری آئے تو قید کا احساس بھی شدت کر گیا اور ان کی شاعری میں ظاہر ہوا۔ اسی لیے انہوں نے کراچی اور منٹگمری میں لکھی ہوئی غزلوں اور نظموں کے مجموعے کا نام زنداں نامہ تجویز کیا ہے۔

کراچی میں فیض صاحب نے اپنی معرکۃ الآرا نظم "ملاقات" لکھی۔ اس نظم کا پہلا بند اکتوبر ۱۹۵۳ء میں منٹگمری آکر مکمل ہوا تھا اور دوسرا اور تیسرا نومبر میں۔ اسے کراچی سے اس لیے منسوب کر رہا ہوں کہ وہ اس کے "مواتیم" کراچی سے لائے تھے۔ اس میں اس مانگ نے آگ کی رٹ سے جس پر جانسوز محرومی کے بعد کچھ پانی چھڑک دیا گیا ہو اور وقتی تسکین کے باوجود اسے اس بات کا شدت سے احساس ہو کہ تھوڑا سا پانی جو اسے میسر آیا ہے، سوکھنے والا ہے۔ یہ نظم درد کی انتہائی شدت کے ساتھ انسانی تسکین کی بھی مظہر ہے۔ اس میں ایمان و ایقان کی جگمگاہٹ بھی ہے، اس میں انسانی حوصلہ عزم اور حکمت کا راگ بھی گایا گیا ہے۔ ایسا حوصلہ، عزم اور حکمت جو صرف آج کے انسان کا طرۂ امتیاز ہیں جو دھرتی ماں پر بہت مضبوطی سے قدم جما کر ستاروں پر کمند پھینک رہا ہے اور مہتاب پر شب خون مارنے کی فکر میں ہے، جو پانی، ہوا، دریا، سمندر، برف و باراں اور کائنات کی دوسری پریوں اور دیوؤں کو مسخر کر چکا ہے یا ان کی تسخیر کیا چاہتا ہے، جس کی سینکڑوں ہزاروں سالوں کی الم نصیبی اور جگر فگاری کے اسرار آج اس کے لیے حرکت اور حرارت کا منبع بنے ہوئے ہیں۔

فیض صاحب کی جیل کی شاعری کا چوتھا رنگ منٹگمری کا ہے۔ یہاں ہم کم و بیش حیدرآباد کی سی سہولتیں میسر تھیں۔ جیل کے اربابِ اقتدار بھی نیک دل لوگ تھے، جو جیل کے قواعد و ضوابط سے سرِمو انحراف نہ کرنے کے باوجود ہماری دلجوئی میں لگے رہتے تھے۔ ان میں بعض اچھے ذوق کے لوگ بھی تھے جو ہمارے ساتھ ادبی چھیڑ چھاڑ جاری رکھتے تھے۔ ایک صاحب کو تو ایسا ڈھنگ آتا تھا کہ ان کے آنے کے کچھ ہی لمحے کے بعد فیض صاحب طوطی کی طرح چہچہانے لگتے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ دشمنوں نے ان پر کم گوئی کا الزام تراش لیا ہے۔ ان صاحب کو چرکین سے لے کر مرزا غالب تک سب شعرا کے کچھ نہ کچھ بھلے برے شعر یاد تھے اور انہوں نے تیرتھ رام فیروزپوری کے ناولوں سے لے کر سعادت حسن منٹو کی کہانیوں تک سب کچھ پڑھ رکھا تھا۔ وہ آتے ہی چلبلیک کے بعد شروع ہو جاتے اور فیض صاحب کی طرف سے توجہ ہونے یا نہ ہونے کی پروا کیے بغیر یہاں سے وہاں، وہاں سے کہیں اور کچھ نہ کچھ کہتے رہتے، حتیٰ کہ فیض کی کوئی ایسی رگ چھڑ جاتی کہ بعض اوقات میں بامروت میں آنکھوں سے کچھ کہے بغیر رہا نہ جاتا۔

منٹگمری میں فیض صاحب کو اپنی بیوی، بچیوں اور دوسرے دوستوں رشتہ داروں سے ملاقات میں بھی آسانیاں تھیں۔ دل بہلاوے کے لیے ہم نے اسی احاطے کے اندر ایک پھلواڑی بھی بنائی تھی جس کا سلسلہ بڑھتے بڑھتے سارے جیل میں پھیل گیا تھا بلکہ جیل کے باہر بھی نکل کر پھولوں کی نمائش تک جا پہنچی تھی۔ فیض کو پھولوں کا شوق اتنا تھا کہ انہوں نے ولا[illegible] اسی جو[illegible] میں اور ایک دست





نے دریچے بھولوں کے بیج منگوا لیے۔ پھول ایک بڑھتے پھولے پھلنے کی چیز ہے۔ ان سے جیل میں خوب جی بہلتا ہے اور کوئی نہ کوئی نئی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ آدمی قید کا ایک ایک دن گننے کی بجائے موسم گننے لگتا ہے جو طویل سے طویل قید میں بھی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ساتھ ہی نظریں مستقبل کی طرف رہتی ہیں کہ آنے والے موسم میں پھول لگانے کے لیے کیا کیا بندوبست کرنا ہے اور گزشتہ فصلوں کے اعادے سے بچاؤ کی کیا صورت ہے۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود منٹگمری میں فیض صاحب کو قید کا بہت شدید احساس تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بھی کہ حیدرآباد سے تبدیلی پر یاروں دوستوں سے جدائی کا بہت قلق تھا۔ ایک طرح سے گھر اُجڑ گیا تھا۔ دوسری وجہ میں بیان کر چکا ہوں کہ کراچی کے دورانِ قیام کی نسبتاً آزاد فضا کے بعد قید کا بوجھ زیادہ تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ سب سے بڑی وجہ شاید یہ بھی کہ مستقل قریب میں رہا ہو جانے کی اُمید کا جو موہوم سا چراغ اب تک جلتا رہا تھا، وہ اب خاموش ہو چکا تھا اور شروع شروع کی قیدِ تنہائی کا رنگ ایک حد تک عود کر آیا تھا۔ درد و غم کا طوفان اُمڈ پڑا تھا۔ اب وہ جیل کی دیواروں، دروازوں، سلاخوں، پہرہ داروں کو غور سے دیکھنے لگے تھے۔ پہلے باہر کی دنیا کے ساتھ تخیل کا بلا واسطہ تعلق تھا اب اسے بھی جیل کی دیواریں پھاند کر آنا جانا پڑتا تھا۔

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیمِ صبحِ وطن
یادوں سے معطر آتی ہے، اشکوں سے منور جاتی ہے

اس شعر میں نسیمِ صبحِ وطن کی دیواروں کو پھاندنے کی سرسراہٹ صاف سنائی دے رہی ہے اور اس کا بحران بسبب قیدی کو جیل والوں کی نظروں سے بچ بچا کر یادوں کا تحفہ دینا اور اس کے آنسوؤں کی سوغات لے جانا بھی نظر آ رہا ہے۔

جب تک سوہنی کامیابی سے چناب کو عبور کر کے مہینوال کو جا لیا کرتی تھی، اس وقت تک اس کے ذہن میں چناب کی لہریں اور گھڑے کی پختگی کا ایک موہوم سا تصور تھا۔ اس کی ساری توجہ مہینوال پر مرکوز رہتی تھی کہ وہ کیسا ہو گا، کیسے ملے گا اور رخصت کے وقت دل پر کیا گزرے گی۔ جب وہ کچے گھڑے کی مدد سے دریا میں ڈوبنے لگی، اس وقت نظریں یار کی کٹیا پر تھیں۔ لیکن کوئی دقت ایسا ضرور آیا ہو گا، جب پوری شدت کے ساتھ اس کو دریا کی ہستی کا احساس ہوا ہو گا اور کچے گھڑے کی چکنی مٹی ہاتھوں میں محسوس کر کے پکا گھڑا بھی یاد آیا ہو گا اور جب وہ مہینوال کی خاطر اپنی جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہو گی تو ایک لمحے کے لیے مہینوال کا تصور بھی ذہن سے اُتر گیا ہو گا۔ حیدرآباد کے قیام کے دوران میں فیض کا تصور باہر کی دنیا کے ساتھ بہت مضبوطی کے ساتھ جڑا رہا۔ جیل کی زندگی نے یہ رشتہ اور بھی مضبوط کر دیا تھا۔ دستِ صبا کے آخر میں فیض صاحب کی دو جیل نظمیں ”زنداں کی ایک شام“ اور ”زنداں کی ایک صبح“ اس پر شاہد ہیں۔ یہاں انھوں نے زنداں کے کرب المطر دیر کی بیساکی کا پورا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ لیکن ان کے چہرے پر تحیر آمیز مسکراہٹ ہے اور انھوں نے مسرت و شادمانی کے ایسے ذرائع نکال لیے ہیں، جو زنداں کے عقوبت کے احاطۂ قدرت سے باہر ہیں۔

دل سے پیہم خیال کہتا ہے — اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے — کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل

جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں — وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

گویا پھر خواب سے بیدار ہوئے دشمنِ جاں
سنگ و فولاد سے ڈھالے ہوئے جناتِ گراں
جن کے چنگل میں شب و روز ہیں فریاد کناں
میرے بیکار شب و روز کی نازک پریاں
اپنے شہپور کی رہ دیکھ رہی ہیں یہ اسیر
جس کے ترکش میں ہیں امید کے جلتے ہوئے تیر

کراچی کے قیام کے بعد یہ طلسم ٹوٹ گیا اور منٹگمری میں جیل اپنی پوری ہولناکی کے ساتھ روبرو آ گیا۔ چنانچہ ان کے دردِ دل نے دنیا بھر کے اسیروں کے رنج و الم کو اپنے اندر سمو لیا تھا۔ کینیا کے باشندوں پر جمہوریت اور آزادی کے دعویداروں کے ہاتھوں بے پناہ ظلم و ستم اور ان کے اپنے وطن کے مصائب بعض صاحب کے لیے سوہانِ روح بنے ہوئے تھے۔ وہ افریقی عورتوں کے کارہائے نمایاں سے خاص طور پر متاثر تھے۔ کئی دفعہ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ پاکستانی نہیں رہے، افریقی بن گئے ہیں۔ ان کی نظم ”آ جاؤ افریقا“ اس کی مظہر ہے۔

”ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے“ روزنبرگ (ROSENBERG) جوڑے کی بے مثال قربانی سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ یہاں وہ مرتے دم تک انسانیت کے مستقبل، انقلاب یا محبت یا ان سب کے ساتھ اپنی وفاداری جتلاتے رہتے ہیں۔ اس نظم کی آفاقیت (UNIVERSALITY) عجیب و غریب ہے۔ اس نے سرحدوں کو پاٹ کر پردے اور ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے، ہر ملک کے شہیدوں کو ایک صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ یہ نظم کربلا، یلاسی، سرنگاپٹم، مدکی، جھانسی، جلیانوالا، قصہ خوانی، سٹالن گراڈ، ملایا، کینیا، کوریا، ملنگاسہ، مراکش، طوس، سبھی سے متعلق معلوم ہوتی ہے اور طہران، کراچی اور ڈھاکہ کی سڑکوں پر دم توڑنے طلبہ، مراکش، طوس، کینیا اور ملایا کے خون میں لت پت مجاہد، سب ایک ہی ساتھ یہ نعرہ دُہراتے سنائی دیتے ہیں

تیرے کوچے سے چن کر ہمارے عَلَم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہِ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے

ہم منٹگمری میں ہی تھے کہ ایرانی محبانِ وطن کو جیل میں گولی کا نشانہ بنانے کی مفصل روداد امریکی رسالہ ”ٹائم“ میں آئی ساتھ ہی ان کی قتل گاہ میں لی گئی تصویر بھی تھی۔ سعدی اور حافظ کے وطن سے فیض صاحب کو خاص محبت ہے۔ کئی دن مضطر



رہے اور بالآخر ان کا اضطراب "آخری رات" کی شکل میں نمودار ہوا۔ یہ نظم ان خیالات و تصورات کی ترجمانی کرتی ہے جو قیدی کے ذہن میں اس رات گزرتے ہیں جس کی صبح کو اسے شہید ہونا ہوتا ہے۔ انسانیت کی راہ میں مرنے والوں کی کرشمہ سازیاں دیکھیے، شہدا کہاں کہاں اور کس کس رنگ میں نئے روپ دھار لیتے ہیں۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

فیض صاحب کی اس زمانے کی ذہنی کیفیت کی پوری پوری ترجمانی اگر کوئی نظم کرتی ہے تو وہ "دریچہ" ہے۔

منٹگمری سے دانتوں کے علاج کے سلسلے میں کوئی تین ہفتے کے لیے مارچ ۱۹۵۲ء میں ہمیں لاہور آنا پڑا۔ لاہور سے فیض صاحب کو والہانہ محبت ہے۔ وہ لاہور آنا بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے دل پر بار گزرے گا۔ یہاں آ کر لاہور کا پانی پیا، اس کی فضا میں سانس لیا، لاہور کی آوازیں سنیں اور لاہور کے بعض گمنام شخصوں سے جو حریت کی تحریک کے سلسلے میں جیل میں آئے ہوئے تھے، ملاقات ہوئی اور اسی دور میں نظم "اے روشنیوں کے شہر" کا ظہور ہوا، جس پر کوئی شہر صحیح معنوں میں فخر کر سکتا ہے۔

فیض صاحب کے دل میں لاہور اور لاہور والوں کی محبت کا جوش ایک دفعہ پہلے بھی امڈ پڑا تھا جب ۱۹۵۳ء میں لاہور کے گلی کوچے اس کے فرزندوں کے خون سے رنگین ہو گئے تھے۔ "لاہور کے نام" ابھی تک ادھوری ہے۔

منٹگمری میں ان کی شاعری کے بارے میں میری اور ان کی کافی بحث و تمحیص ہوا کرتی تھی۔ میں کوئی نہ کوئی بات کہتا رہتا تھا اور ان کو جواب دیئے بغیر چارہ نہ تھا۔ شاعر اور زمانہ والا معاملہ تھا۔ راہِ مفر ایک ہی تھی کہ سرکار کے آگے سرِ تسلیم خم کر کے مفرور نجات پاتے۔ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا مرتا کیا نہ کرتا۔ آج کل بھی مذاقاً کہا کرتے ہیں کہ "زنداں نامہ" کے زنداں نامہ ہونے میں "تمہاری" وابستگی کو بھی دخل ہے۔

قفس کی جیل کی شاعری میں وطن کی محبت کے چشمے ہر طرف پھوٹ رہے ہیں جو دھاگا اپنے دیس اور اس کے باسیوں کی خستہ حالی، قوم کی عزت و ناموس کی ارزانی، لوگوں کی ناداری، جہالت، بھوک اور رنج کو دیکھ دیکھ کر بے طرح تڑپ رہے ہیں۔

نثار میں تیری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے

بعض دفعہ کچھ اداس بھی ہو جاتے، جیالا ولولہ نکالنے لگتے ہیں اور جیل کی کال کوٹھڑی میں بیٹھے کبھی گرد آلود، پریشان حال سلاخوں سے وطن کی مانگ سنوارا دیکھنا چاہتے ہیں

بھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی

وطن کی محبت اس طرح ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے کہ اب اس کو دوسری محبتوں سے علیحدہ کر کے دیکھنا ناممکن ہو گیا ہے۔

جیا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں
ڈھونڈی ہے یونہی شوق نے آسائشِ منزل
رخسار کے خم میں کبھی کاکل کی شکن میں

زنداں میں یہ جاننے کی بات تھی کہ ہم سب کی حبِ وطن معمول سے زیادہ جوش پر رہتی۔ صبح شام پاکستان کا ذکر ہوتا رہتا تھا۔ بے بسی نے مزاجوں میں چڑچڑا پن پیدا کر دیا تھا۔ کبھی غصناک ہو جاتے تھے کبھی گریہ و زاری کو جی چاہتا تھا۔ دست و پا تو ناکارہ کر دئیے گئے تھے لیکن دل و جان پر آفت آئی ہوئی تھی۔

۱۹۵۱ء میں جب ہندوستان کے پاکستان کی طرف جارحانہ ارادوں کی خبریں شائع ہوئیں تو ہم میں سے ان افسروں نے جو ابھی تک معزول نہیں کیے گئے تھے، گورنمنٹ کو درخواست دی کہ پاکستان کی حفاظت میں ہم کو بھی جان لڑانے کی اجازت دی جائے، خاص طور پر جبکہ ہر ایک کو کشمیر میں ہندوستانی فوجوں سے لڑنے کا تجربہ ہے۔ درخواست میں واضح کر دیا گیا تھا کہ ہمارا مقصد مقدمے سے جان چھڑانے کا نہیں۔ ہم گورنمنٹ سے سوائے اس کے کچھ نہیں چاہتے کہ ہنگامی حالت کے دوران میں مقدمے کو ملتوی کر دیا جائے۔ یہ کوئی سٹنٹ (STUNT) بھی نہیں تھا، اس لیے کہ ہمیں معلوم تھا کہ ہندوستانی فوجوں کے تمام نشانہ ہندوستانی اکالی دربدر بھی ہوں گے اور مغربی پاکستان سے کوئی راہِ مفر نہیں تھی۔ ہماری درخواست مسترد کر دی گئی۔ بہرحال زمانہ گھر سے کھوٹے کی میر رود ناہید کرہی لے گا۔

نظیری کاستس سمائی کہ در ساغر چہ سے داری
کہ پشتِ زاہدان قدرِ گنہگاران تو دپیدا

ہندوستان اور پاکستان کا ذکر چل نکلا ہے۔ جیل میں فیض صاحب اکثر اپنے ہندوستانی دوستوں کو یاد کیا کرتے تھے۔ ان میں کئی ایک لاہور کے رہنے والے تھے۔ کئی دوسرے سالہا سال تک پنجاب میں رہ چکے تھے۔ مولانا حسرت موہانی، رشید جہاں، صاحبزادہ محمود الظفر، اسرار الحق مجاز، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، اندر سری چندا ختر، اُپندر ناتھ اشک اور ان کی بیگم، ملک راج آنند، کرشن چندر، ڈاکٹر اشرف، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری اور دوسرے کئی اصحاب کا ذکر میں نے اس دفعہ سنا ہے کہ محسوس کرتا ہوں کہ ان کے ساتھ ایک عرصہ سے جان پہچان ہے، حالانکہ ان میں سے میں کسی ایک کو بھی ذاتی طور پر نہیں جانتا۔ سجاد ظہیر اور فیض اکٹھے ہوتے تھے تو پھر باتیں ہی اکثر ان لوگوں کے بارے میں ہوا کرتی تھیں۔

۱۹۴۷ء کے فسادات کا زمانہ فیض صاحب نے لاہور میں گزارا تھا۔ اسی دوران وہ مشرقی پنجاب بھی ہو آئے تھے۔ طرفین کے ساہوکاروں اور سورمیروں نے جس طور پر انسانیت کو ذلیل کیا تھا، اس کا آنکھوں دیکھا حال اکثر سنایا کرتے تھے۔ بیان کرتے کرتے رقت طاری ہو جاتی اور رک جاتے۔ میرے خیال میں وہ اتنے تڑپے ہمارے پاس



تعصب سے اس ہولناک خانہ جنگی کو دیکھنے پر مجبور رہے ہیں کہ شعروں میں اس کو لانے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ وقت ملنے پر وہ ناول یا ڈرامے کے ذریعے پنجاب کی اس ٹریجڈی کو بیان کریں۔ پنجاب کی سرزمین یوں تو ہزاروں سالوں سے حملہ آوروں کی تاخت و تاراج کا شکار رہی ہے۔ شاید ہی یہاں کی کوئی نسل ایسی گزری ہوگی جس نے غیر ملکی گھوڑوں کے سُموں کی ٹاپ نہ سنی ہو۔ لیکن ان حملہ آوروں میں سے اکثر بگولے کی طرح آتے تھے اور آندھی کی طرح گزر جاتے تھے۔ تلوار کے سائے تلے جینے کی ذلت کچھ کم نہیں ہوتی، لیکن ۱۹۴۷ء میں جس طرح پنجابیوں نے پنجابیوں کو ذلیل و خوار کیا، تمام حملہ آوروں نے مل کر بھی نہیں کیا ہوگا۔ امرتا پریتم کے الفاظ میں:

اَج آکھاں وارث شاہ نوں کتوں قبراں وچوں بول
تے اَج کتابِ عشق دا کوئی اگلا ورقہ پھول
اِک روئی سی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے وَین
اَج لکھاں دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہن
اُٹھ درد منداں دیا دردیا، اُٹھ تک اپنا پنجاب
اَج بیلے لاشاں وچھیاں تے لہو دی بھری چناب
کسے نے پنجاں پانیاں وچ دِتی زہر رلا
تے اوہناں پانیاں دھرت نوں دتا پانی لا
دھرتی تے لہو وسیا قبراں پیاں چون
پریت دیاں شہزادیاں اَج وچ مزاراں رون
اَج سبھے کیدو بن گئے حسن عشق دے چور
اَج کتھوں لیائیے لبھ کے وارث شاہ اک ہور

فیض صاحب پاکستان میں بعض اصحاب کے اس نظریے پر سخت رنجیدہ خاطر ہوا کرتے تھے کہ ہر وہ چیز جس کا تعلق ہندوستان سے بھی ہے۔ پاکستان کے لیے زہرِ ہلاہل ہے۔ ریڈیو پر سوائے اقبال کے کلام کی قوالیوں اور فلمی گانوں کے کچھ سننے میں نہیں آتا۔ حالانکہ ہم جیل والوں سے بچ بچا کر ہندوستانی ریڈیو اسٹیشنوں سے اپنے دیس کے راگ سنا کرتے تھے۔ کسی جاہل نے رحیم جو دوئی جوش میں آ کر امیر خسرو، تان سین، واجد علی شاہ، عبدالکریم خاں، فیاض خاں اور دوسرے موسیقی اساتذہ اور رعنا سے پاکستان کا رشتہ توڑنے کو عین حب الوطنی سمجھ لیا تھا۔

ملکوں کی سیاسی و اقتصادی حدیں وقت کے تقاضوں کے مطابق بدلتی رہتی ہیں لیکن ایک خطۂ زمین کے کلچر، زبان، ادب، آرٹ، موسیقی، فنِ تعمیر اور دوسری ثقافتی قدروں کا قوام سیکڑوں، ہزاروں سالوں کی ریاضت کے بعد تیار ہوتا ہے اور اس کی بنیادی ترکیب میں تبدیلی آسان نہیں ہوتی۔ پاکستان اور ہندوستان میں سیاسی دھینگا مشتی کیسی بھی صورت اختیار کر جائے دلی، لکھنؤ، حیدرآباد اور لاہور کی گنگا جمنی تہذیبیں اسی جگہ قائم رہیں گی اور میر اور غالب میں سب کی ساجھ رہے گی۔ ہندوستانی اور پاکستانی ہندوستانیوں کے دلوں کی جڑیں موہنجو داڑو، گیا، ہڑپہ، گندھارا، ٹیکسلا، متھرا، بنارس، اجنتا، اجمیر، قطب مینار، تاج محل، جامع مسجد، شالامار ہر جگہ پھیلی ہوئی ہیں۔ شاخیں کہیں سمرقند و بخارا اور کہیں عرب و عجم سے آئے ہوؤں سے پیوند پر بہار دکھا رہی ہیں اور کہیں پرانی ڈالیں جڑوں کی توانائی قائم ہیں۔ دوسرے کی ضد میں جڑوں کو نقصان پہنچانا یا شاخوں کی طرح کھسوٹ کرنا اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنا ہے۔

فیض صاحب ان انساب اور روایات سے تعلق رکھتے ہیں جو ہزاروں سالوں سے دونوں ملکوں کی سرزمین کا خاصہ رہی ہیں۔ وہ اسی سلسلے کی کڑی ہیں، جسے امیر خسرو، بھگت کبیر، خواجہ معین الدین چشتی، بابا نانک، بابا فرید، ابوالفضل، فیضی، بُلھے شاہ، وارث شاہ، شاہ عبداللطیف بھٹائی، رحمان بابا اور دوسرے مست رنگوں نے فیض بخشا ہے۔

حیدرآباد میں ان کا درس و تدریس کا سلسلہ عجب متنوع قسم کا تھا۔ کوئی قرآنِ مجید اور حدیث شریف کا درس لے رہا ہے۔ تو کوئی صوفیائے کرام کی تصانیف فتوح الغیب، کشف المحجوب، احیاء العلوم وغیرہ کے رموز و نکات سمجھ رہا ہے۔ کوئی انگریزی اور یورپی ادب کی الجھنیں پیش کر رہا ہے تو کسی نے مارکسی جدلیاتی فلسفے پر بحث شروع کر رکھی ہے۔ اُردو فارسی ادب تو تکیۂ کلام تھا۔ حیدرآباد میں ہم نے ان کو شاگرد کے روپ میں بھی دیکھا ہے۔ پُشتی کے ساتھ مل کر سید سجاد ظہیر سے فرانسیسی زبان سیکھا کرتے تھے۔ نہایت غبی اور کام چور طالب علم تھے۔ سید صاحب کی استادانہ گھڑکیاں اور فیض صاحب کی بہانہ سازیاں سب لطف دیا کرتی تھیں۔

محنت کشوں سے انہیں خاص الفت ہے۔ حیدرآباد میں ایک بار ہمارے احاطے میں بجلی کے کھمبے کا فیوز (FUSE) جل گیا۔ ایک مستری معہ سیڑھی کے وہاں پہنچ گیا۔ ہم جھلانے لگے کہ خواہ مخواہ وقت ضائع کرنے کے لیے آ گیا ہے۔ اس نے کھمبے کو ذرا ٹھوکا بجایا اور یہ جا وہ جا۔ معہ سیڑھی کے کھمبے کے سرے تک پہنچ کر آنکھ جھپکنے میں فیوز لگا آیا۔ فیض صاحب دیر تک اس کے قصیدے پڑھتے رہے۔ منٹگمری میں شاہ جی، ایک پوسٹ مین ہمارے پارسل وغیرہ لایا کرتے تھے۔ ان کو دیکھ کر فیض صاحب کی آنکھوں میں جس قسم کی روشنی آ جایا کرتی تھی وہ میں نے کم ہی دیکھی ہے۔ دونوں ٹریڈ یونین کے ممبر رہ چکے تھے۔ کہا کرتے ہیں ہندوستان پاکستان کے مسائل کا حل ایک ہی ہے کہ دونوں ملکوں میں محنت کش اپنے حقوق حاصل کر کے اپنے اپنے ملکوں کے والی بن جائیں۔ اس کے بعد ان ملکوں کے درمیان نفرت کا زہر اور اس کو پیدا کرنے والے حل طلب مسائل، جن کی آڑ میں سامراجی آج کل اپنے آہنی پنجے وطنِ عزیز کی رگوں میں دوبارہ پیوست کر رہے ہیں، یوں غائب ہو جائیں گے جیسے دادی اماں کی پریوں کے قصوں میں ہیرو کے اسم پڑھنے پر دیو بھوت اور دوسری بلائیں آناً فاناً رفع دفع ہو جاتی ہیں۔

فیض کی شاعری میں ایک صاحبِ دل کا جوش اور ولولہ ہے۔ اس میں قوم کی قوم کا دل دھڑک رہا ہے۔ لیکن ساتھ کہنا ہے کہ اس کے کلام میں پاکستان کے محنت کشوں کا مبارک پسینہ اور خون کی حرارت ابھی تک پوری شدت سے شامل نہیں ہے۔ جسم و گلاب کو جس جمالیات سے یاد کیا ہے۔ اسی جمالیات اور تفصیل سے اس مدعا



دیسیب کا ذکر ہیں ہے، جس نے سمن وگلاب کو اپنے خونِ جگر سے سینچ کر شاداب کیا ہے اور جس کو یہ پہنچتا ہے کہ وہ بھی ان سمن و گلاب کی رنگتوں، رنگ و روپ اور عطر سے مستفید ہو سکے۔ ان کا دل تو ادھر کھنچا جا رہا ہے لیکن

معذرتِ پاسِ ہے یا سہی آدابِ ابھی

ان کی شاعری کو ڈرائنگ روموں، سکولوں، کالجوں سے نکل کر شہر کی بازاروں، گلیوں اور کارخانوں میں ابھی پہنچنا ہے۔

وہ کہا کرتے ہیں کہ یہ چیز صرف پنجابی میں ہو سکتی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں، "اُن کی معمول کے مطابق کسر نفسی ہے اور حق بجانب ہیں"۔ دستِ صبا کے ابتدائیہ میں انھوں نے دیا ہے: "یوں کہیے کہ شاعری کا کام صرف مشاہدہ ہی نہیں مجاہدہ بھی اس پر واجب ہے۔ گردوپیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے۔ اسے دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر، اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا، اس کے شوق کی سلامت اور لہو کی حرارت پر۔ اور تینوں کام مسلسل کاوش اور ریاضت چاہتے ہیں۔" آگے فرماتے ہیں کہ "حیاتِ انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسبِ توفیق شرکت زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔" یہ دیوان اسی امر کی غمازی کرتا ہے کہ فیض کے مشاہدہ اور مجاہدہ کے مابین مجاہدہ کا پلڑا بھاری ہو رہا ہے اور یہی اس وقت ان کے فن کا تقاضا بھی معلوم ہوتا ہے۔

اب ان کی نظریں لاہور کے ماحول سے اٹھ کر پاکستان کے وسیع میدانوں پر پڑنے لگی ہیں۔ جہاں بے شمار انسان مٹی کے تودے صدیوں سے ایک ہی طرح کی دھیمی دھیمی حرکت کر رہے ہیں۔ اب ان تودوں کی کمریں کچھ سیدھی ہو رہی ہیں ان کو اس دکھ کا احساس ہو رہا ہے جو انھوں نے قرنوں سے اٹھا رکھا ہے کیونکہ ان پر آہستہ آہستہ یہ بھید کھل رہا ہے کہ بعض دوسرے دیسوں میں ان کے بھائی بندوں سے یہ دکھ دور ہو گیا ہے اور وہ لوگ اب انسانی عظمت میں برابر کے شریک ہیں۔ ان کی آنکھوں میں ایک طرح کا نور ہے کیونکہ وہ دور افق پر زندگی اور توانائی کی اٹھتی ہوئی گھٹتی بڑھتی روشنی دیکھ رہے ہیں۔ لیکن یہ لوگ کسی پرانی بیماری کی طرح جو جاتی نہیں، اسے پرانے لوگ آنا دیکھے، ابھی تک لجا رہے ہیں، سہار رہے ہیں اور دیس کی کمائی اور برکت ان سے چھینی جا رہی ہے۔ فیض صاحب کی نظریں کارخانوں میں بھی گھس رہی ہیں جہاں کسانوں کے ساتھی مزدور انسان کی تخلیقی قوت اور اس کی عظمت کا درس حاصل کر رہے ہیں۔ فیض یہ سب کچھ خود ہی نہیں دیکھ رہے بلکہ لاہوری بھائی بندوں، دماغی مزدوری کرنے والے مصنفوں، کلرکوں، چھوٹے دکانداروں، وکیلوں، ٹیچروں، طالب علموں، گاموں اور ماجھوں کو بھی دکھلا رہے ہیں اور پکار رہے ہیں کہ کارگہِ ہستی میں جو رن پڑ رہا ہے اس میں حق و باطل کے لشکروں کو پہچانو۔ "ناداری، دفتر، بھوک اور غم" نے جو گھیرا ڈال کر بھائیوں، ساتھیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے اور ہماری عزت اور ناموس خاک میں ملا دی ہے۔ مصائب کی گرانی کی زنجیر کی بے حرمتی کر دی ہے۔ لیکن

نادوں کے گریبانوں کے رفو
پر دل کی گزر کب ہوتی ہے
اک بخیہ ادھیڑا ایک سیا
یوں عمر بسر کب ہوتی ہے

اس کارگہِ ہستی میں جہاں
یہ ساغر شیشے ڈھلتے ہیں
ہر شے کا بدل مل سکتا ہے
سب دامن پُر ہو سکتے ہیں

—

اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں
جب لوٹ جھپٹ سے ہستی کی
دکانیں خالی ہوتی ہیں
یاں پربت پربت ہیرے ہیں
یاں ساگر ساگر موتی ہیں

کچھ لوگ ہیں جو اس دولت پر
پردے لٹکاتے پھرتے ہیں
ہر پربت کو ہر ساگر کو
نیلام چڑھاتے پھرتے ہیں

کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑ کر
یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اٹھائی گیروں کی
ہر چال الجھائے جاتے ہیں

ان دونوں میں رن پڑتا ہے
نت بستی بستی نگر نگر
ہر بستے گھر کے سینے میں
ہر چلتی راہ کے ماتھے پر

یہ کالک بھرتے پھرتے ہیں
وہ جوت جگاتے پھرتے ہیں
یہ آگ لگاتے پھرتے ہیں
وہ آگ بجھاتے پھرتے ہیں

سب ساغر شیشے لعل و گہر
اس بازی میں بد جاتے ہیں
اٹھو سب خالی ہاتھوں کو
اس رن سے بلاوے آتے ہیں

"زنداں نامہ" میں فیض صاحب نے حق و باطل کی اس ہولناک جنگ میں بہادروں کی بہادری کے واقعات کا تذکرہ شروع کر دیا ہے۔ اس کی ابتدا وہ 'دستِ صبا' میں "ایرانی طلبہ کے نام" لکھ کر چکے ہیں، لیکن ابھی تک ان کی یہ عادت پوری طرح بس کی گئی کہ وہ آتش فشاں پہاڑ کے دھوئیں کے پہلے مرغولہ (PUFF) کو ہی لے بیٹھے ہیں۔ اور جب یہ دھواں ہوا کے جھونکوں سے منتشر ہو جاتا ہے تو رنجیدہ خاطر ہو جاتے ہیں۔ یا طوفان کی پہلی موج میں ہی محوِ تماشا ہو جاتے ہیں اور جب اسے ساحل کی ریتی میں جذب ہوتا دیکھتے ہیں تو فرطِ درد سے بے حال ہو جاتے ہیں یا بڑھتے ہوئے لشکر کے سب سے اگلے ہراول دستے کو شکست ہو جاتی ہے تو ان کو رنجیدہ دیکھ کر تمام نظامِ کائنات کو آگ لگا دینا چاہتے ہیں۔ ایسے درد کی فراوانی ہر نیک دل کا خاصہ ہوتی ہے۔ لیکن اگر آتش فشاں میں دور گرج کو سنا جائے اور اس کے چند لمحوں میں اُبلنے والے لاکھوں ٹن لاوا کا تصور کیا جائے یا پہلی لہر کے پیچھے پھیلے ہوئے بے کنار سمندر کا خیال کیا جائے تو دھوئیں کے پہلے مرغولے کے بکھرنے، طوفان کی پہلی لہر کے جذب ہو جانے اور ہراول دستوں کے ہارنے میں درد و غم کی جگہ مجاہدانہ تڑپ آ جاتی ہے۔ زندگی کے سامنے گھرے ہونے کی بجائے اس کی رنگینیوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان تینوں کی موت پر رونے دھونے کی بجائے ان کی یادگار منانے کو جی چاہتا ہے۔ وہ عشق و محبت کے پہلے کتنے ہی فتح کے مالک بھی ہیں اور ان کی موت زندگی کا رس ہے۔ فیض صاحب کا کینوس ذرا اور وسیع ہو جائے تو بلاشبہ ہمارے ادب کے گورکی بن جائیں گے۔ اس سے زیادہ اس رتبہ کا اور کون مستحق ہے؟ بدقسمتی سے حالات کچھ ایسے ہیں کہ ان میں رہ کر ایک جان کے ساتھ کیا کچھ کر سکتا ہے؟

منٹگمری میں میری ایک ڈیوٹی فیض صاحب کے لیے سامان فراہم کرنا تھی اس کا ایک ذریعہ یہ تھا کہ میں ان کا تازہ کلام سید سجاد ظہیر صاحب کو مچھ جیل میں اور عطا اور روشنی کو حیدر آباد بھیج دیا کرتا تھا۔ سید سجاد ظہیر کے ایک خط کا اقتباس اس مصرف کے اختتام کے لیے مناسب رہے گا۔

سنٹرل جیل

مچھ بلوچستان۔ ۲۱ر فروری ۱۹۵۴ء

آئندہ میں زیادہ باقاعدگی سے تمہارے خطوں کا جواب دوں گا۔ اس ارادے میں صرف اخلاقی فرض ہی کا تقاضا نہیں بلکہ میری خودغرضی بھی شامل ہے۔ تمہارے خطوں سے دوستی اور التفات کی لطیف مہک آتی ہے۔ جس سے رنجور دل کو بے انتہا ٹھنڈک پہنچتی ہے۔ اس طرح ہم تنہائی میں گفتگو کر لیتے ہیں۔ تھوڑی سی فلسفیانہ اور ادبی موشگافیاں کر لیتے ہیں اور آہنی دیواروں میں

کسی قدر رخنہ ڈال کر جیسے نکلتے ہوئے سورج کی کرنوں سے دریا دیر کے لیے دل کو منور کر لیتے ہیں۔ پھر اس کے علاوہ تم فیض کے کلام کے تحفے بھی بھیجتے ہو اور اب کی تو تم نے اس کے انبار لگا دیئے ہیں، ان کے لیے فیض اور تمہارا بہت بہت شکریہ۔ یہ تو ایسا عطیہ ہے جس کا عوض مجھ سے کبھی ادا ہی نہیں ہو سکتا۔

فیض کی نظم "ملاقات" مجھے پسند آئی ہے۔ اس میں علائم کی مرقع نگاری اپنے کمال کو پہنچ گئی ہے اور پہلے مصرعے سے شروع ہو کر یہ رات اس [illegible] نظم کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ خوبصورت تشبیہوں اور استعاروں کے جیسے [illegible] پھول چاروں طرف کھلتے چلے گئے ہیں۔ جن میں ہر ایک ایسا ہے جو اپنی جداگانہ خوشبو اور رنگ بھی رکھتا ہے اور دوسروں کے ساتھ ہم آہنگ اور ہموار بھی ہے۔ نظم کا بنیادی خیال پوری تفصیل کے ساتھ بڑی کامیابی سے ملایا گیا ہے، جیسے ایک حسین اور نازک جسم میں درد مند، حساس اور لطیف روح ہو۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ غم، جھنجھلاہٹ، شدتِ درد اور ان سب کے باوجود، بلکہ ان کے وسیلے سے نمودار ہونے والی ذہنی سحر کے تصور کو گرفت میں لانے کے بعد شاعر نے اُسے نظم کا جامہ پہنایا ہے، بلکہ یہاں پر یہ طلسم ہست آور خیال اور تصور جیسے شاعرانہ تخیل کا ثمر ہے اور پوری نظم کے گلدستے سے دل آویز اور روح افزا رنگینیوں اور نکہتوں کے ساتھ جھلک پڑتا ہے۔ تیسرے بند کے شروع کے چار مصرعے جہاں سے گریز کیا گیا ہے، اپنی فصاحت، [illegible]، روانی اور زورِ کلام کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتے۔ انہیں ایک بار پڑھ لو تو دل پر نقش ہو جاتے ہیں اور پھر بھولتے نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اتوار کی صبح کو کسی کلیسا کی گھنٹیاں لنگ لنگ کر بج رہی ہوں اور ان کی مسلسل آواز صرف سامعہ میں نہیں بلکہ سارے جسم کے پوروں میں سرایت کر رہی ہو۔ فیض کی شاعری کا یہ رنگ جس کو لوگ جس بات کو کہتے ہیں، اس میں ہلکے کی دردناکی اور فضا کی نرمی ایک چیز ہے۔ مجھے اس کی خوشی ہے کہ ان مصرعوں میں وہ رنگ نہیں ہے۔ اچھے اور بڑے شاعر اپنا رنگ ضرورت اور موقع کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں گو وہ اپنی فطرت نہیں بدل سکتے۔

:.... تم نے اپنے گزشتہ خط میں اس کی طرف اشارہ کیا تھا کہ اب انہیں ہمت کر کے ایک جست لگانی چاہیے، تاکہ ان کی شاعری میں خوشبو، نغمہ اور گل حزیں کے علاوہ تیغِ صدا کے اس سارے پسینے اور خون کی حرارت کی آمیزش بھی ہو جس سے فی الحقیقت زندگی جنم لیتی اور سنورتی ہے۔ میں اس خیال سے بالکل متفق ہوں۔ البتہ میں انہیں ایسا کرنے کے لیے دھکا نہیں دینا چاہتا۔ ان کی جدید نظموں کے علامات کے سبب سے جو حالیہ نظموں اور غزلوں میں خود ہی نظر آ رہی ہیں، جو کہ صحیح شعوری جست کا پیش خیمہ ہیں۔

میرے خیال میں وہ خود اس نکتہ کو سمجھتے ہیں۔ پنجاب کی سرزمین صدیوں پہلے بابا فرید، وارث شاہ، بُلھے شاہ کی دنیاوں میں دوسرے حالات اور دوسرے ماحول میں ایسی جمہوری شاعری پیدا کر چکی ہے، ہمارے یہاں کبیر، تلسی، سُور ہو چکے ہیں۔ ایسے ہیں پھر کیوں نہیں چھوئے جا سکتے۔

اس کی داد تو فیض مرزا یوسف سے بھی لے لیں۔ جعفر علی خان اثر تو الگ رہے



فیض از فیض

فیض احمد فیض

اپنے بارے میں باتیں کرنے سے مجھے سخت وحشت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ سب لوگوں کا مرغوب شغل یہی ہے۔ اس انگریزی لفظ کے لیے معذرت چاہتا ہوں لیکن اب تو ہمارے ہاں اس کے مشتقات بوریت وغیرہ بھی استعمال میں آنے لگے ہیں اس لیے اب اسے اردو روزمرہ میں شامل سمجھنا چاہیے۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے اپنے بارے میں قیل و قال بری لگتی ہے۔ بلکہ میں تو شعر میں بھی حتی الامکان واحد متکلم کا صیغہ استعمال نہیں کرتا، اور 'میں' کے بجائے ہمیشہ سے 'ہم' لکھتا آیا ہوں۔ چنانچہ جب ادبی سراغرساں حضرات مجھ سے یہ پوچھنے بیٹھتے ہیں کہ تم شعر کیوں کہتے ہو تو بات ٹالنے کے لیے جو دل میں آئے کہہ دیتا ہوں۔ مثلاً یہ کہ بھئی میں جیسے بھی کہتا ہوں تم شعروں سے خود ڈھونڈ لو، میرا سر کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن ان آیاسی ذہنیت قسم کے لوگ جب بھی نہیں مانتے۔ چنانچہ آج کی گفتگو کی سب ذمہ داری ان حضرات کے سر ہے مجھ پر نہیں ہے۔

شعر گوئی کا واحد عذر گناہ تو مجھے نہیں معلوم۔ اس میں بچپن کی فضائے گردوپیش میں شعر کا چرچا، دوست احباب کی ترغیب اور دل کی لگی سبھی کچھ شامل ہے۔ یہ نقش فریادی کے پہلے حصے کی بات ہے جس میں ۱۹۲۸ء سے ۳۵-۱۹۳۴ء تک کی تحریریں شامل ہیں، جو ہماری طالب علمی کے دن تھے، یوں تو ان سب اشعار کا قریب قریب ایک ہی ذہنی اور جذباتی واردات سے تعلق ہے ——— اور اس واردات کا ظاہری محرک تو وہی ایک حادثہ ہے جو اس عمر میں اکثر نوجوان دلوں پر گزر جایا کرتا ہے۔ لیکن اب جو دیکھتا ہوں تو یہ دور بھی ایک دور نہیں تھا بلکہ اس کے بھی دو الگ الگ حصے تھے جن کی داخلی اور خارجی کیفیت کافی مختلف تھی۔ وہ یوں ہے کہ ۲۰ء سے ۳۰ء تک کا زمانہ ہمارے ہاں معاشی اور سماجی طور سے کچھ عجب طرح کی بے فکری، آسودگی اور ولولہ انگیزی کا زمانہ تھا، جس میں اہم قومی اور سیاسی تحریکوں کے ساتھ ساتھ نثر و نظم میں بیشتر سنجیدہ فکر و مشاہدہ کے بجائے کچھ رنگ رلیاں منانے کا سا انداز تھا۔ شعر میں اولاً حسرت موہانی اور ان کے بعد جوش، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی کی ریاست قائم تھی، افسانے میں یلدرم اور تنقید میں حسن برائے حسن اور ادب برائے ادب کا چرچا تھا۔ نقش فریادی کی ابتدائی نظمیں، 'خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو'، 'مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو'، 'تہ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں' وغیرہ وغیرہ اسی ماحول کے زیر اثر مرتب ہوئیں اور اس فضا میں ابتدائے عشق کا تحیر بھی شامل تھا۔ لیکن ہم لوگ اس دور کی آخری جھلک ہی دیکھ پائے تھے کہ صحبت یار آخر شد۔ پھر دیس پر عالمی کساد بازاری کے سائے ڈھلنے شروع ہوئے۔ کالج کے بڑے بڑے بانکے تیس مار خاں تلاش معاش میں گلیوں کی خاک پھانکنے لگے۔ یہ وہ دن تھے جب یکایک بچوں کی ہنسی بجھ گئی، اجڑے ہوئے کسان کھیت کھلیان چھوڑ کر شہروں میں مزدوری کرنے لگے اور اچھی خاصی شریف بہو بیٹیاں بازار میں آ بیٹھیں۔ گھر کے باہر یہ حال تھا اور گھر کے اندر مرگ سوز محبت کا کہرام مچا تھا۔ یکایک یوں محسوس ہونے لگا کہ دل و دماغ پر سبھی راستے بند ہو گئے ہیں اور اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ اس کیفیت کا اختتام جو نقش فریادی کے پہلے حصے کی آخری نظموں کی کیفیت ہے ایک نسبتاً غیر معروف نظم پر ہوتا ہے جسے میں نے یاس کا نام دیا تھا وہ یوں ہے:

یاس

بربط دل کے تار ٹوٹ گئے
ہیں زمیں بوس راحتوں کے محل
مٹ گئے قصہ ہائے فکر و عمل
بزم ہستی کے جام پھوٹ گئے
چھن گیا کیف کوثر و تسنیم
زحمت گریہ و بکا بے سود
شکوۂ بخت نارسا بے سود
ہو چکا ختم رحمتوں کا نزول
بند ہے مدتوں سے باب قبول
بے نیاز دعا ہے رب کریم
بجھ گئی شمع آرزوئے جمیل
یاد باقی ہے بے کسی کی دلیل
انتظار فضول رہنے دے
راز الفت نباہنے والے
بار غم سے کراہنے والے
کاوش بے حصول رہنے دے

۱۹۳۴ء میں ہم لوگ کالج سے فارغ ہوئے اور ۱۹۳۵ء میں میں نے ایم اے او کالج امرتسر میں ملازمت کر لی۔ یہاں سے میری اور میرے بہت سے ہمعصر لکھنے والوں کی ذہنی اور جذباتی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دوران کالج میں اپنے رفقا صاحبزادہ محمود الظفر مرحوم اور ان کی بیگم رشید جہاں سے ملاقات ہوئی۔ پھر ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی، مزدور تحریکوں کا سلسلہ شروع ہوا اور یوں لگا کہ جیسے گلشن میں ایک نہیں کئی دبستان کھل گئے ہیں۔ اس دبستان میں سب سے پہلا سبق جو ہم نے سیکھا تھا کہ اپنی ذات باقی دنیا سے الگ کر کے سوچنا اول تو ممکن ہی نہیں، اس لیے کہ اس میں بہرحال گردوپیش کے سبھی تجربات شامل ہوتے ہیں اور اگر ایسا ممکن ہو بھی تو انتہائی غیر سود مند فعل ہے کہ ایک انسانی فرد کی ذات اپنی سب محبتوں اور کدورتوں، مسرتوں اور رنجشوں کے باوجود بہت ہی چھوٹی سی، بہت ہی محدود اور حقیر شے ہے۔ اس



کی وسعت اور پہنائی کا پیمانہ تو باقی عالم موجودات سے اس کے ذہنی اور جذباتی رشتے ہیں، خاص طور سے انسانی برادری کے مشترکہ دکھ درد کے رشتے۔ چنانچہ غم جاناں اور غم دوراں تو ایک ہی تجربے کے دو پہلو ہیں۔ اس نئے احساس کی ابتدا نقش فریادی کے دوسرے حصے کی پہلی نظم سے ہوتی ہے۔ اس نظم کا عنوان ہے: "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" اور اگر آپ غائر ہیں تو مرے محبوب نہ مانگ "

"مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ"

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخاب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

اس کے بعد سترہ اٹھارہ برس "نگری نگری پھرا مسافر" میں گزرے اور پھر فوج، صحافت، ٹریڈ یونین وغیرہ میں گزارنے کے بعد ہم چار برس کے لیے جیل خانے چلے گئے۔ نقش فریادی کے بعد کی دو کتابیں "دست صبا" اور "زنداں نامہ" اسی جیل خانے کی یادگار ہیں۔ بنیادی طور سے تو یہ تحریریں انھیں ذہنی محسوسات اور معمولات سے منسلک ہیں جن کا سلسلہ "مجھ سے پہلی سی محبت" سے شروع ہوا تھا لیکن جیل خانہ عاشقی کی طرح خود ایک بنیادی تجربہ ہے، جس میں فکر و نظر کا ایک آدھ نیا دریچہ خود بخود کھل جاتا ہے۔ چنانچہ اول تو یہ ہے کہ ابتدائے شباب کی طرح تمام حسیات یعنی Sensations پھر تیز ہو جاتی ہیں اور صبح کی پو، شام کے دھندلکے، آسمان کی نیلاہٹ، ہوا کے گداز کے

بارے میں وہی پہلا سا تحیر لوٹ آتا ہے۔ دوسرے یوں ہوتا ہے کہ باہر کی دنیا کا وقت اور فاصلے دونوں باطل ہو جاتے ہیں، نزدیک کی چیزیں بھی بہت دور ہو جاتی ہیں اور دور کی نزدیک اور فردا و دی کا تفرقہ کچھ اس طور سے مٹ جاتا ہے کہ کبھی ایک لمحہ قیامت معلوم ہوتا ہے اور کبھی ایک صدی کل کی بات۔ تیسری بات یہ ہے کہ فراغت ہجراں میں فکر و مطالعہ کے ساتھ عروس سخن کے ظاہری بناؤ سنگھار پر توجہ دینے کی زیادہ مہلت ملتی ہے۔ جیل خانے کے بھی دو دور تھے۔ ایک حیدرآباد جیل کا جو اس تجربے کے انکشاف کے تحیر کا زمانہ تھا، ایک منٹگمری جیل کا جو اس تجربے سے اکتاہٹ اور تھکن کا زمانہ تھا۔ ان دو کیفیتوں کی نمائندہ یہ دو نظمیں ہیں، پہلی "دست صبا" میں سے دوسری "زنداں نامہ" میں سے

زنداں کی ایک شام

شام کے پیچ و خم ستاروں سے
زینہ زینہ اتر رہی ہے رات
یوں صبا پاس سے گزرتی ہے
جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات
صحن زنداں کے بے وطن اشجار
سرنگوں، محو ہیں بنانے میں
دامن آسماں پہ نقش و نگار

شانۂ بام پر دمکتا ہے
مہرباں چاندنی کا دست جمیل
خاک میں گھل گئی ہے آب نجوم
نور میں گھل گیا ہے عرش کا نیل
سبز گوشوں میں نیلگوں سائے
لہلہاتے ہیں جس طرح دل میں
موج درد فراق یار آئے

دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

"اے روشنیوں کے شہر"

سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے پھیکی زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر



فیضؔ

ان دمکتے ہُوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے؟
یہ حسیں کھیت، پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا!
کس لیے ان میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے

یہ ہر اک سمت پُر اسرار کڑی دیواریں
جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ
یہ ہر اک گام پہ اُن خوابوں کی مقتل گاہیں
جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ

یہ بھی ہیں، ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہُوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کمبخت دلآویز خطوط
آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے

اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

دور افق تک گھٹتی، بڑھتی، اٹھتی، گرتی رہتی ہے
کہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر
بستا ہے اس کہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر
اے روشنیوں کے شہر
اے روشنیوں کے شہر

کون کہے کس سمت ہے تیری روشنیوں کی راہ
ہر جانب بے نور کھڑی ہے ہجر کی شہر پناہ
تھک کر ہر سو بیٹھ رہی ہے شوق کی ماند سپاہ
آج مرا دل فکر میں ہے
اے روشنیوں کے شہر

شب خوں سے منہ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رَو
خیر ہو تیری لیلاؤں کی، ان سب سے کہہ دو
آج کی شب جب دیے جلائیں اونچی رکھیں لو

زنداں نامے کے بعد کا زمانہ کچھ ذہنی افراتفری کا زمانہ ہے جس میں اپنا اخباری مشغلہ چھٹا، ایک بار پھر جیل جانے گئے۔ مارشل لا کا دور آیا، اور ذہنی اور گرد و پیش کی فضا میں حبس کچھ اسد اور راہ اور کچھ نئی راہوں کی طلب کا احساس پیدا ہُوا۔ اس سکوت و انتظار کی آئینہ دار ایک نظم ہے "شام" اور ایک نامکمل غزل کے چند اشعار "کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہوگی"

فیض





فرصت ہی نہ دی فیض
ہمیں بخیہ گری نے

چند روز اور...

خدیجہ مستور

فیض احمد فیض

"چند روز اور" خدیجہ مستور کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ آج سے کوئی چار برس پہلے
ان کا دوسرا مجموعہ "بوچھار" کے نام سے شائع ہوا تھا اور جب سے موجودہ ادب کے طلبا کو اس
نَو دست افسانہ نگار کے متعلق کافی تجسس چلا آرہا ہے۔ "چند روز اور" کی نمایاں خصوصیت
یہ ہے کہ وہ مصنف کے دوسرے مجموعے سے کئی بنیادی باتوں میں مختلف ہے۔ میں مختلف کہہ رہا ہوں
بہتر نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس لئے کہ مجھے خدیجہ مستور کے پہلے افسانوں کی تحقیر مقصود نہیں۔ ہمارے
ہاں آج کل عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ نوجوان لکھنے والے اپنی ابتدائی تحریری زندگی میں ایک
آدھ کتاب لکھ چکنے کے بعد عمر بھر اپنی ہی نقل اتارنے میں مصروف رہتے ہیں۔ چنانچہ ایک خاص
عرصے کے بعد اُن کی تخلیقات میں نمو اور ارتقا کا عمل دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن "چند روز اور"
اس بات کی شاہد ہے کہ خدیجہ مستور نے ابھی تک اپنے یہ ذہنی اور فنی ارتقا کے دروازے
بند نہیں کئے نہ اپنی تحریروں کو تجربات اور مشاہدات کی کسی محدود نوع سے اتنا مخصوص
کر لیا ہے کہ ان میں وسعت اور نیرنگی کی صلاحیتیں مفقود ہو جائیں۔

خدیجہ مستور کے ابتدائی افسانوں میں دو خوبیاں بہت زیادہ واضح ہیں۔ پہلی
خوبی تو یہ ہے کہ انہیں سچ کہنے میں بہت کم دریغ ہوتا ہے۔ نقاد اس خصوصیت کو حقیقت نگاری
یا واقعیت نگاری کہتے ہیں۔ ان میں بہت کم ایسے ہوں گے جن کا ہاتھ حقیقت کی نقاب کشائی
کرنے میں کسی نہ کسی پردے تک پہنچ کر رک نہ جاتا ہو۔ جو کبھی نہ کبھی اپنی جھجک یا پڑھنے والے
کی رعایت سے واقعیت کے بہت سے مقامات سے آنکھیں بچ کر گزر نہ جاتے ہوں۔ بیشتر
مصنف حقیقت کی درستی میں اتنا لوچ ضرور پیدا کر لیتے ہیں کہ پڑھنے والے کی سطح ذہن سے
اُن کی تحریر کا سیدھا غیر ضروری ہچکولوں کے بغیر گزر جائے۔ چنانچہ خدیجہ مستور اس بات
میں پڑھنے والے سے بہت کم مفاہمت کرتی ہیں۔ ابتدائی افسانوں میں ان کی یہ بے دھڑکی
اور بھی واضح اس لئے ہے کہ انہوں نے سچ بولنے کے لئے موضوع بھی ایسا تلاش کیا جس
کے متعلق ہم ہمیشہ سے جھوٹ سننے کے عادی ہیں یعنی عورت مرد کے جنسی تعلقات اور
محسوسات۔ اس معاملے میں وہ دانستہ یا نادانستہ دغابازیاں اور ریاکاریاں جو مرد عورت



ہمیشہ ایک دوسرے سے کرتے چلے آئے ہیں۔ ہماری ذہنی، جذباتی اور سماجی زندگی میں اِس قدر پیوست ہو چکی ہیں کہ ان کی پردہ دری مشکل بھی ہے اور مقبول بھی خدیجہ مستور نے اِس بارے میں بہت سفاکی سے کام لیا ہے۔ جس کے لئے غالباً مرد عورت میں سے کوئی بھی ان کا شکر گذار نہ ہوگا لیکن اِس سفاکی کے باوجود اِن کے افسانوں میں درشتی، مردم بیزاری اور انسان دشمنی کا تاثر قریب قریب ناپید ہے۔ یا اس لئے ناپید ہے کہ خدیجہ مستور کو انسانی دُکھ اور مصیبت سے بہت لگاؤ ہے۔ اِس لگاؤ کی وجہ سے "تو چھار" اور "چند روز اور" کے جملہ افسانے ایک خاص نوع کے سوز اور رقت کا احساس دلاتے ہیں۔ یہی خدیجہ مستور کے افسانوں کی دوسری خوبی ہے۔ جنسی معاملات کی مصور کرتی ہیں بھی اُن کی نظر لذت کے کسی پہلو کی بجائے ہمیشہ دُکھ کے کسی پہلو پر پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِن کے جنسی افسانے واقعیت کے باوجود عُریاں نہیں ہیں۔ اور اِن کا صحیح مقصود جسم و دل سے محرور مخلوق سے ہمدردی ہے۔ اُن کا استہزا نہیں ہے۔

اِس سوز اور ہمدردی کا اظہار مصنفہ عام طور سے دو طرح کرتی ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ خدیجہ کے افسانوں کا مسطر عام طور سے نچلے درجے یا ہمارے مُفلس طبقے کے گھُٹے ہوئے ملاکت زدہ گھر ہوتے ہیں۔ اور انہیں طبقوں سے اُن کے بیشتر افراد تعلق رکھتے ہیں۔ بھوک، بے بسی، ناداری اور بے سروسامانی کا یہ مستقل پس منظر افسانوی افراد کی چال ڈھال اور افعال و اعمال میں اِس طرح جھلکتا رہتا ہے کہ اُن کی کوتاہیوں اور کمزوریوں سے ہمدردی کئے بغیر نہیں بنتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ مصنفہ ان کوتاہیوں کو بے نقاب کرنے میں کسی پر حکم نہیں لگاتیں۔ نہ اُن سے کبھی نفرت اور بیزاری کا اظہار کرتی ہیں۔ عام طور سے وہ عورت مرد کے جنسی اخلاق کو سماجی ماحول سے اتنا مربوط ضرور کر دیتی ہیں کہ اپنے افعال کے لئے افراد کی ذمہ داری بہت حد تک کم ہو جاتی ہے۔

خدیجہ مستور کے افسانوں کی تیسری خصوصیت جزئیات سے اِن کا شغف ہے۔ وہ مصوری کم کرتی ہیں اور کشیدہ کاری زیادہ۔ شاید اِسی مناسبت سے اِن کی ابتدائی کہانیوں کا ظرف بھی محدود ہے۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے دُوربین سے کسی وسیع منظر کو سمٹانے کی کوشش نہیں کی بلکہ خوردبین سے ایک نقطے کو پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ یہ خوبی بھی ہے اور خرابی بھی۔ خوبی اِس لئے کہ یہ طریقہ افسانہ نگار کے موضوع کے لئے نسبتاً زیادہ موزوں ہے۔ خرابی اِس لئے کہ اِس سے پڑھنے والے کو کشادہ دل و دماغ کا احساس نہیں ہوتا جو ادبِ عالیہ کی سب سے بڑی ودیعت ہوا کرتی ہے۔ جزئیات نگاری بیشتر زبان و بیان کی چابکدستی پر انحصار رکھتی ہے۔ اور اِس میدان میں خدیجہ مستور یقیناً کمال رکھتی ہیں۔ اِن میں ہمارے چند اور معروف لکھنے والیوں کی سی چمک اور سکھاپن تو ہے اُن کی سی یک رنگی اور اکراہٹ نہیں ہے۔

اِن میں سے بیشتر باتیں خدیجہ کے نئے اور پُرانے افسانوں میں مشترک ہیں واقعیت یا یوں کہئے کہ پردہ دری کا شوق جیسا انہیں پہلے تھا اب بھی ہے ـــــ اِن کے افراد اب بھی مجبور اور بے کس مخلوق میں سے ہیں جو پہلے تھے۔ تفصیلات اور جزئیات کو اُجاگر کرنے میں اب بھی اِن کی نگاہ وسیع ہے۔ رُود رس ہے، لیکن اَب اِن کے سماجی اور فنی تصوّر میں پہلے سے نمایاں فرق دکھائی دیتا ہے۔ اب انہیں محض جنسی جبر و ستم، محض جذباتی ترس اور ریاکاری، محض نِکی الجھنوں اور گھریلو سازشوں کے علاوہ اُن بُنیادی حقائق سے بھی آشنائی ہو چلی ہے۔ جن کی وجہ سے جملہ ذہنی و جذباتی اور سماجی امراض پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اسباب جو مرد کو ظالم اور ہوسناک، عورت کو محکوم اور مقہور گھروں کو تاریک اور بے رونق اور گھرانوں کو جھگڑالو اور خود غرض بناتے ہیں۔ محض افراد کے تجزیے اور مطالعے سے سمجھے اور سمجھائے نہیں جا سکتے۔ اِس لئے کہ اِن کی جڑیں کسی خاص سماجی نظام اور طبقاتی ترتیب سے پیوست ہوتی ہیں۔

"چند روز اور" میں مصنفہ نے اِسی زیادہ اور وسیع تر مسائل کی طرف رجوع کیا ہے جو یقیناً ارتقاء کی اگلی منزل ہے۔ طبقاتی تعلقات اور اُن کے سیاسی نتائج یعنی امن، جنگ، فسادات، نعیّش اور ناداری، شقاوت اور خلوص افراد اور واقعات کو کس طرح مختلف صورتوں میں مرتب کرتے ہیں۔ "چند روز اور" کا بیشتر موضوع یہی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ خدیجہ مستور کو اِس نئے مواد کی تراش خراش میں ابھی اتنا ملکہ پیدا نہیں ہوا جتنا انہیں اپنے ابتدائی موضوعات پر ہے اِس لئے انہیں کبھی کبھی واقعات سے ہٹ کر تفسیر و تشریح سے کام لینا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر فرقہ وارانہ فساد کا المیہ "مینوں لے چلے بابلا" میں افسانوی واقعات بغیر کسی تشریح کے نہایت مؤثر طور سے واضح ہوتے ہیں۔ لیکن "ٹامک ٹوئیے" میں یہی کچھ بتانے کے لئے طویل مکالموں سے کام لینا پڑتا ہے جس کی وجہ سے فلمی گیتوں کی طرح کہانی کی حرکت اور رفتار رُک جاتی ہے۔ اِس لئے اِن افسانوں میں ملاکت زدہ طبقے کی جذبات کا سوز اور دُکھ بہت شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ لیکن اِس جدوجہد کا شکوہ اور جلال ٹھیک نہیں دکھائی دیتا۔ اِن بنیادی مسائل سے مکمل فنی اور ذہنی تطابق پیدا کرنے کے لئے خلوص، وقت اور محنت تینوں درکار ہیں۔ خلوص موجود ہے (جو "چند روز اور" میں یقیناً موجود ہے) تو فن کی باقی منازل تک پہنچنے کے لئے گامزن رہنا ہی کافی ہے اِس لئے اردو ادب کے شائقین نہ صرف افسانوں کے اِس مجموعے سے اپنے ذہنی تجسّس کی تسکین پائیں گے بلکہ خدیجہ مستور کے اگلے مجموعے کا اور بھی تجسّس سے انتظار کریں گے۔

(یہ [illegible] جو [illegible] کے بعد (خود مصروف) سے معلوم ہوا کہ اشاعت کا سال ۱۹۵۴ء ہے اس لئے افسوس ہے کہ [illegible] ہو گیا)



غمِ کاکل

سیف الدین سیف

فیض

سیف نے اپنا مجموعۂ کلام غالب کے اِس بلیغ شعر سے شروع کیا ہے۔

تُو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دُور و دراز

یہ حرفِ آغاز نہایت موزوں ہے۔ غالب کا یہ شعر سیف کے دل پسند مضامین کا خلاصہ بھی ہے اور سیف کی دل پذیر طرزِ ادا کا آئینہ بھی۔

خمِ کاکل کا حسن اور اُس حسن کے پیدا کردہ "اندیشہ ہائے دور دراز" سیف کا موضوعِ سخن بیشتر یہی ہے۔ حسنِ خمِ کاکل کم اور اندیشہ ہائے دُور و دراز زیادہ۔ "اندیشہ ہائے دُور و دراز" میں یہ اشارہ بالکل واضح ہے کہ دامِ اندیشہ، دامِ کاکل سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اِس کا سلسلہ خمِ کاکل سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن وہیں یہ ختم نہیں ہو جاتا۔ آشوبِ دہر، گردشِ روزگار، حُبِّ وطن اور دردِ غربت، جَورِ اغیار اور مہرِ احباب، غرض غمِ دل اور فکرِ جہاں کی اَن گنت کیفیتیں ایسی ہیں جن سے اُس کے رستے ہیں۔ یوں کہئے کہ خمِ کاکل تو محض ایک بجلی کا بٹن ہے۔ اِس سے خیال کے جو قمقمے روشن ہوتے ہیں اُن کا نور حلقۂ کاکل میں مقید نہیں۔ اِس نور سے شاعر کے عالمِ گرد و پیش کی بے شمار موجودات پر روشنی پڑتی ہے۔ اُن کا حُسن و صفائی، اُن کی تعمیر و خرابی، اُن کا نمو اور اضمحلال دکھائی دیتا ہے۔ اِس عمل سے شاعر کی انسانی برادری کا ذہن چلا پاتا ہے۔ اور اِس برادری کا دل دکادبِ احساس۔

مولانا حالی کی قیادت میں جب ہماری شاعری نے گل و بلبل اور زلف و رُخسار سے بغاوت کی (اور یہ بغاوت نہ صرف واجبی بلکہ لازمی تھی) تو ہم نے ساتھ ہی یہ بھی فرض کر لیا کہ اِن تجربات اور مضامین میں بجائے خود کوئی ایسی خرابی ہے جس کے سبب شاعر کوئی کام کی بات کہہ ہی نہیں سکتا۔ ہم سمجھنے لگے کہ ایسے شاعر کو محض اپنے دردِ دل سے غرض ہوتی ہے۔ وہ ہمارے دل کا درد کیا جانے۔ اُسے اپنی شبِ فراق کی محویت میں یہ دیکھنے کی فرصت کہاں کہ یہاں صبحِ محشر کے آثار ہویدا ہیں۔ یہ مفروضہ صحیح نہیں۔ اگرچہ اِس کا جواز آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ شاعر کی آپ بیتی بھی جگ بیتی کا جزو ہوتی ہے۔ اگر اُس کا آئینہ شفاف ہے تو اُس میں [illegible]



باقی عالم کا عکس بھی جھلکے گا۔ اگر اُس کا اندیشہ رسا ہے تو اُس کی حدیثِ دل میں ہمارے غمِ حیات کا باب بھی شامل ہوگا۔ عاشقانہ شاعری کی قدر و قیمت جانچتے وقت ہم اُس کے حُسن کے علاوہ اُس خلوص اور مشاہدہ کی توقع ضرور رکھتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ حدیثِ غمِ دل کہنے والا شاعر جماعتی زندگی سے بے نیاز اور باقی انسانیت سے بے تعلق ہوتا ہے۔

دیکھنے کی بات یہ نہیں ہے کہ اندیشہ ہائے دُور و دراز کا رشتہ کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ رشتہ ہمارے دل تک پہنچتا ہے یا نہیں؟ اور یہ بات محض الفاظ کی تراش خراش کی بات نہیں۔ انسانوں کے اجتماعی دُکھ درد کے شعور اور احساس کی بات ہے۔ سچّی اور موثر عشقیہ شاعری میں اس شعور اور احساس کا لازماً پَرتو ہوتا ہے۔ یوں تو ہر داخلی واردات بجائے خود ایک حقیقت ہے۔ اور اُس کا اظہار بجائے خود تخلیقِ حُسن۔ لیکن اس حقیقت کی اہمیت اور اُس حُسن کی قیمت ہم اپنی زندگی اور تجربے سے الگ ہو کر نہیں جانچ سکتے۔ نہ عام طور سے یہ بات ممکن ہے کہ ایک حسّاس شاعر اپنے دل کی ہر نازک دھڑکن سُن سکے۔ لیکن ہمسائے کے گھر کا کُہرام اور واویلا اُسے سُنائی نہ دے۔ تجربے میں یہ دونوں آوازیں گھُل مل کر ایک ہو جاتی ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ آپ بیتی اور جگ بیتی کا یہ ارتباط تدریجاً ہوتا ہے۔ شاعر کے فن اور ذہن کی تربیت کے ساتھ ساتھ شاعر اور اُس کی انسانی برادری کے رشتے بھی زیادہ گہرے اور اُستوار ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اب سیفؔ کے یہ اشعار دیکھئے۔

اللہ اللہ وہ ستمگر بھی یہی کہتا ہے — ہم سے یہ درد کے مارے نہیں دیکھے جاتے
دھجّیاں دیکھ کے ہنستے ہیں گریبانوں کی — اُن سے یہ دل بھی ہمارے نہیں دیکھے جاتے

فرقت میں جن کو اپنا کہہ کہہ کے دن گزارے — وہ جب سے مل گئے ہیں بیگانے ہو گئے ہیں
کہتے ہیں قصّۂ غم ہر انجمن میں جا کر — ہم اہلِ دل بھی کتنے دیوانے ہو گئے ہیں

اب عشق ہے آوارۂ و رُسوا سرِ بازار — اور حُسن سرِ بام بڑی دیر سے چُپ ہے
وہ رِند کہ تھا باعثِ ہنگامۂ محفل — ہاتھوں میں لئے جام بڑی دیر سے چُپ ہے

کون کہہ سکتا ہے کہ اِن اشعار میں ذاتی تجربہ کے خلوص کے علاوہ ہمارے دَور کے عمومی مسائل و مصائب کا احساس شامل نہیں۔ اور سیفؔ کے کلام میں یہ رنگ بتدریج زیادہ نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں۔

چھپتا نہیں اب غمِ زمانہ — ہم ذکر کریں ہزار دل کا

یہ صحیح ہے کہ اب تک وہ بیشتر دل ہی کی بات کہتے ہیں لیکن اِس پاکیزگی اور اِس خلوص اور درد سے کہتے ہیں کہ یہ بھی ہمیں اپنے دل کی بات معلوم ہوتی ہے۔

اب خمِ کاکل کے حرفِ آغاز پر ایک دفعہ اور نظر ڈالیئے۔

لو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دُور و دراز

یوں تو اِس شعر میں کئی لفظی رعائتیں موجود ہیں جنہیں روایتی غزل سے منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن شعر کی خوبی کا انحصار اُن لفظی رعایتوں پر بہت کم ہے۔ اِس کا انحصار اُس دُھندلی سی جدمالی فضا پر ہے جو الفاظ کے اصوات و معانی مل جل کر پیدا کرتے ہیں۔ اِس فضا میں تصوّرات کے کئی ٹکڑے پھڑ پھڑاتے ہوئے اِدھر سے اُدھر نکل جاتے ہیں اور ہاتھ نہیں آتے۔ کئی خاکے، کئی نقشے، کئی رنگ دھیرے دھیرے نظر کے سامنے اُبھرتے ہیں اور مکمل ہونے سے پہلے محو ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف الفاظ کی کٹیلی تراش اور چمکھاہٹ اور دوسری طرف معانی کی وسیع اشاریت۔ یوں تو یہ امتزاج ہر اچھے کلام میں لازمی ہے لیکن غزل کا اختصار اور جامعیت اِس کی خاص طور سے متقاضی ہے۔ ہر چند سعدیؔ سے حسرتؔ موہانی تک ہر بڑے غزل گو کا اپنا اپنا رنگ، اپنے اپنے مضامین، اپنا اپنا طریقِ اظہار ہے لیکن اِس بوقلمونی کے باوجود یہ نیم محسوس عنائیت اُن سب کے کلام کا خاصّہ ہے۔ اور اِسی عنائیت کو ہم نے غزل کے مزاج سے مخصوص کر لیا ہے۔ حسرتؔ موہانی کے بعد بہت کم شعراء ایسے ہوں گے جنہیں غزل کے مزاج سے ایسی صحیح مناسبت نصیب ہو جیسی "خمِ کاکل" میں ملتی ہے اِس سے میری مراد یہ نہیں کہ حسرتؔ کے بعد سیفؔ ہمارا سب سے بڑا غزل گو شاعر ہے یا سیفؔ سے بہتر غزل کہی نہیں گئی۔ لیکن میں یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ آج کل کے دور میں غزلیات کا کوئی مجموعہ مشکل ہی سے نظر آئے گا جس میں غزل کے مخصوص محاسن کا ایسا سلسل اور ہموار اظہار ہو جیسا سیفؔ کے کلام میں ہے۔

مجموعی اعتبار سے اِس کلام میں دو خصوصیات بہت واضح ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ یہ صرف سیفؔ کی بیشتر غزلیں منفرد اور مجرد ابیات کی بجائے اپنی اپنی جگہ کسی نہ کسی مسلسل اور مرتب کیفیت کی حامل ہیں۔ بلکہ یہ تمام غزلیات مل کر بھی ایک ہی واحد کیفیت یا موڈ کی ترجمانی کرتی ہیں۔ یہ کیفیت کچھ اُداس اُداس لیکن صبر و لو محبت کی کیفیت ہے۔ اِس اُداسی میں ناسازگاریٔ روزگار کا اتنا گہرا احساس اور آشوبِ دہر کا ایسا ہمہ گیر لوحہ شامل نہیں جو غالبؔ کی اُداسی میں ہے۔ لیکن جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں سیفؔ کی شاعری اِس احساس سے محروم بھی نہیں اور جب بھی وہ اس کا احساس کرتے ہیں سوز اور خلوص میں ڈوب کر کرتے ہیں۔ سیفؔ کی محنت میں حسرتؔ موہانی کا سا وفورِ یاحسّیات کی آسودگی بھی نسبتاً کم ہے۔ اسی لئے میں نے کہا تھا کہ اُن کی شاعری میں حُسن کا کل کم ہے۔ اور اندیشہ ہائے دُور و دراز زیادہ۔ لیکن



جب بھی اُن کی غزل کامل بن پڑتی ہے تو بھرپور پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھئے۔

رنگ دہکا ہوا جوانی کا　　　زلف بھیگی ہوئی پسینے میں

سیف کی بیشتر محنت میں ایک ملائم وقار ہے۔ ایک پُرخلوص آرزومندی کا تموج بھی ہے، ان جوش کی بھی۔

غزلِ کامل کی دوسری خصوصیت اُس کا سُتھرا ہوا اور شفاف طریقِ اظہار ہے جس سے ہماری موجودہ شاعری بوجوہ دُور ہوتی جا رہی ہے۔ ایسے سیدھے سُبھاؤ الفاظ جن میں کہیں جھول نہ پڑے۔ جنہیں معانی پر چسپاں کرنے کے لئے کھینچا تانی کی ضرورت نہ ہو آج کل ویسے نایاب ہوتے جا رہے ہیں۔ اس لئے کہیں سے ایسے اشعار سُننے میں آ جائیں۔

در پردہ جفاؤں کو اگر جان گئے ہم　　　تم یہ نہ سمجھنا کہ بُرا مان گئے ہم
اب اور ہی عالم ہے جہاں کا دلِ ناداں　　　اب ہوش میں آئے تو مری جان گئے ہم
ہم اور تیرے حُسنِ تغافل سے بگڑتے　　　جب تُو نے کہا مان گئے مان گئے ہم

تو خاص طرب حاصل ہوتی ہے۔

اِن مشترک خوبیوں کے علاوہ غزلِ کامل کے اشعار میں منفرد محاسن کئی نوع کے ہیں۔ کچھ اشعار ایسے ہیں جن کا حُسن اُس موسیقیت اور موہوم اسراریت کا مرکب ہے جو غالب کے غزلِ کامل والے شعر میں ہے۔

وہ گریزاں نگاہ بھی نہ رہی　　　دل کی حالت تباہ بھی نہ رہی
صبح سے شام کے آثار نظر آنے لگے　　　سب سہارے مجھے بیکار نظر آنے لگے

کچھ ایسے اشعار ہیں جنہیں ذاتی تجربات کی شدت اور خلوص نے صیقل کر دیا ہے۔

سیف اتنا بھی نہ کر ضبط کہ پھر اُن کے حضور　　　خامشی درد کا اظہار نظر آنے لگے
شاید تمہارے ساتھ بھی واپس نہ آ سکیں　　　وہ ولولے جو ساتھ تمہارے چلے گئے
تمہارے بعد خدا جانے کیا ہوا دل کو　　　کسی سے ربط بڑھانے کا حوصلہ نہ ہوا
چلے ہیں سیف وہاں ہم علاجِ غم کے لئے　　　دلوں کو درد کی لذّت جہاں سے ملتی ہے

اور بعض اشعار خاص صناعت کے نمونے ہیں جن کا چٹخارا اب کام و دہن بھول چلے ہیں۔

کبھی جگر پہ کبھی دل پہ چوٹ پڑتی ہے　　　تری نظر کے نشانے بدلتے رہتے ہیں
اُن کے جوہر بھی کھلے اپنی حقیقت بھی کھلی　　　ہم سے کھنچتے ہی وہ تلوار نظر آنے لگے

شاذ و نادر نسبتاً گہرے تفکر کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ سیف اِس میدان میں بہت کم قدم رکھتے ہیں۔

لوٹ آئے ہم تو عرضِ دعا کے مقام سے　　　ہر شے تھی پست اُن کی رضا کے مقام سے
جب دل نے خیر و شر کی حقیقت کو پا لیا　　　ہر جرم تھا بلند سزا کے مقام سے

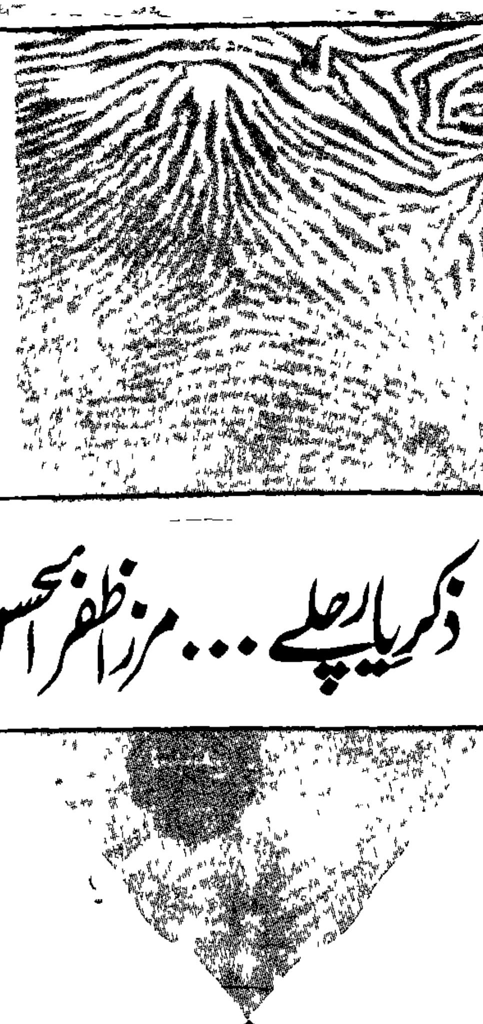
سیف میں یہ کمزوری ضرور ہے کہ بہت سے غنائی شعرا کی طرح وہ بھی کبھی کبھی سچّی اور جھوٹی رومانیت میں تمیز نہیں کرتے۔ کئی دفعہ الفاظ و معانی کا روانی مطلع انہیں بہا لیتا ہے۔ ایسے چھوٹے نگینے مشاعرے میں خوب چمکتے ہیں۔ لیکن اُن کی آب تھوڑے ہی دنوں میں ماند پڑ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھئے۔

آئے تھے اُن کے ساتھ نظارے چلے گئے　　　وہ شب وہ چاندنی وہ ستارے چلے گئے
کیسے مر مر کے گزاری ہے تمہیں کیا معلوم　　　رات بھر تاروں بھری رات پہ رونا آیا
کتنے بیتاب تھے رِم جِھم میں پئیں گے لیکن　　　آئی برسات تو برسات پہ رونا آیا

بظاہر بہت نظر فریب اشعار ہیں لیکن یہ فریب ایسا نہیں جو چھپا رہ سکے۔ ایسی ترغیبات سے دامن چھڑانا زُہد و ریاضت کی بات ہے اور شعور و احساس کی طرح یہ بات بھی تدریجاً حاصل ہوتی ہے۔

پچھلے دس پندرہ برس میں ہمارے اُفقِ ادب پر کئی درخشاں ستارے اُبھرے جو مشتری ستارے ثابت ہوئے۔ چنانچہ اب کسی نئے شاعر کے متعلق خوش آئند پیشگوئی کچھ بے سُود سی بات معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے بیشتر شعرا کا بہترین کلام وہی ہے جو اُن کے اوائلِ سخن میں سے ہے۔ لیکن سیف کے کلام میں بھی اُن کے مستقبل کا سراغ لگانا ایسا مشکل نہیں۔ فی الحال اُن کے سخن کی بنیاد فطری صناعی اور اوائلِ شباب کے موہوم جذباتی تجربات پر ہے۔ اِس صناعی کی میعاد اور اُن جذبات کی دیرپائی دونوں غیر متعین چیزیں ہیں۔ آرٹ میں تجربے اور صنعت کو جُدا کرنا محال ہے۔ اِس لئے کہ الگ الگ اُن کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ جوانی کی کوئی واردات کیسی بھی اہم کیوں نہ ہو عمر بھر نخلِ سخن کی آبیاری نہیں کر سکتی۔ نہ محض فنی باعمالی سے اُسے زندہ رکھا جا سکتا ہے۔ اِس کے زندہ رہنے کی یہی صورت ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اِس کی جڑیں بھی اجتماعی نظامِ زندگی میں پیوست ہو سکیں اور اُنہیں سینچنے والے جذبات اور تجربات کی جوئبار خشک نہ ہونے پائے۔ سیف کے کلام میں اِس کا کافی ثبوت موجود ہے کہ وہ زندگی اور فن کی اِس بنیادی حقیقت کو پہچانتے اور محسوس کرتے ہیں اِس لئے یہ توقع کسی طرح بے محل نہیں کہ غزلِ کامل اُن کے کاروانِ خیال کی اوّلیں قیام گاہ ہے آخری منزل نہیں ہے۔

*





ذکرِ یار چلے ... مرزا ظفر الحسن

فیض

اگرچہ رب ... کے مقابلے میں "چرب نگار" یا اُس کے متبادل کوئی اور اصطلاح آپ کے ذہن میں ہے تو مرزا ظفر الحسن ہیں ۔ اس سے ہرگز یہ نہ سمجھا جائے کہ چرب زبانی میں وہ خدانخواستہ کسی سے کم ہیں ۔ زبان چلانے میں کسبِ کمال کا یہ عالم ہے کہ

عدو کی آج اڑائی ہیں دھجیاں کیا کیا — چلے گی کیا کوئی قینچی مری زباں کی طرح

لیکن چرب زبانی کو تحریر میں منتقل کرنا ایک الگ فن ہے اور ظفر نے اِس میں جو ملکہ پیدا کیا ہے اُس کی نظیر ہمارے ادب میں ڈھونڈے سے ہی ملے گی چنانچہ "ذکرِ یار چلے" کا مطالعہ کیجیے تو شاید آپ بھی محسوس کریں کہ ظفر نے اپنی ولادت کے لیے وطن تو مناسب چنا تھا یعنی حیدر آباد دکن کی بادشاہت لیکن وقت کے تعین میں کچھ چوک ہو گئی ۔ سو دو سو برس پہلے پیدا ہوتے تو کسی دربار میں داستان گوئی کے جوہر دکھاتے اور لاکھوں پاتے ۔ اب نہ داستان گوئی کا فن باقی ہے نہ اُس فن کے سرپرست آج کل کے دور میں تو اچھا داستان گو جنگل کے مور کی طرح بکتا ہے ۔ داستان گوئی ۔ ناول نویسی یا افسانہ نگاری سے بالکل مختلف شے ہے ۔ ناول یا افسانے میں جو عیب گنا جاتا ہے وہی داستان گوئی کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے یعنی اُس میں داستان کا حصہ کم ہو اور ریب داستان کا زیادہ ۔ یہی ظفر کی داستان گوئی کی امتیازی صفت ہے ۔ داستان نویسی کی بجائے داستان گوئی اِس لیے لکھ رہا ہوں کہ آپ ظفر کی کتاب



پڑھتے تو یوں لگتا ہے کہ یہ کتاب نہیں ٹیپ ریکارڈ ہے اور آپ اسے پڑھ نہیں رہے سُن رہے ہیں۔

داستان اور ربِ داستان کی بات یوں ہے کہ اِس ساری تصنیف میں نہ کوئی ایسا معرکۃ الآرا سنسنی خیز، رومان انگیز فکر انگیز واقعہ آپ کی نظر سے گزرے گا جو آپ کو چونکا دے، نہ مخدوم کے علاوہ کوئی غیر معمولی شخصیت یا کردار آپ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ جیسے شہر اور قصبے، گلی کوچے، محلّے، اسکول اور کالج آپ نے بچپن یا نوجوانی میں دیکھے ہیں، جیسے یار دوست، اُستاد بزرگ، عزیز رشتے دار و دوسری اہم غیر اہم مخلوق آپ سے آشنا رہی ہے اِس کتاب میں صرف اُن ہی کا بیاں ہوا ہے۔ لیکن بیان کی خوبی یہ ہے کہ آپ "ذکرِ یار چلے" اور کسی رومانی، سوانح رسالی، تاریخی، جس نوع کا بھی ناول یا افسانہ آپ کے مرغوب خاطر ہو ایک ساتھ سرہانے رکھئے اور پھر دیکھئے کہ آپ کی نظر کا پروانہ اِدھر جاتا ہے یا اُدھر اور یہ حُسنِ بیان محض تفریحی یا بے مقصد بھی نہیں ماضی کے کسی دور کو حال کے قالب میں ڈھالنا، کسی معاشرے کا مکمل سراپا الفاظ میں منتقل کرنا تاریخ نگاری کا اصل جوہر یہی ہے۔ اِس اعتبار سے "ذکرِ یار چلے" ایک بہت شگفتہ داستان ہی نہیں ایک اہم تاریخی دستاویز بھی ہے اور محاسن کے علاوہ اِس کی یہی ایک خوبی کیا کم ہے کہ اِس وسیلے سے پڑھنے والے اپنے دور کی ایک بہت حسین اور محترم شخصیت یعنی مخدوم محی الدین کو بہت قریب سے دیکھ سکیں گے

"ذکرِ یار چلے" بہت ہی دلچسپ اور بہت ہی عمدہ کتاب ہے۔ اگر آپ کتاب خریدنے کی توفیق رکھتے ہیں تو اِس کتاب سے محروم نہ رہئے۔

فیض

دیوانِ غالب ... نسخۂ صادقین

ملک کے ممتاز مصور صادقین اِدارۂ یادگارِ غالب، کراچی کے لیے مُصوّرِ دیوانِ غالب (نسخۂ صادقین) تیار کر رہے ہیں، اُنھوں نے اِسی چند ایک تصاویر ابتدائی تعارف کے لیے شائع کی ہیں۔ ان تصاویر کے "دیباچہ" کا پیش لفظ فروری ۱۹۶۹ء کی تحریر ہے۔

غالب کے گنجینۂ معنی کا طلسم تو کس کے ہاتھ لگا ہے لیکن گذشتہ ایک صدی میں کون صاحبِ نظر ہے جو اِس کی تلاش میں سرگرداں نہ رہا ہو میری ناقص رائے میں اِس طلسم کا بھید۔ غالب کی ایک اصطلاح میں پوشیدہ ہے اور وہ اصطلاح ہے "تصوّر" تصوّر جو گرمیِ نشاط بھی ہے رنگینیِ خیال بھی۔ جو نا آفریدہ گلشن کی جھلک بھی ہے، فراقِ صحبتِ شب کی کسک بھی۔ تصوّر دیروز کی یاد بھی ہے۔ اِمروز کا کرب بھی ہے۔ فردا کی اُمید اور ہراس بھی۔ تصوّر جس سے خیال کی تریاں جذبات کی رو سے سیراب ہوتی ہیں اور جذبات کے شعلوں کو خیال کا نور عطا ہوتا ہے۔

اِسی تصوّر کے طلسم سے غالب نے تاریخ کا ایک ایسا لمحہ اسیر کیا جب یار اغیار دونوں ایک "بیابانِ بو" کو آباد کرنے کی خاطر ایک بنیادِ کُہنہ کی ویرانی کے درپے تھے یہ عمل غالب کی ولادت سے قریب قریب ایک صدی بیشتر شروع ہُوا اور اس کی وفات سے ایک صدی بعد تک جاری ہے۔

غالب کے تصوّر میں اِس شکست و ریخت، حسرت و تعمیر کے وہ سب نقوش منتقل ہوئے تو اُسے کبھی اپنے دشت نما گھر میں نظر آئے۔ کبھی بہار شگفت دشت میں۔ اِن میں ایک صدی پہلے کا درد و اضمحلال بھی تھا ایک صدی بعد کا تجسس اور خروش بھی انسانی عمرِ گریزپا کا تاسف بھی تھا، حیاتِ انسانی کے دوام کا تیقن بھی حقیقتِ عالم کی تلاش بھی تھی۔ آرائشِ جسم کا کل کے امڈتے ہوئے دور دراز بھی غالب کا تصوّر اس لمحہ کی اُس تہ تک پہنچا جہاں فرد اور دی کا تفرقہ یکبار مٹ جاتا ہے۔

جس طرح غالب نے تصوّر کے اس آبگینے کو پگھلا کر الفاظ کے ساغر میں انڈیلا "تا بادۂ تلخ تر شود و سینہ ریش تر"۔ اُسی طرح صادقین نے الفاظ کے آبگینے کو گداز کر کے رنگ و خط کے ساغر میں ڈھالا ہے۔ ہم ان دونوں کے شکرگزار ہیں کہ دونوں کے

"معجزۂ فن میں ہے خونِ جگر کی نمود"



گلزار فاطمہ

چند دوسرے — فیض کی نظر میں

کسی ادبی ناقد کا قول ہے کہ غالب اگر شاعر نہ ہوتے تب بھی ان کی نثری تخلیقات کی بنا پر آسمانِ ادب پر روشن و تابندہ ہی رہتے۔ بالکل اسی خیال کے مصداق آج یہ بات فیض احمد فیض پر بھی صادر آتی ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ فیض صاحب کا شاعرانہ کلام ہی لوگوں میں مقبول ہوا اور عوام الناس ان کی شاعری سے ہی مسحور ہو رہے ہیں۔ لیکن فیض صاحب نے نثر میں بھی جو جادو جگایا ہے وہ بھی ان کی شاعری سے کم نہیں ہے۔ ان کے لکھے ہوئے مقدمات دیباچے ان کی یادداشتیں ان کے تراجم ان کی تقاریر ان کے لکھے ہوئے کتابوں کے فلیپ وغیرہ کا جائزہ لیا جائے تو ایک بہت بڑا نثر نگار بھی سامنے آ دیکھے گا۔ فیض صاحب یوں تو عربی، فارسی، انگریزی اور اردو تمام زبانوں میں لکھ بول سکتے تھے مگر اردو میں ان کی تحریریں خواہ وہ چند سطروں پر مشتمل ہوں یا طویل ایک چونکا دینے والا تاثر رکھتی ہیں۔ ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ جہاں انہوں نے اپنے بزرگوں کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے وہاں اپنے سے بہت چھوٹے اور برخوردار قسم کے صاحبان کے بارے میں اہم گفتگو کی ہے۔ ذیل میں چند ایسے ہی لوگوں کے بارے میں فیض صاحب کی تحریروں سے اقتباسات پیش کرنے کی جسارت کی جا رہی ہے۔ ممکن ہے اس طرح فیض صاحب کا کوئی نیا ادبی پہلو یا گوشہ قارئین تک اور ادب کے طالب علموں تک پہنچ سکے۔

فیض صاحب کے نثری سفر کی ابتداء بظاہر تو ان کے پہلے شعری مجموعے "نقشِ فریادی" سے ہوتا ہے لیکن اس سے قبل کالج کے مجلّوں اور دوسرے مقامات پر بھی کچھ تحریریں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ فیض صاحب نے اپنے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان کے اپنے شعری اور نثری مجموعوں میں موجود ہے یعنی "نقشِ فریادی" "دستِ صبا" "دستِ تہ سنگ" وغیرہ کے دیباچے۔ علاوہ ازیں "میزان" "صلیبیں مرے دریچے میں" "متاعِ لوح و قلم" "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" "سہ رو سالِ آشنائی" مکمل نثری کتابوں کی صورت میں لیکن دوسروں کے بارے میں ان کا حسن خیال بھی قابل ملاحظہ ہے۔ چند نمونے پیش خدمت ہیں۔

پطرس بخاری

بخاری صاحب اور ان کا ترجمہ تعریف و توصیف سے بہت بالاتر ہے "مشک آنست کہ خود ببوید" اور میرے لئے عطاری کا دعویٰ کرنا بھی گستاخی ہے۔

مصر کی رقاصہ سے اقتباس

میراجی

"اس مجموعے کی اہمیت کا ایک پہلو تو یہی ہے کہ اس کی اشاعت سے میراجی کی ادبی شخصیت کی ادھوری تصویر ایک حد تک مکمل ہو جائے گی۔ اس شخصیت کے بارے میں بعض محدود اور یکطرفہ تصورات کی تصحیح ہو سکے گی اور مرحوم کی تخلیقی کاوشوں اور صلاحیتوں کی وسعت اور تنوع کا بہترین اندازہ ہو سکے گا۔ میراجی نے جس انداز سے ادبِ عالم کے حسن لوے ہم تک پہنچائے ہیں وہ محض ترجمہ نہیں ایجاد ہے۔"

(مشرق و مغرب کے نغمے کا دیباچہ)

ڈاکٹر محمد دین تاثیر

"انتشار کے باوجود 'کنول' ایک جامع اور مکمل تصنیف ہے۔ موضوع کی دلکشی اور اچھوتے پن کے علاوہ اس میں وہ تمام خوبیاں بھی موجود ہیں جن سے اچھا افسانوی ادب پہچانا جاتا ہے۔ ڈاکٹر تاثیر مرحوم ہمارے دور کے غالباً سب سے مانندہ ادیب تھے"

"کنول" کا دیباچہ

مصور صادقین

"جس طرح غالب نے تصور کے اس آئینے کو پگھلا کر الفاظ کے ساغر میں انڈیلا تا بادۂ تلخ تر شود و سینہ ریش تر، اسی طرح صادقین نے الفاظ کے آئینے کو گداز کر کے رنگ و خط کے ساغر میں ڈھالا ہے۔ ہم دونوں کے شکر گزار ہیں کہ دونوں کے معجزوں میں سے جن جگر کی نمود۔"

'صادقین نسخۂ غالب' کا دیباچہ

مرزا ظفر الحسن

"ظفر نے اپنی ولادت کے لئے وطن تو مناسب جگہ یعنی حیدرآباد دکن کی ماہ ساہت لیکن وقت کے تعین میں کچھ چوک ہو گئی۔ سو دو سو برس پہلے پیدا ہوتے تو کسی دربار میں داستان گوئی کے جوہر دکھاتے اور لاکھوں پاتے۔ ناول یا افسانے میں جو عیب گنا جاتا ہے یعنی داستان گوئی کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے یعنی اس میں داستان کا حصہ کم ہو اور ربط داستان کا زیادہ۔ یہی ظفر کی داستان گوئی کی امتیازی صفت ہے۔"

("ذکرِ یار چلے" کا دیباچہ)

مختار زمن

"اخبار نویس برادری میں مختار زمن صاحب کراچی سے لندن تک معتبر ہیں" وہ ہاتھ میں صحافت کے کھلے خنجر کے علاوہ آستین میں طنز کا یہ دشنہ بھی پنہاں رکھتے ہیں" شاید



یہ مضامین اسی وضع احتیاط کے خلاف رشید صاحب کا ردعمل ہے اور اب جو گریباں پر دلد چلاتے تو آپ نے ملکی پیش سے واسطہ نہیں رکھا شاید اسی سبب سے ان کی تحریروں میں مزاح کی چاشنی پر طنز کی تلخی غالب ہے

"ناتوں کے حرلودسے" کا دیباچہ

اسرار الحق مجاز

اس کے کلام میں خطیب کے سطق کی کڑک بس مائی دل کی آگ میں نغمہ سخ کے گلے کا وفور ہے اور بیچ کے ایک مختصر سے وقفے کو چھوڑ کر "مجاز ہمیشہ گاتا رہا ہے" مجاز کی انقلابیت عام انقلابی شاعروں سے مختلف ہے مجاز انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں انقلاب کا مطرب ہے"

"آہنگ" کا دیباچہ

آغا ناصر

ان میں ادبی اور تکنیکی دونوں محاسن موجود ہیں مکالمے سادہ کر لکھتے ہیں کرداروں کی صورت گری کفایت اور صفائی سے کی ہے طنز و مزاح نہ ہے لیکن مشغول اور مزہ کی ہیں "درد و سوز" ہے آہ و زاری و سینہ کوبی نہیں ہے"

"سات ڈرامے" کا دیباچہ

کیفی اعظمی

در طولِ کلام کے رنگین قائل ہیں نہ میں ہوں تعارف کے دفتر محتاج ہیں اور تمہید کے لیے دفتر درکار ہے یہ چند حروف تو اظہارِ خلوص کے لئے لکھ رہا ہوں اس لئے کہ میری نظر میں کیفی ایک عزیز دوست ہونے کے علاوہ ہمارے دور کے نمائندہ اور باکمال شاعرانِ معتبروں میں سے ہیں'

آوارہ سجدے" کے دیباچے سے اقتباس

قتیل شفائی

ان کا ایک ایسا سفرِ رنگ ہے "جس میں قریب سب رنگوں کی جھلکیاں ملتی ہیں لیکن رنگا رنگی کے باوجود ان کا کلام یک رنگ ہے" ۔ قتیل کا لہجہ ہمیشہ "مطربانہ اور مکرر" دردمندانہ ہوتی ہے

"گفتگو" کا دیباچہ

خدیجہ مستور

"انہوں نے سچ بولنے کے لئے موضوع بھی ایسا تلاش کیا جس کے متعلق ہم ہمیشہ جھوٹ سننے کے عادی ہیں ۔ ... وہ مصوری کم کرتی ہیں اور کشیدہ کاری زیادہ"

"چند روز اور" سے اقتباس

زہرہ نگاہ

ویسے زہرہ کا ابتدائی کلام دیکھئے تو ان حضرات کا یہ گماں "کہ ضرور کوئی بزرگ لکھ کر دیتے ہوں گے" کچھ ایسا بے جا بھی نہیں۔

"شام کا پہلا تارہ" کا دیباچہ

ادا جعفری

" ادا بدایونی جو سارا ڈھونڈتی رہی ہیں غالباً اب ادا جعفری کو شہرِ درد میں ہاتھ آگیا ہے'

"شہرِ درد" فلیپ

سرور بارہ بنکوی

سرور کے حُسنِ کلام پر دیدہ و گوش یا دل و دماغ کی گواہی میں فرق کرنا مشکل ہے جیسا پڑھتے ہیں ویسا لکھتے ہیں"

"سنگِ آفتاب" فلیپ

سحر انصاری

' مجھے یہ شکایت ضرور ہے کہ سحر کو شاید بت گری کی لذت پر اتنا غالب نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن یہ تو اپنے اپنے مزاج کی بات ہے۔"

"نمود"۔ فلیپ

نقاش کاظمی

"نقاش کاظمی کی شاعری سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فنکار کی عظمت و بزرگی اس کے سن و سال سے نہیں بلکہ اس کے فکر و فن سے ہے ان کی شاعری میں دوسروں کی انگلی پکڑ کر چلنے والی بات نہیں ہے۔"

"چاندنی اور سمندر" فلیپ



تم میرے پاس رہو





فیض کے خطوط

ایلس کے نام

جون ۱۹۵۱ء (۱)

تمہیں پہلے نہیں لکھ سکا جس کا افسوس ہے لیکن یہاں نہ کام بہت دعجیب ہے ہوتا ہے اور خط لکھنے کے لئے کاغذ آج ہی ہاتھ آیا ہے میں اور دو سرے ساتھی تاریخ کی صبح کو اسپیشل ٹرین سے یہاں پہنچے ہم نے جس ٹھاٹھ سے سفر کیا دیکھنے کی چیز تھی ف میڈ ماسے کی کسر رہ گئی ورنہ جلوس اور تو سب کچھ تھا۔ گاڑی پہ سوار ہوتے ہی یوں سوس ہوا کہ سب پریشانیاں دور ہو گئی ہیں سفر کا لطف، دنیا کو دوبارہ دیکھنے کی لذت تکلف کھا نہ بہت سی نعمتیں یکبار ہاتھ آگئیں اس دور دراز دن کے بعد جب مجھے اچانک نصرت لے گئے تھے پہلی بار مزے کا کھانا اس سفر کی دوپہر میں نصیب ہوا۔ بھنا ہوا مرغ، پلاؤ، فروٹ کاک ٹیل اور آئس کریم (افسوس کہ بھوک نہیں لگ رہی تھی) اور اس پر اضافہ دنیا کی سب سے عزیز چیز یعنی انسانوں کی صحبت جس سے اتنے دن محروم رہے! ان سب باتوں کی وجہ سے دل دوبارہ پرسکون ہے، اب تمہیں بتانے میں کچھ حرج نہیں کہ یہ تین چار دن جو لاہور میں گزرے، ایام اسیری کے سب سے اذیت ناک دن تھے۔ جب مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ اپنے چاہنے والوں کو کسی ایسی چیز کی خاطر دکھ اور اذیت پہنچانا جو خود کو بہت عزیز ہو لیکن ان کے لئے کچھ معنی نہ رکھتی ہو غلط اور ناجائز بات ہے اس نظر سے دیکھو تو آئیڈیل ازم یا اصول پرستی بھی خود غرضی کی ایک صورت بن جاتی ہے اس لئے کہ اپنے کسی اصول کی دھن میں آپ یہ بھول جاتے ہیں کہ دوسروں کو کیا چیز عزیز ہے اور اس طرح اپنی خوشنودی کی خاطر دوسروں کا دل دکھاتے ہیں۔ اس زمانے میں اور بھی کئی باتوں کا انکشاف ہوا، اپنے بارے میں بھی، دوسروں کے بارے میں بھی۔ اپنے میں ایسی بہت سی کمزوریاں نظر آئیں جن کا وجود پہلے گمان میں بھی نہ تھا۔ دوسروں میں کمینگی اور عالی حوصلگی کے ایسے پہلو دکھائی دیئے جو پہلے معلوم نہ تھے اس سارے تجربے کے لئے دل احسان مند ہے خیال ہے کہ جب یہاں سے نکلیں گے تو غالباً ان کی شخصیت پہلے سے زیادہ مکمل اور منظم ہو گی۔ میں نے یہ بھی اچھی طرح محسوس کر لیا ہے کہ آدمی کے لئے درست یہی ہے کہ جو کچھ وہ ہے اس پر قناعت کرے اور جو کچھ وہ نہیں ہے وہ کچھ بننے کی کوشش میں وقت اور محنت ضائع نہ کرے۔ اس طرح کی کوشش سے وقت اور خود فریبی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں

ہاں تو جیسے میں کہہ رہا تھا جب سے میں یہاں پہنچا ہوں خوف و خطر کا کوئی احساس دل میں باقی نہیں رہا۔ (اگرچہ یہ احساس پہلے بھی کچھ ایسا زیادہ نہ تھا، اس وجہ سے کہ صرف مجھ سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوئی جسے اخلاقی طور سے گناہ کہہ سکیں بلکہ کوئی ایسا ارتکاب بھی نہیں کیا جسے رسمی یا قانونی طور سے جرم ٹھہرایا جا سکے اب تو یوں ہے کہ اگر کوئی یاد نہ دلائے تو خیال بھی نہیں آتا کہ ہم جیل خانے میں ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ہم اپنی مرضی سے یہاں ہیں اور اگر یہاں سے باہر جانے کو جی چاہے تو کوئی ہمیں روک بھی نہیں سکتا۔ جیل میں ہمارا گھر اچھا خاصا ہے۔ کھانے پینے کو کافی ملتا ہے گرمی کچھ ایسی زیادہ نہیں اسیری کے سب سے بڑے دن کٹ چکے ہیں! اس لئے کہ اب اور کچھ ہو تو نہ قید تنہائی کا سامنا باقی ہے، نہ پولیس کی تکلیف دہ پوچھ گچھ کا ڈر ہے اور اپنی جان ناموس دونوں سلامت ہیں۔ اب تمہاری اور بچوں کی تصویریں سامنے رکھ کے میں جی سے مسکرا سکتا ہوں، تمہاری یاد سے پہلے کی طرح دل نہیں دکھتا اور یہ یقین پہلے سے زیادہ محکم ہو چلا ہے کہ زندگی خواہ کچھ بھی دکھائے بالآخر بہت خوبصورت بھی ہے بہت حسین بھی۔



(۲)

جون ۱۹۵۱ء

۱۲ تاریخ کا لکھا ہوا تمہارا پہلا خط ملا بہت خوشی ہوئی : مجھے تعجب ہے کہ
ں یہ خط اب تک نہیں ملا۔ یہ خط تو یا دس تاریخ کو سنسر ہو جانا چاہیئے تھا۔ جب
یہ خط ملے مجھے تاریخ سے مطلع کر دینا تاکہ ہم یہاں کسی سے خون حرا کر سکیں نیز یونس
رد کے کاغذات تمہیں پندرہ تاریخ کو رجسٹری کر دیئے تھے اور اب تک پہنچ جانے چاہیئیں
یہ سن کر اطمینان ہوا کہ تم اور بچے اچھی طرح ہو۔ اور اس مصیبت نے تم لوگوں کو
رد ستہ نہیں کیا مجھے تم لوگوں پر ناز کرنے کے لئے رہائی کے دن تک انتظار کرنے
ضرورت نہیں یہ بار تو مجھے اب بھی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جدائی کے دکھ کے علاوہ
میں اور کسی پریشانی کا وجود نہیں۔ انسانی ذہن بھی عجیب چیز ہے۔ گزشتہ تین ماہ
خیال ہر وقت اس مقدمے میں اُلجھا رہتا تھا لیکن اب جو مقدمہ شروع ہوا ہے تو اس
اردوئی میں ذرا سی بھی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی۔ میں بار بار دل کو سمجھانے کی کوشش
ہوں کہ معاملہ بہت سنگین ہے اور اس کے بارے میں بہت سنجیدگی سے سوچنا چاہیئے
دل پر کچھ اثر ہی نہیں ہوتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بہت ہی مہمل اور بے حقیقت
کھیلا جا رہا ہے۔ جو ایک دن ایسے ہی اچانک اور بے وجہ ختم ہو جائے گا جیسے کہ
ع ہوا تھا۔ میری گرفتاری اور اسیری کی طرح اس کا بھی نہ کوئی سبب ہے نہ جواز۔

ویسے میں بالکل صحت مند اور خوش ہوں البتہ پڑھنا لکھنا یا کام کرنا ذرا مشکل
جا رہا ہے اس لئے کہ ہمارے ساتھی ہر وقت ہنسی، مذاق اور غل غپاڑے سے آسمان
پہ اُٹھائے رکھتے ہیں۔ جیسے میں نے شاید پہلے لکھا تھا یہاں بہت سے اچھے لطیفے
میں آئے جو کبھی ملیں گے تو سنائیں گے۔ لیکن ایک ہمارے مرکزی وزیر صاحب کا لطیفہ
لو۔ حکایت ہے کہ کسی تقریب میں ہمارے کچھ مذہبی قسم کے ایک وزیر صاحب کے
ایک مسلمان لڑکی فراک پہنے بیٹھی تھی۔ وزیر صاحب نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے کسی
سے کہا " دیکھو ہماری لڑکیاں ایسی بے حیا ہوتی جا رہی ہیں کہ اپنے اعضائے نہانی
ڈھانپنے کا بھی خیال نہیں کرتیں۔" ان صاحب نے کہا " یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔
اری نے گھٹنوں سے نیچے تک تو فراک پہن رکھی ہے "۔ وزیر صاحب نے فرمایا
سے کیا ہوتا ہے مسلمان لڑکی کے اعضائے نہانی اُس کے ٹخنوں تک پہنچتے ہیں۔"
سے لطیفے بدقسمتی سے ایسے خط میں نہیں لکھے جا سکتے جو سنسر کے ہاتھوں سے گزرتا ہے۔

موسم اب گرم ہو چلا ہے لیکن ہوا چلتی رہتی ہے اس لئے کچھ ایسا ناخوشگوار بھی نہیں
س کا رنج ہے کہ اب کے اپنے محبوب شہر لاہور کے بادل نظر نہیں آئیں گے اور
ں کے بعد مہکتا اور مسکراتا ہوا سبزہ دکھائی دے گا۔ خیر۔ کبھی نہ کبھی۔

اماں اور بھائی طفیل کا پتہ بھیج دو تاکہ میں انہیں خط لکھ سکوں۔ اور لندن
اماں اور ابا کا بھی۔ ہم لوگ مقررہ تعداد سے زیادہ خط نہیں لکھ سکتے لیکن جہاں
معلوم ہے آنے والے خطوط پر کوئی پابندی نہیں بشرطیکہ اُن میں سیاسی معاملات وغیرہ
کا ذکر نہ ہو اس لئے مخلص دوستوں کو اطلاع کر دو کہ جو بھی ہمیں لکھنا چاہے اس کے خط کے لئے
ہم چشم براہ ہوں گے

ہمارا مقدمہ غالباً بہت دن چلے گا اس لئے میرا خیال ہے کہ تم لوگ جولائی کے
اواخر تک آسکو تو آجاؤ۔ اُس وقت تک موسم کچھ معتدل ہو جائے گا اور سفر زیادہ تکلیف دہ
نہیں ہو گا۔ بہر صورت اپنی سہولت اور اپنی گرہ میں مال دیکھو بے وجہ زحمت اُٹھانے کی
ضرورت نہیں۔ مجھے یہاں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ انسپکٹر جنرل قید خانے جات لاہور کو
ٹیلی فون کر کے پوچھو کہ شاہی قیدی کی حیثیت میں اگر ہمارے الاؤنس کا کچھ پیسہ بچا ہو تو
تمہیں بھجوا دیں۔ م

(۳)

۹ ستمبر ۱۹۵۱ء

آج اتوار ہے صبح آنکھ کھلی تو روزمرہ کی طرح اپنی بارک کی بے رونق دیواروں اور
چارپائیوں کے جم غفیر کے بجائے ایک نرم و نازک پودے پر نظر پڑی جو ہوا میں جھوم رہا تھا اس
کے مہین پتوں میں سے دُور کہیں ایک آدھ ستارہ جھانک رہا تھا اور ایک بہت نرم سپید
مروارید رنگ آسمان کی جانب محو پرواز تھا۔ یہ عجوبہ اس لئے ہوا کہ دو دن پہلے ہمیں کچھ
اور رعایتیں دی گئی ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ اب ہم اگر چاہیں تو باہر کھلے میں سو سکتے ہیں۔ پہلا
دورانیہ تو میں نے بارک کے اندر ہی گزار دیں۔ دل میں اب بھی کچھ نازک مقام ایسے ہیں جن
سے کوئی یاد چھو جائے تو دکھنے لگتے ہیں۔ اس لئے صحرائے سندھ کے گرد آسمان اور پچھلے
پہر کے اداس چاند کو دیکھنے سے ڈر سا لگتا تھا۔ لیکن کل رات ہمارے بارک روم میں کچھ ایسی بھگدڑ مچی
کہ آخر مجھے بھی باہر آنا پڑا۔ باہر کی نامانوس فضا سے بار بار سینہ اُچھٹتی رہی لیکن یہ بے خوابی ناسود
نہیں تھا، صرف اس وجہ سے نہیں کہ باہر رات کا منظر کچھ اور ہوتا ہے بلکہ اس لئے بھی کہ رات
موسم بھی بدل چکا ہے اور گرمیوں کی اُکتا دینے والی یکسانیت کے بجائے ہوا، روشنی اور آسمان
دن رات میں کئی بار دل تڑپا دینے والے رنگ بدلتے ہیں خاص طور سے شام ڈھلے جب
پہلے پہل ستارے طلوع ہوتے ہیں تو آسمان کے نظارے سے محض وسعت اور فاصلے ہی کا
احساس نہیں ہوتا بلکہ اس میں رنگ و حرکت کے اُتار چڑھاؤ سے ایسے گوناگوں نقشے بنتے
ہیں کہ دل خوش ہو جاتا ہے۔ آج کل بہت شدت سے اپنی زندگی کا سب سے دلکش سیرابا یاد آ رہا
ہے یعنی دہلی میں لودھی روڈ والا گھر اور بارش کے بعد گرد و پیش کا سماں، پٹھان مقبروں
کے گرانڈیل گنبد، وہ ہمارے گھر کے سامنے کا طلسمی پل اور اسے چومتی ہوئی کہکشاں کی کمان۔
اس درد کی چبھن دل میں نہ ہو تو آدمی کبھی پوری طرح محسوس ہی نہ کر لے کہ زندگی کس قدر
مہربان اور کتنی حسین ہے۔

افسوس کہ ہم نے کبھی گاؤں میں چھٹیوں کے دن ساتھ نہیں گزارے ورنہ میں تمہیں
کچھ اور بھی پرانی یادوں میں شریک کر سکتا۔ جو آج کل یہاں چھٹیوں کی صبحیں دل میں جگاتی رہتی





جیل خانے کے صحن میں چارپائیوں کی قطار اور لپٹے ہوئے بستروں کے انبار، اونچی اونچی
روں پر تیز روشنیاں اور لالٹین سلگتے، ہر طرف غنودگی اور کسلمندی کی سی فضا، تیز رو ہوا میں
کی سرسراہٹ، بہتے ہوئے پانیوں کی آواز کا دھوکا، اِن سب باتوں سے ایسے گاؤں
پنیوں کے وہ بیتے ہوئے دن یاد آتے ہیں جب ہم بہت چھوٹے تھے اور ریل اسٹیشنوں
کا فیشن ابھی نہیں چلا تھا۔ یہاں آس پاس کسی طرح چند بھینسیں اور رہٹ کی رُوں رُوں
ہو جائے تو گاؤں کا منظر مکمل ہو جائے۔

میں جیل خانے کی رعایتوں کی بات کر رہا تھا ہمیں ایک ریڈیو سیٹ بھی مل گیا ہے۔
کرسی، میز کی لیمپ اور کچھ اور سازوسامان کا بھی وعدہ ہو چکا ہے۔ اب تو ہم میں سے بعض
کو لاحق ہو گئی ہے کہ یہاں سے نکلے تو یہ معیارِ زندگی کیسے قائم رکھ سکیں گے۔

تاثیر کا مسودہ جب کبھی ملا میں صاف کر کے بھجوا دوں گا۔ کرسٹس اور بچے کیسے ہیں۔
ات میں کرس کا نام بار بار نظر آتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی بڑی حدائی ذوحدار ہو گئی
یہ بھی دیکھا کہ بیگم عرفان اللہ کی تصویر آخر کار پاکستان ٹائمز میں چھپ ہی گئی اور وہ بھی بہت
طور سے

اور کوئی نئی خبر نہیں ہے سوائے اس کے کہ عید کے لئے بڑے پیمانے پر ایک ضیافت
ام ہو رہا ہے پہلی دفعہ تمام اسیروں کے بیوی بچے یہاں جمع ہوں گے اور ہمیں اجازت
ہے کہ اس دن ہم سب مل کر کھانا کھا سکیں۔ چنانچہ آج کل مرغ قورمہ اور بریانی کے
دوسرا موضوع گفتگو نہیں۔)

(۴)

اکتوبر ۱۹۵۱ء

آج تمہارا خط ملا، بڑی راحت ہوئی۔ آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔ دعا ہے کہ
(بلکہ ہمیں) یہ دن کئی بار دیکھنا نصیب ہو۔ ان دس برس میں ہم نے بہت سا سکھ دیکھا
اور تھوڑا سا دکھ بھی لیکن ہم نے یہ تمام دن دیانت داری اور سکونِ خاطر سے گزارے
ور زندگی میں سب سے اہم بات یہی ہے، تو آؤ ان بیتے ہوئے دنوں کا شکرانہ ادا کریں،
برس ایسی دولت ہیں جسے کبھی فنا نہیں اور جسے کوئی چھین نہیں سکتا۔ اگر کسی کا عقبیٰ یا
احکامات پر ایمان نہ ہو تو نیکی اور اخلاق کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ جو لمحہ
صداقت کی پرورش میں گزرے وہ بجائے خود خوشی کا ایسا خزینہ بن جاتا ہے جسے
رہزن لوٹ نہیں سکتا۔ نہ کوئی جابر ضبط کر سکتا ہے۔ شاید مذہبی اصطلاح میں توشۂ
کے صحیح معنی یہی ہیں۔

تم نے اپنے گھر کی تنہائی کا ذکر کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تنہائی کتنی کڑی اور جدائی
کے لمحے کتنے گراں ہیں۔ ان کو دل سے دھویا تو نہیں جا سکتا لیکن ان کا بوجھ اس تصور
سے کم ضرور کیا جا سکتا ہے کہ بیتے ہوئے دن کیسے اچھے تھے اور آنے والے دن کتنے بہتر
ہیں گے۔ میں تو یہی کرتا ہوں جب جیل خانے کا دروازہ بند ہوا ہے میں کبھی ماضی کے چیزیں
بار بار کر کے اسے مختلف صورتوں میں دوبارہ سنوارتا رہتا ہوں اور کبھی آنے والے دنوں کو دام
ذہن میں مقید کر کے ان سے اپنی مرضی اور پسند کے مختلف مرقعے ترتیب دیتا رہتا ہوں بجاتا

ہوں کہ یہ بیکار سا شغل ہے اس لئے کہ خوابوں کو حقیقت کی زنجیروں سے آزاد نہیں کیا جا
سکتا لیکن اتنا ضرور ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے آدمی تخیل کے پَل پر گردوپیش کی دلدل سے
پاؤں چھڑا سکتا ہے۔ در اصل بری بات ہے لیکن جب ہاتھ پاؤں جکڑے ہوئے ہوں تو آزادی
کی واحد صورت یہی رہ جاتی ہے اسی نسخے کے طفیل مجھے جیل کی سلاخیں بہت ہی عجیب اور
بے حقیقت دکھائی دینے لگی ہیں اور بیشتر اوقات اُن کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔

تم کہو گی کہ ہم بقراطی چھانٹ رہے ہیں اس لئے آؤ کوئی اور بات کریں۔ چند دن ہوئے
میں نے ریڈیو کھولا تو معلوم ہے اس جانب کون تھا۔ اپنے اے۔ ایس۔ بی، امریکی اخبار والوں
کی کھچائی کر رہے تھے بہت لطف آیا۔ خاص طور سے اتنی بہت سی امریکی خشمی آوازیں سن کر امریکہ
کے لئے دل اُداس ہو گیا ہوگا۔ ڈاکٹر نکاری کیا آجکل کسی ملک کے لئے واقعی غیرجانبدار ہونا ممکن ہے
بخاری صاحب نے جواب دیا "یہ بھی واقعہ ہے کہ آج کل کچھ ملک واقعی غیرجانبدار ہیں اور
اگر غیرجانبداری ممکن نہیں تو ایسا کیونکر ممکن ہوا؟" بہت دل لگی رہی۔ (یہ امریکی اپنے
خاص لہجے میں کنٹری کو کنیری اور لڈ آف ٹوڈے کو ورلڈ آف ٹوڈنٹا اور نیوٹرل کو نوٹرل کو
رہے تھے)۔

یہاں گرمی کا موسم غیرمعمولی طور سے طویل ہوتا جا رہا ہے۔ راتیں خنک ہو چکی ہیں
لیکن دن اب بھی گرم ہیں اگرچہ بہت ناخوشگوار نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے اس حصے
میں گلابی جاڑوں کی وہ سحر آفریں رُت وارد ہی نہیں ہوتی جس سے ہم پنجاب میں آشنا ہیں۔
وہ موسم جب ہوا کا ہر جھونکا کسی کے پیار کا لمس محسوس ہوتا ہے اور گرد آسمانوں میں کسی دوشیزہ
جسم کی سی نرمی اور آنچ محسوس ہوتی ہے۔ خیر ایسے موسم سے آسودگی نہ سہی کچھ بدل مجھے
اُس خوشبو سے مل جاتا ہے جو تم نے بھیجی تھی اور جسے میں ہر رات اپنے تکیے پر چھڑک لیتا ہوں
پہلی شام جب یہ خوشبو ہمارے برآمدے میں مہکی تو شہر زنداں میں بستی دور تک گئی۔

اتوار۔ میں نے فرانسیسی میں کافی ترقی کر لی ہے۔ جب ہم میں گئے تو فرانسیسی میں گفتگو
کریں گے۔ اس لئے اگلے سال پیرس جانے کا پروگرام پکا کر لو کچھ دنوں کے بعد مجھے کوئی فرانسیسی
کتاب درکار ہوگی۔ موپساں یا کسی اور مصنف کی کتاب جو سہل اور سادہ زبان میں ہو مل سکے
تو بھجوا دو۔)

(۵)

۱۷ جولائی ۱۹۵۲ء

کل رات تمہیں خط لکھا تھا۔ غالباً ابھی بھجوایا نہیں گیا
آج صبح میرے بھائی کی جگہ موت میری ملاقات کو آئی۔ سب لوگ بہت گھبرائی
سے پیش آئے یہ لوگ میری زندگی کی عزیز ترین متاع مجھے دکھانے لے گئے۔ وہ متاع
جو اب خاک ہو چکی ہے۔ اور پھر وہ اُسے اپنے ساتھ لے گئے۔

میں نے اپنے غم کے غرور میں سر او نچا رکھا اور کسی کے سامنے نظر نہیں جھکائی، یہ
کتنا مشکل کتنا اذیت ناک تھا صرف میرا دل جانتا ہے۔
اب میں اپنی کوٹھڑی میں اپنے غم کے ساتھ تنہا ہوں۔ اب مجھے سر او نچا رکھنے کی



Cerelac®.
The complete cereal including milk.

From 4 months onwards, Cerelac is an ideal way to start a child on solids.

Cerelac is a complete instant cereal containing milk Doctors prefer to recommend it because Cerelac is an easily digested weaning food

As baby's first spoon-fed solid food, it helps develop his ability to chew

Cerelac is a well-balanced milk cereal that contains appropriate vitamins, mineral salts and iron

For preparation, Cerelac requires only to be mixed with water It can also be mixed easily with fruit juice, mashed fruit or vegetables to provide variety to baby's menu

Cerelac.
Complete. Instant. Nutritious.

MCM



ورت نہیں۔ یہاں اس غم کے بے پناہ ظلم سے ہار مان لینے میں کوئی تذلیل نہیں ہے۔
میں اس کے بیوی بچوں اور اپنی امّاں کے خیال کو دل سے ہٹانے کی کوشش
ر رہا ہوں۔ ابھی انہیں کچھ لکھنے کی سکت بھی نہیں ہے۔ بلکہ ہی کیا سکتا ہوں۔ میں نے اپنی
کی پہلی اولاد اُن سے چھین لی ہے۔ ان میں نے ہی سب کو اس کی زندگی سے محروم
ردیا ہے۔

اس وقت حواس اتنے پراگندہ ہیں کہ زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ لیکن آپ لوگ میرے
لیے فکرمند نہ ہوں۔ یہ زخم بہت اچانک نہایت بے سبب لگا ہے لیکن اسے سہنے کا اہل
ہوں ہے اور اس کے سامنے کبھی میرا سر نہیں جھکے گا۔ صرف یہ جی چاہتا ہے کہ اس وقت میں
ہوتا اُن بیچاروں کو اپنے بازوؤں کا سہارا دے سکتا جن کے تن مجھ سے زیادہ کم طاقت
ہیں کا دکھ میرے غم سے زیادہ بھاری ہے۔)

(۶)

دسمبر ۱۹۵۲ء

تمہارا گزشتہ خط اتنا اُداس تھا کہ دل کچھ سہم سا گیا اور میں نے جواب میں خیال
ے روک لیا کہ کہیں میں بھی ایسی ہی افسردہ باتیں نہ لکھ دوں۔

تمہارا دوسرا خط آیا تو بات سمجھ میں آ گئی۔ اگر دلی جذبات کے بارے میں میری باتیں
یوسف د... معلوم ہوتی ہیں تو مجھے افسوس ہے اصل میں میری مراد یہ تھی جو دہرا
ں کی ایسا سخت نہیں جیسا میں ظاہر کرتا ہوں ذرا سی بے احتیاطی کرو تو بُری طرح دُکھنے
لگتا ہے۔ میں ... کہ آنسو اور دردِ دل کوئی عیاشی یا حطاکاری نہیں جس پر نکتہ چینی
یا گرفت گیری کی جائے۔ ہمارے ایسے حالات میں تو یہ زندگی کا تقاضا ہیں اور انہیں بالکل
دبانے کی کوشش نہ صرف اپنے پر بے وجہ اور ناقابلِ برداشت بوجھ ڈالنا ہے بلکہ ایک طرح
کا جھوٹ اور ریاکاری بھی ہے جو غیر اخلاقی باتیں ہیں اگر تم سمجھتی ہو کہ میں نے تم سے اس
بات کے جان لیوا پن کا مطالبہ کیا ہے تو غلط ہے یہ مطالبہ تو میں اپنے آپ سے بھی نہیں
کیے مشکل اوقات میں جس چیز سے تشویش یا ڈر محسوس ہوتا ہے وہ یہ چیز نہیں ہے میں
... کہتا ہوں کہ جب دل میں درد و کرب کا طوفان ہو تو سر اتنا بلند ضرور رہے
کہ مستقبل میں اُمید کی کرن نظر آ سکے، زندگی پر اپنا ایمان قائم رہ سکے اور حسن و خوبی سے
... ہونے کی صلاحیت ضائع نہ ہونے پائے اگر ان پانیوں کو سر سے گزر جانے دیں تو
... ہو جاتا ہے اپنا توازن ایک دفعہ ہاتھ سے نکل جائے تو پھر مشکل سے گرفت میں
آتا ہے خوف و خطر کا مرحلہ یہی ہوتا ہے۔ جب موجیں دہاڑتی ہوئی ٹھاٹھیں مارتی آتی ہیں
... سیلاب کا خاتمہ کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ جب ہاتھ پاؤں سرد اور شل ہو جاتے
... اگرچہ یہ جدوجہد انتہائی اذیت ناک معلوم ہوتی ہے لیکن یہ جدوجہد تو جاری رکھنی ہی
ہے نہ صرف اپنی جان کے بچاؤ کی خاطر نہیں بلکہ ان سب چیزوں کی خاطر بھی جنہیں آدمی
... مقدس اور بیش قیمت جانتا ہے، اس لئے تم اپنے آنسو بچا کر رکھو نہ اپنا سر
... اس لئے کہ طوفان گزر جائے گا، بادل کھُل جائیں گے اور سورج پھر

ہو سکے گی کل نہیں تو پرسوں یا ... بہت دیر کے بعد جب بھی ہو یہ ہونا یقینی ہے۔
اگر تم نے میری گزشتہ سطور ... ہے تو مضائقہ نہیں سبھی پڑھنے والوں
کا خیال رکھنا چاہیئے۔ ادیب کسی ایک کا ہو کر نہیں رہ سکتا اور ظاہر ہے کہ سب چاہنے
والوں کی گردن میں ایک جیسے دام نہیں ہوتے۔

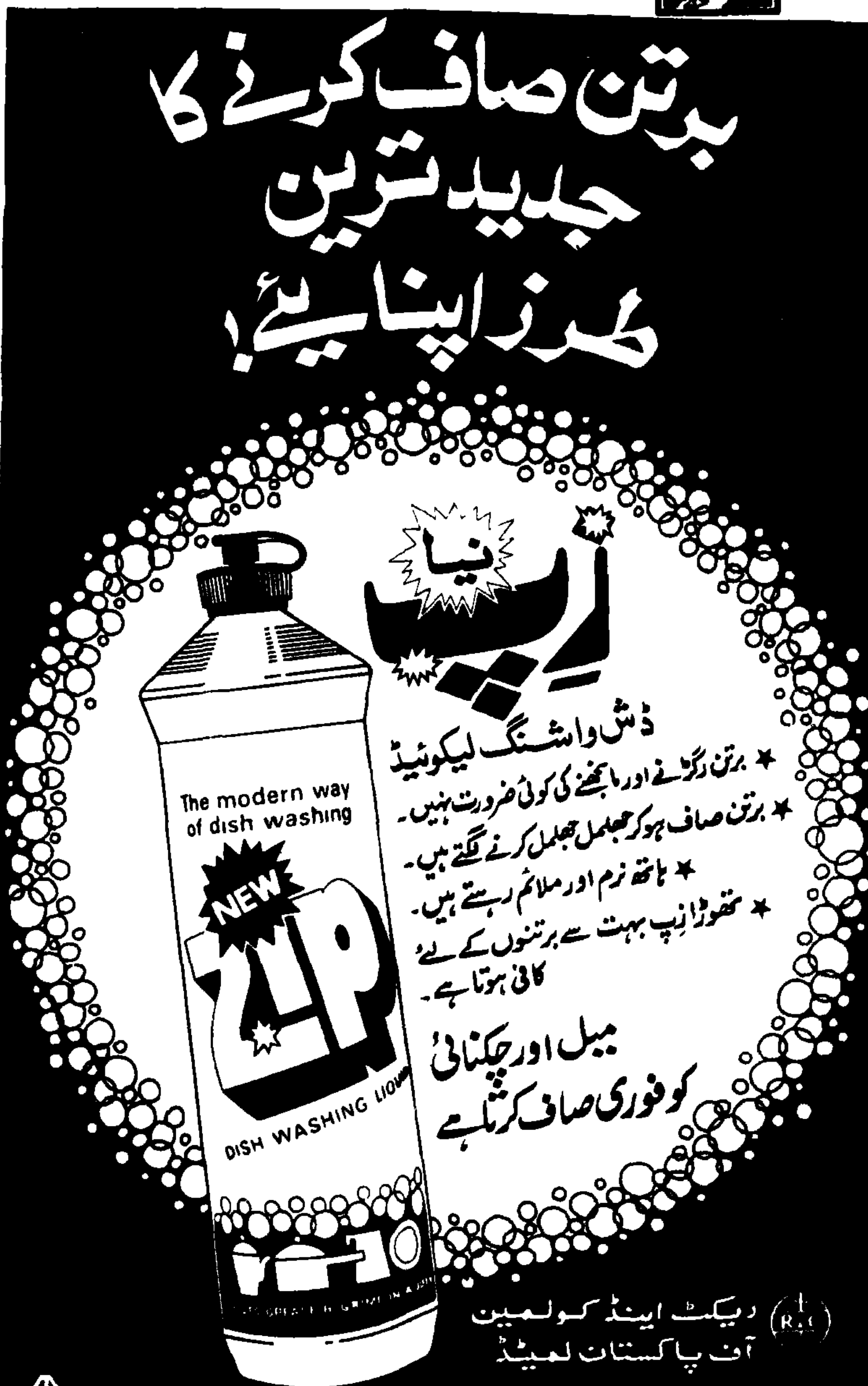
(۷)

۵ جنوری ۱۹۵۳ء

اب تک بری خبر تمہیں پہنچ چکی ہو گی اس سے اپنا دل زیادہ پریشان نہ ہونے دو۔
جیسے ہم نے پچھلے دو سال گزار لئے یہ بھی گزار لیں گے۔ اصل میں کوئی مصیبت اتنی بری نہیں
ہوتی جیسی کہ بظاہر نظر آتی ہے اور جب گزر جائے تو بہت عجیب لگتا ہے کہ ہم اس کے بارے میں
اتنے ہراساں کیوں تھے۔ ذرا سوچو تو اس نئی مصیبت کے آخر کیا معنی ہیں زیادہ سے زیادہ
ڈھائی سال کی مزید جدائی۔ اگر تم گرد و پیش نگاہ دوڑاؤ تو ہندوستان پاکستان میں تمہیں شاید ہی
کوئی نیک آدمی ایسا ملے گا جس نے برطانوی عہد میں اس سے زیادہ جیل نہ کاٹی ہو۔ اور کسی کا کچھ
بھی نہیں بگڑا۔ بدقسمتی سے نیکی اور نجات کی کوئی سہل راہ نہیں ہے، اس راہ میں ہم سے جو مطالبہ کیا
گیا ہے وہ کسی طرح غیر معمولی نہیں ہے۔

۶ جنوری۔ مجھے افسوس ہے کہ کل کے واقعہ کی گہما گہمی میں یہ خط ختم نہ ہو سکا۔ ابھی سے کل
کے واقعات بالکل مہمل اور دل سے دور معلوم ہونے لگے ہیں حقیقی اور بامعنی بات صرف اتنی
ہے کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا، کوئی گناہ نہیں کیا اور میرا دل بالکل مطمئن اور پُرسکون ہے
آج صبح ہمارے ساتھی اسی بات کی شکایت کر رہے تھے۔ اُن کا کہنا ہے کہ کل رات نو بجے کے قریب
جب وہ میرے ہاں سے اُٹھ کر گئے تو بس دس منٹ کے اندر میں سو گیا اور خراٹے لینے
لگا جس سے اُن کی نیند خراب ہوئی ضرور ایسا ہی ہوا ہو گا اس لئے کہ صبح جب میری آنکھ
کھُلی تو کمرے میں دھوپ آ چکی تھی۔ اچانک میں نے سوچا کہ کل ہوا کیا تھا اور اس ساری
خرافات پر ہنسی آنے لگی۔ پھر ہم فلسفہ چھانٹنے لگے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ ایک آدمی
جو زندہ اور صحت مند ہے کیسا ہی غمگین اور دردمند کیوں نہ ہو اُس شخص سے بہرصورت بہتر
ہے جو زندہ ہے لیکن بیمار ہے۔
اور وہ شخص جو زندہ اور بیمار ہے لیکن اُسے صحتیاب ہونے کی اُمید ہے اُس شخص
سے بہتر ہے جو زندہ اور بیمار ہے لیکن شفا سے نااُمید
اور یہ آخری شخص اُس شخص سے بہتر ہے جو کہ مر چکا ہے
اور جو مر چکا ہے وہ تو کوئی شخص ہی نہیں اس لئے وہ نہ کسی سے بہتر ہے،
اور نہ بدتر اس کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص بھی زندہ ہے وہ کسی نہ کسی سے بہتر ہے اس لئے
اُسے شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا اس سے مجھے گرمانی کا وہ قصہ یاد آ گیا جس میں دو
صوفیوں کی ... اور پھر مجھے ہنسی آ گئی۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ بہت وزنی اور سنجیدہ معاملات
کے بارے میں ہمارا رویّہ قطعی غیر سنجیدہ ہے، تو ہم معافی چاہتے ہیں۔ لیکن یہ معاملہ ہے ہی





برتن صاف کرنے کا
جدید ترین
طرز اپنایئے!
نیا
زِپ
ڈش واشنگ لیکوئیڈ
★ برتن رگڑنے اور مانجھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔
★ برتن صاف ہوکر جھلمل جھلمل کرنے لگتے ہیں۔
★ ہاتھ نرم اور ملائم رہتے ہیں۔
★ تھوڑا زِپ بہت سے برتنوں کے لیے کافی ہوتا ہے۔
میل اور چکنائی
کو فوری صاف کرتا ہے
The modern way of dish washing
NEW
ZIP
DISH WASHING LIQUID
ریکٹ اینڈ کولمین
آف پاکستان لمیٹڈ







اس قدر واہیات۔ مجھے اس کا پورا احساس ہے کہ تمہارے لئے یہ کوئی ہنسی کی بات نہیں ہے اور تمہارے تھکے ہوئے کاندھوں پر پہلے سے کہیں مزید بوجھ لاد دیا گیا ہے۔ لیکن اپنا دل مضبوط رکھو اور اُن لوگوں کے بارے میں سوچو جو تم سے کہیں زیادہ کم نصیب ہیں۔ یہ امتحان کیسا ہی سخت کیوں نہ ہو آخر گزر جائے گا۔ تم اس کا سوچو کہ جس دن یہ ختم ہوگا وہ دن کیسا ہوگا۔ بہرحال مجھے یقین ہے کہ صورتِ حال جیسی بُری نظر آتی ہے ویسی ثابت نہیں ہوگی مجھے خوشی ہے کہ نصیر تمہارے پاس آگیا ہے۔ اُمید ہے کہ وہ کافی دنوں تک تمہارے پاس رہے گا۔ کل آمنہ کا تار بھی آیا تھا جس سے مزید تقویت ہوئی، صرف اپنی دکھیا ماں کے خیال سے دل دہلتا ہے اُمید ہے کہ تم اور آمنہ دونوں اُن کی کچھ دلجوئی کر سکو گی اور انہیں سمجھا سکو گی کہ زیادہ پریشان نہ ہوں۔ آخر میں سب حالات سدھر جائیں گے۔ میری طرف سے اُن سے درخواست کہ میری وجہ سے انہیں جتنا دُکھ پہنچا ہے اس کے لئے مجھے معاف کر دیں میرے اگر کوئی بوجھ یا گناہ کا احساس ہے تو صرف یہی ہے۔)

فیض کے خطوط، ہمعصروں کے نام

الف

۲۴ جولائی

خدیجہ بیگم

تمہیں لکھنے کو بہت دفعہ جی چاہا لیکن یہاں کے خط اتنی دیر میں پہنچتے ہیں کہ لکھنے میں کچھ مزہ نہیں آتا۔ ہمیں کل سیبی ٹوریم سے چلا جانا چاہئے تھا لیکن انتظام میں کچھ گڑبڑ کی وجہ سے دو دن اور رکنا پڑا اب کل جائیں گے۔

یہ بہت پرانا شہر ہے سرد اور سبزہ ہے۔ اور پھولوں کا کچھ شمار نہیں۔ چاروں طرف چیل صنوبر اور سفیدے کے گھنے جنگل ہیں جن میں بہت ہی رومانٹک قسم کی پگڈنڈیاں اور رستے ہیں۔ کوئی ساتھ ہو تو بوقت ضرورت رستہ کھو جانے کا عذر ہر وقت منوایا جا سکتا ہے اور قدم قدم پر جوش صاحب کی طرح اپنی جوانی یاد آنا چاہئے۔ ہم نے بھی کوشش کی لیکن بالکل یاد نہیں آئی۔ شاید اس لئے کہ اس سیبی ٹوریم میں جتنے جوڑے ہیں ماشاءاللہ ہم سے کہیں زیادہ زرگ صورت ہیں اور انہیں دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ ابھی کچھ ایسا نہیں بگڑا۔

یہاں آکر ایک تو یہ انکشاف ہوا کہ فرصت اور سکوں اور مناظرِ قدرت جیسے ہمارے پُرانے اُردو شاعر۔ نیچر کہتے تھے ہماری عمر میں شاعری سے کچھ رشتہ نہیں رکھتے۔ تمہاری اور اپنی فرمائش پر شاعر صاحب کو جھنجھوڑنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس ہی نہیں ہوئے۔ نہ کام نہ کاج، نہ فکر نہ فاقہ، نہ غمِ عاشقی نہ غمِ روزگار، ایسے میں شعر کہاں سے آئے۔ بہت دل کو سمجھایا کہ دوسروں کا غم اپنانا چاہئے اور ابنائے وطن کے مصائب اور اہلِ عالم کے مسائل کو یاد کر کے آنسو بہانا چاہئے لیکن اس وعظ و نصیحت کا کچھ اثر ہی نہیں ہوا۔ تنگ آکر شیکسپیر کے ایک کھیل کا ترجمہ شروع کر دیا۔ تھوڑا سا کیا ہے۔ کافی لطف آیا۔ واپس آکر سبط ایلس حریت کا ایک پرچہ لائی تھیں جس میں سبط کا کالم ہے، بہت اچھا آیا اگر لکھتے رہیں تو بہت اچھا ہو۔ باقی خبریں یہ ہیں کہ کراچی سے ماسکو تک نسیم اکبر جان عرف نسیم جہاں کا ساتھ رہا اور لاہور کے بہت سے اسکینڈل سننے میں آئے۔ جنیوا میں ہندو پاکستان کے نمائندوں نے دونوں ملکوں کی دوستی اور ان کے باہمی جھگڑے نپٹانے کے بارے میں ایک مشترکہ بیان دیا جس کا بہت چرچا ہوا۔ قاہرہ میں راہ چلتے ایک عربی شاعرہ سے یاد اللہ ہو گئی بعد میں پتہ چلا کہ وہاں کی بہت بڑی تیس مار خان ہیں اور آج کل وہ ہماری خرافات کا عربی میں ترجمہ کر رہی ہیں۔ ماسکو میں حفیظ تمہیں یاد کرتی تھیں اور پوچھ رہی تھیں کہ آئی کیوں نہیں۔ دو دفعہ ہمیں سینی ٹوریم میں دیکھنے آئیں۔ ایک بار اطہر بھی آئے۔ ماسکو کے لوگ ان دونوں کو کافی چاہتے ہیں اور ان کے جانے پر رنجیدہ ہیں۔

تمہارے دونوں خط بھجوا دیئے گئے تھے۔ غالباً ایلس کے ہاتھ جواب بھی پہنچ جائے گا۔ میزو کے بہت مزے کے خط ملے جن میں ظاہر ہے کہ تمہارا بہت ساذکر تھا۔

ہمیں اب لوٹ آنا چاہئے تھا لیکن جاپان سے ایک دعوت آگئی ہے ایک یہی ملک رہ گیا ہے جو ہم نے نہیں دیکھا اور بہت دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے لگے ہاتھ دیکھتے چلیں اور دو تین ہفتے میں ملاقات ہو گی۔ تمہیں یاد کرنے والے کیلب کو سلام بچوں کو پیار۔ سبط سے ملاقات ہو تو پیار پہنچا دیجیے کچھ دن علی سردار کا ساتھ رہا۔ سب کو سلام اور پیار بھیجا ہے فقط



(ب)

خدیجہ مستور

مجھے افسوس ہے آپ لوگوں کے دورانِ ابتلا میں آپ سے اظہار ہمدردی نہیں کر سکا۔ بہرصورت اب جونکہ صبح کے گئے شام کو گھر لوٹ چکے ہیں اس لیے گزشتہ ہمدردی اور موجودہ حسرت دونوں قبول کیجیے۔ یہاں پہ تو صبح و شام کا امتیاز مدت سے مٹ چکا ہے اور وقت کے ٹھہرے ہوئے پانی میں دوستوں اور عزیزوں کی یاد کے علاوہ کوئی لہر نہیں اٹھتی۔ شاید یہ بات بھی بالکل صحیح نہیں اس لیے کہ یہاں کے روز و شام دیس سے مختلف ہیں۔ یہاں چاند نکلتا ہے تو چاندنی لارنس باغ کے سرد سیاہ سائے شہر کی خاموش اور خوابیدہ گلیاں یا شاہی مسجد اور مقبرۂ جہانگیر کے محو خیال مینار تصور میں نہیں آتے۔ یہاں کی چاندنی کے "پردۂ ظلم" پہ ان مانوس نقوش کے لق و دق صحرا ریت کے گداز ٹیلوں میں گزرتے ہوئے اونٹوں کی قطاریں اور اُن اونٹوں پہ اجنبی شہزادیوں کے رنگیں محمل دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح یہاں کی صبحوں میں شبنم اور یاسمن و گلاب کی باس نہیں ہے نہ خواب آلود حسیناؤں کی بیداری کا دلہاپن۔ اس کے بجائے ان میں نادار کسانوں کی آنکھوں کی بے رونقی ہے اور ویرانی کی تپتی ہوئی دھوپ میں کسی شجرِ سایہ دار کی افسردہ ٹھنڈک!

یوں "گوشے میں قفس کے" عافیت بھی بہت ہے خوب کھاتے ہیں خوب سوتے ہیں زیادہ نہیں تو اس عارضی وفات نے کچھ عرصے کے لیے بہت کی ذاتی الجھنوں سے دل کو (اور شاید چند دوستوں کی الجھنوں سے ان کو) نجات دلا رہی ہے۔

حسنِ غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

ہاجرہ، احمد علی قاسمی اور اپنے میاں کو میرا پیار پہنچا دیجیے۔

(ج)

۲۴۸ بیلرڈز لین N/2
۵ دسمبر

سید سبط حسن

کعبے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

بھئی آپ لوگ کبھی خط ہی نہیں لکھتے۔ یہ سچ ہے کہ ہم بھی نہیں لکھتے لیکن ہماری مجبوریاں دوسری ہیں۔ ہمارے پاس پوسٹنگ لائسنس ہے، آپ کے پاس نہیں ہے اس لیے آپ کو تو بہرصورت لکھنا چاہیے کہ کس حال میں ہیں آپ یار لوگ یعنی ہماری آرٹ کونسل اور بٹ کرا اور رحمی اور حمید اختر اور ندیم اور خدیجہ اور ہاجرہ اور وغیرہ وغیرہ۔ مہربانی سے ان سب سے کہیے کہ جس جس کو اللہ توفیق دے کبھی کچھ وہاں کی گپ ہمیں بھی سنا دیا کریں جواب کا وعدہ نہیں ہے لیکن کبھی نہ کبھی تو مروت میں لکھ ہی دیں گے۔

ہاں تو دستِ تہِ سنگ کا کیا ہوا؟ بھئی اب اور شعر تو یہاں کی ریت اور کہر میں کیا لکھا جائے گا۔ جو کچھ آپ کے پاس ہے اس کا کچھ دال دلیہ کر دیجیے جلدی سے۔ بہت تاخیر ہو چکی اور عبدالغفور کو تلاش کر کے اُسے کہیے کہ "میراں" کی دو تین جلدیں ہمیں بھیج دے۔ ٹکٹ کے پیسے حساب میں کاٹ لے۔

دوسری بات یہ کہ ہم پاکستان کے شعر اور افسانے کا ایک مجموعہ مرتب کرنے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ لیکن یہاں مواد دستیاب نہیں اگر آپ قاسمی صاحب سے مشورہ کر کے نثر اور نظم کی ایک فہرست مرتب کر کے مجھے لکھوا دیں تو بہت ثواب ہوگا۔ پیسے میں آپ کے ہاں باقاعدہ آرڈر بھیج دوں گا اور آپ اپنی نگرانی میں لکھوا دیجیے جب تک مجھے نیا دور کا وہ نمبر لکھوا دیجیے جس میں عیسیٰ کی کہانی (غالباً ستارہ) چھپی تھی۔ ہاں ایک کام اور آپ کے دفتر کے اوپر اختر کاردار کا دفتر ہے وہاں ہمارے ابا کی ایک تصویر رکھی ہے۔ اگر اختر کسی دن موجود ہوں تو اُن سے لے لیجیے اور پاکستان نیشنل میک یا ہم باوا پارک میں ہماری بھاوج سرور طفیل کو بھجوا دیجیے۔

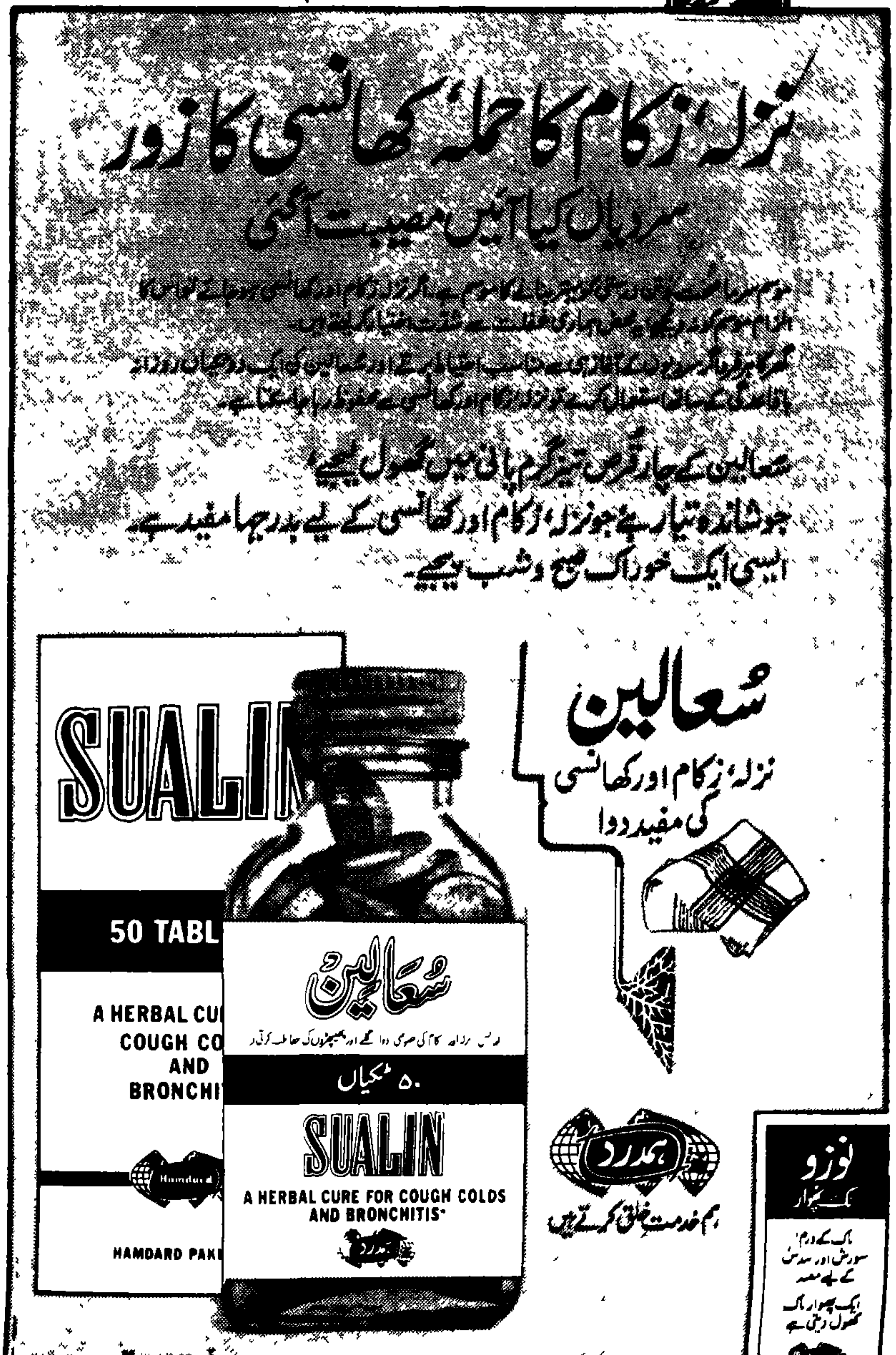
میرے خیال میں اب ختم کروں ورنہ اور بہت کچھ یاد آ جائیں گے۔ لندن میں رقیہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ آپ کا ذکر رہا۔ کہیں خورشید شاہد سے ملاقات ہو تو پیار پہنچا دیجیے اور اسحاق، رزاق اور صوفی صاحب کو بھی۔

(د)

۲۶ رمنا ایسٹ ہاؤس
رمنا ڈھاکہ
یکم جنوری

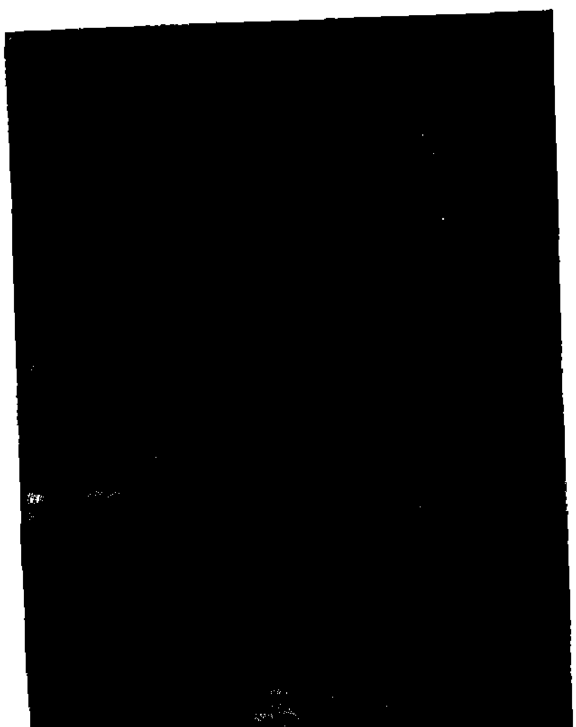
نیا سال مبارک ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ یہاں مجھے اندازے سے زیادہ دن لگ گئے اس لیے تمہارے سالنامے میں ہاتھ نہ بٹا سکا۔ بہرصورت اپنا حصہ بھیج رہا ہوں۔ لاہور میں تمہاری دفتری امداد تو ہو جاتی لیکن وہاں شعر لکھنے کا دماغ آدمی کہاں سے لائے، میں کوئی دو ہفتے تک لوٹوں گا اور امید ہے کہ جب تک ایک آدھ چیز اور بھی ہو جائے گی۔

سب لوگوں کو سلام و پیار اور نئے سال کی تہنیت۔ فقط



اخلاق عملاً مذہب ہے اور مذہب اصولاً اخلاق ہے۔





ہم سفر



فروالشین کا تعزیتی اجلاس

ایوان غالب میں جشن فیض کمیٹی، انجمن ترقی پسند مصنفین اور ایفرو ایشیائی مصنفین ایسوسی ایشن کے اشتراک سے فیض احمد کا ماتم منانے کے لئے ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس میں بھارت کے ماموراد یبوں، دانشوروں اور بیرون ملک مشاہیر ادب نے شرکت کی۔ صدارت اندر کمار گجرال سوویت یونین میں بھارت میں سابق سفیر نے کی۔ اجلاس میں سرلا گپتا نے فیض کی درج ذیل دو غزلیں مترنم اور پرسوز لہجے میں گا کر پیش کیں۔

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے

———

آئے کچھ ابر کچھ شراب آئے
اس کے بعد آئے جو عذاب آئے

محتشم صاحب نے ابتدا میں بتایا کہ فیض صاحب ان ہی دنوں دہلی آنے والے تھے لیکن موت کے ظالم ہاتھوں نے ان کو ہم سے چھین لیا ان کی صحت پہلے سے بہتر تھی بلکہ وہ کہتے تھے کہ میں اتنی جلدی جانے والا نہیں ہوں۔ ان کی اپنی شخصیت تھی۔ جو پیار اور محبت کی تھی ان کے ساتھ گھنٹوں بیٹھے رہو۔ وہ ایک جملہ بھی نہ بولیں۔ تو بھی ان کے ساتھ بیٹھنے میں ایک لطف تھا۔ پچھلے چار برس سے فیض ہی ہمارے ایسے شاعر تھے جن کی ہردلعزیزی اور عظمت بڑھتی جا رہی تھی فیض کی شاعری اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ شاعر ایک تحریک کا حصہ بن سکتا ہے

ڈاکٹر قمر رئیس نے کہا کہ فیض کی شاعری قوموں اور زبانوں کی سرحدوں کو پار کر گئی وہ ساری دنیا کی عوامی تحریکوں کے شاعر تھے۔ آج اس محفل میں ایسے لوگ موجود ہیں جن سے فیض صاحب کا تعلق ۳۰/۴۰ برسوں سے رہا ہے۔

پروفیسر جارج فشر فرانس کے عوامی رہنما اور ٹریڈ یونین لیڈر رہیں۔ لندن کے .. بین الاقوامی سیمینار پر انہوں نے فیض پر ایک مقالہ پڑھا تھا۔ فیض صاحب کئی بار ان کے دیہاتی گھر میں گئے اور جنیوا کی عالمی کانفرنس میں بھی وہ اکٹھے ہوئے۔

جارج فشر نے انگریزی میں مختصر تقریر کی اور فرمایا کہ میں فیض صاحب کو پچھلے تیس برس سے جانتا ہوں یوں تو ہماری کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ لیکن اس بار ہم دو بار ملے ایک دفعہ لندن میں اور پھر ستمبر کے آغاز میں، جب ۲۱ نومبر کو میں نے ان کی وفات کی خبر تو مجھے فرانسیسی شاعر کا یہ مصرع یاد آ گیا۔

ONE SIMPLE BEING IS MISSING AND THE WHOLE WORLD IS EMPTY

مگر فیض کے لئے وہ سا کبھی حلقہ نہ تھی وہ اپنی ذات میں کم دلچسپی لیتے تھے ان کی دلچسپی پوری نوع انسان میں تھی وہ فقط ہندوستان یا پاکستان کے سپوت نہیں تھے بلکہ کرہ ارض کے شہری تھے۔ صحیح معنوں میں ان کے تئیں ہماری شردھانجلی یہ ہے کہ ہم ان کے بتائے ہوئے اصولوں پر چلیں اور حق و انصاف کے لئے اپنی جدوجہد جاری رکھیں

ڈاکٹر اجمل اجملی نے کہا کہ فیض ایک شخصیت، ایک شاعر کا نام بھی تھا یہ تحریک ساری دنیا کو نئی زندگی کی رعنائیوں سے مالا مال کرنے کے لئے بھی یہ فیض کی تحریک تھی، اور اس کے ہر موسم پر ہم فیض کو حاضر پاتے تھے وہیت نام، الجیریا اور بیروت ہر جگہ ہم انہیں موجود پاتے تھے اس وقت جب ان ملکوں کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا اس ترقی پسند تحریک سے فیض کی شاعری شروع ہوئی جس کی بنیاد پریم چند نے ڈالی تھی فیض نے حسن کے گھسے پٹے تصور سے شاعری کو باہر نکالا۔ سب سے آگے بڑھ کر اس تصور کو بدلنے کی کوشش کی فیض نے وطن کے قیدیوں سے بھی گائے۔ ان کی لندن برگ والی نظم، تیرے ہاتھوں کی لالی اور دیگر ان گنت نظمیں دیکھئے۔ انہوں نے شاعری کی روایت بدلی۔ یہ تھے فیض جنہیں آج ہم اپنی نوعیت کے پھول پیش کرتے ہیں۔

فیض مرحوم کے ایک دوست سوم ناتھ چبیب مائیک پر آئے اور اپنی پرانی یادیں سنائیں۔ فیض نے ۱۹۱۹ء میں سیالکوٹ گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا ایم اے انگلش کیا کالج میگزین "راوی" میں ان کا کلام چھپا ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں وہ امرتسر ایم اے او کالج میں انگریزی کے پروفیسر بنے۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر صاحبزادہ محمود الظفر اور ڈاکٹر رشید جہاں وہیں تھے۔ اس وقت انہوں نے پنجاب ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی۔ پھر وہ سب لوگ لاہور آ گئے فیض صاحب سے ۱۹۳۷ء میں دوستی ہوئی۔ ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا ریڈیو لاہور کے ڈائریکٹر ہو گئے۔ فیض صاحب وہاں نظمیں پڑھتے تھے ان دنوں ان کی پہلی کتاب نقش فریادی شائع ہوئی دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو میں دہلی آ گیا، فیض صاحب فوج سے کرنل کے عہدے سے ریٹائر ہو کر دہلی پہنچے۔ ہم نے بہت سی شامیں اکٹھی گزاریں، بعد میں ہم لکھنو اور کلکتہ میں بھی ملتے رہے لندن میں بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ پچھلے برس لندن کے ایک



میگزین میں فیض صاحب کا ایک انٹرویو چھپا اس میں یہ اشارہ تھا کہ فیض نے ۵۵ برس پہلے شاعری کا آغاز کیا تھا

کمال احمد صدیقی نے کہا کہ شروع شروع میں روایت سے جو مئی ذرا شاعری اس کا مذاق اڑایا جاتا تھا یہ ۴۲ - ۴۳ء کا زمانہ تھا فیض کو جب ہم نے پڑھا تو محسوس کیا کہ اس میں روایات سے علیحدگی بھی ترقی پسند مصنفین کی بنیاد پڑ چکی تھی نئی نسل کے ذہنوں میں تھا کہ ہر وہ چیز جس پر پچھلی روایت نہیں وہ اچھی ہے ۱۹۵۶ء میں سردار گربچن سنگھ جنگل آل انڈیا ریڈیو کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے۔ مجھے رمیش چندر نے فیض صاحب سے پہلی بار ملایا تھا ایک شام کو پنڈت جواہر لال نہرو نے ہمیں تین مورتی بھون چائے پر بلایا اور وہ دیر تک فیض صاحب کا کلام سنتے رہے۔ فیض کو انسانی قدریں عزیز تھیں۔ وہ مانتے تھے دنیا میں صرف دو ہی قومیں ہیں ایک ظالم دوسری مظلوم اور وہ مظلوم قوم کے شاعر تھے

لوجن سنگھ نے فیض کی درج ذیل غزل ترنم میں پیش کی۔

جمے گی کیسے بساطِ یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں
سجے گی کیسے شبِ نگاراں کہ دل سرِ شام بجھ گئے ہیں

پاکستان سے آئے ہوئے **حسن عسکری** نے کہا فیض صاحب اس قدر ملنسار تھے کہ جو بھی ان سے ملنا چاہے اسے وہ کبھی مایوس نہیں کرتے تھے خواہ ملنے والے کو ادب سے دلچسپی ہو یا نہیں وہ ہر ایک سے نباہ کرنے کو تیار رہتے مجھے ۳۶، ۲۵ برسوں سے ان سے قرب حاصل تھا ان کی نصیف نقشِ فریادی اور دستِ صبا کی تصنیف اور دونوں کے مطالعہ کے بعد مجھے کچھ کہنے کی جرأت ہوئی کراچی میں جب وہ بارون کالج میں پرنسپل تھے درمیانی رات کو کلاس کا سکریٹری تھا اس زمانے میں ہر روز ان سے ملاقاتیں کثرت ہوتی رہتی تھیں پھر ہر برس میں ان سے قربت ہوئی دو مرتبہ میرے پیرس کے قیام کے دوران وہ تشریف لائے اور جارج فیض صاحب سے بھی اکثر ملتے رہے ایک زمانے میں ایک رسالہ ان کے خلاف مسلسل لکھتا رہا لیکن فیض صاحب نے اپنے مخالف کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا حالانکہ میں نے کئی بار ان سے اس بارے میں شکایت کی ایک بار تو کہنے لگے ہم تو یہ خرافات پڑھتے ہیں کم ہی ہیں پڑھا کر دو ظاہر ہے اس میں بڑا سکون تھا۔

ہنگری کے مشہور ادیب گیبڑلا جاک نے فرمایا کہ میرا فیض صاحب سے تیس برس کا تعلق ہے مجھے اس جلسہ میں شرکت کرنے پر ناز ہے۔ ہم کئی بار مصنفین کانفرنسوں میں اکٹھے ہوئے میں نے انہیں ہمیشہ خوش مزاج اور مسکراتا ہوا پایا۔ ان کا مشاہدہ بہت گہرا تھا فیض ایک عہد ساز شاعر تھے ان کا کلام کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے ہم نے ان کا بہت سا کلام ہنگری کی زبان میں شائع کیا ہے میں اس عظیم شاعر کو ہنگری کے مصنفین کی طرف سے اور اپنے ملک کے عوام کی طرف سے دلی خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں۔

سردار گرتار سنگھ دگل نے اپنی یادیں سناتے ہوئے کہا کہ ۱۹۴۰ء میں امرتسر میں تھا تو فیض صاحب کالج میں پڑھاتے تھے۔ ایک بار ہم نے انہیں کسی پروگرام میں بلانے کے لئے حاضر ہوئے تو ان کی بیوی ایلس نے جن کی نئی نئی شادی ہوئی تھی فیض کو ہماری تقریب میں آنے سے منع کر دیا لیکن فیض صاحب نے ہم دوستوں کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے بیوی کو منا لیا اور ہمارے ساتھ چل پڑے۔ لاہور میں وہ ادبِ لطیف کے ایڈیٹر تھے تو میرا پہلا افسانہ چھاپا تھا انہوں نے۔ پھر میرے ایک ایکٹ ڈرامے کا دیباچہ بھی فیض صاحب نے تحریر کیا تھا بٹوارے کے وقت فیض صاحب ایک واحد ہستی تھے جو اس برصغیر کے شاعر رہے ہمارے بھی وہ اپنے تھے جتنے پاکستان کے جب ان کا مجموعہ دستِ صبا چھپا تو ریلیز کے فوراً بعد اس کی پہلی کاپی مجھے بھجوائی گئی۔ سردار جعفری وہ کاپی مجھ سے لے گئے اور ڈی۔ پی دھر کے ذریعہ وہ شیخ عبداللہ کے پاس پہنچ گئی شیخ صاحب پوائیں آ گئے تو کشمیر کے معاملے میں اسے بطور حوالہ پیش کیا۔ ۱۹۶۰ء میں جب فیض صاحب دلی آئے تو میں نے انہیں بتلایا کہ مجھے نیشنل بک ٹرسٹ کا کیمپ لگانے کے لئے میسور جانا ہے۔ فیض صاحب کہنے لگے میں بھی چلوں گا۔ چنانچہ میں نے وزارتِ تعلیم، وزارتِ داخلہ اور وزارتِ خارجہ سے ان کے لئے خصوصی اجازت مانگی اور انہیں ساتھ لے گیا بنگلور میں وہ ٹیپو سلطان کے مزار پر بھی حاضر ہوئے۔ نہ کبھی ہم نے فیض کو پرایا سمجھا نہ اس نے ہمیں پرایا سمجھا ستمبر میں ہم تیونس میں تھے۔ ہندوستانی سفارت خانے نے مجھے کھانے پر بلایا تو فیض صاحب کو بھی ساتھ بلا یا۔ پھر ماسکو آئے تو وہاں ہم نے ایک شام گزاری فیض اس محفل پر چھائے رہے ہم نے "نقوش" کا ایک شمارہ ہندوستانی مصنفین کے نام سے نکالا تو اس کے آخری صفحات پر فیض صاحب کا انٹرویو شائع ہوا جو جگیر صاحب نے لیا تھا۔

فیض صاحب نے عمر کے آخری ایام میں سگریٹ پینا اور شراب پینا بند کر دیا تھا میں اس مصرعہ پر ہی بات کو ختم کرتا ہوں

کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

غلام ربانی تاباں نے کہا کہ میری پہلی ملاقات فیض صاحب سے ۱۹۵۷ء میں ہوئی پھر ۱۹۵۸ء میں تاشقند کی ایک کانفرنس میں جس میں سید سجاد ظہیر راجندر سنگھ بیدی اور میں ہندوستان کی نمائندگی کر رہے تھے حفیظ اور فیض پاکستان سے آئے تھے ان دنوں مجھے فیض کے قریب آنے کا موقع ملا۔ تاشقند میں ہم نے پاکستان کے فوجی انقلاب کی خبر سنی یہ ہم سب کے لئے تشویش کا معاملہ تھا لیکن فیض صاحب پریشان نہیں ہوئے انہوں نے کئی سال قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں پھانسی کے سائے میں گزارے لیکن وہ عوامی تحریک میں حصہ لیتے رہے وہ استبداد سے ٹکرانا جانتے تھے ان کی محبت اور خلوص نے دوستوں کے دلوں پر وہ نقوش چھوڑے ہیں جو کبھی نہیں مٹ سکتے۔

امرتا پریتم نے فیض صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ انہوں نے میری کتاب پر دیباچہ لکھا تھا۔



دوستو بزم سجا دو کہ بہار آئی ہے
کھل گئے زخم کوئی پھول کھلے یا نہ کھلے

لاہور جیل میں ان سے ملی۔ اور انہیں اپنی ایک نظم سنائی فیض صاحب سے میری دوستی اور آنسوؤں کی داستان بہت لمبی ہے ایک بار ان کا انٹرویو لیا دوران گفتگو میں نے کہا کہ داغستان کی ایک کہاوت ہے کہ شاعر سا کی تخلیق سے ایک سو برس پہلے پیدا ہوا تھا فیض ہنس دیئے اور کہنے لگے روایت ابھی چلتی ہے۔ میں بھی جب جوان ہوا میں نے بھی ایک ذہنی دنیا سائی تھی سے

کوئے یار سے لے کر سوئے دار تک

نقش فریادی کی سب نظمیں اسی کے نام ہیں عشق کی گہرائی تو بہت دیکھی ہر لفظ میں ایک سنگیت ہوتا ہے۔ ہم لفظ میں ہمارے لوگوں کا درد ہوتا ہے۔ ہم قائم ہوتا ہے تو ہمیں مٹ جانا ہے۔ فیض دنیا کے گنے چنے ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے ہم قائم کیا تیس سال پہلے ہم بلغاریہ میں اکٹھے ہوئے فیض صاحب کی تصویر سب کے دلوں پہ چھائی رہی۔ رات ڈھلے مجھے وہ کہنے لگے چلو ہوٹل کی چھت پر چلیں میں تمہیں اپنی نئی نظم سناؤں گا۔ انگریزی بولتے بولتے تھک گئے ہیں فیض نے دنیا کا درد اپنے الفاظ میں شامل کر لیا فیض جیسے شاعر کبھی کبھار دنیا میں پیدا ہوتے ہیں

ڈاکٹر قمر رئیس نے صدر جلسہ کو خطاب کرنے سے پیشتر ایک بڑی کارآمد تجویز رکھی اور وہ یہ کہ فیض کے نام سے ایک انعام رکھا جائے جو ہر برس ہندوستان یا پاکستان کے کسی نوجوان شاعر کو دیا جائے انہوں نے گجرال صاحب سے گذارش کی کہ وہ فیض اکاڈمی کے نام سے یہ سلسلہ آگے بڑھائیں تاکہ ہندوستان پاکستان کے تعلقات مزید بڑھیں یہاں قمر رئیس صاحب نے جشن فیض کمیٹی کی کارکردگی کا ذکر کیا جنہوں نے تیس برس پہلے نہایت کامیابی سے جشن فیض منایا تھا نہ صرف دہلی میں بلکہ لکھنؤ، الہ آباد، بھوپال، کلکتہ، میں بھی ان کے لئے جلسے ہوئے کلکتہ میں انہیں ریشم پر ایڈریس پیش کیا گیا تھا ان کی ہر دلعزیزی کا ذکر کرتے ہوئے دہلی کا ایک واقعہ بیان کیا جو ظاہر اً بڑا معمولی واقعہ ہے۔ لیکن اس کی حقیقت ملاحظہ ہو ان دنوں فیض صاحب انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں ٹھہرے ہوئے تھے ایک صبح دہلی کلاتھ مل کا ایک مزدور ان سے ملنے آیا اور فیض صاحب کی بہت سی نظمیں اس نے انہیں سنائیں، کچھ غلط کچھ صحیح، پھر کہا اپنے ہاتھ سے ایک نظم لکھ کر دیجئے، فیض صاحب نے اس کی خواہش کا احترام کیا اور نظم لکھ دی۔ وہ بہت خوش تھے کہ ایک مزدور نے ان کی اتنی قدر دانی کی ہے اس موقع پر قمر رئیس نے میر کا یہ شعر دوہرایا۔

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مری گفتگو عوام سے ہے

آخر میں صدر جلسہ اندر کمار گجرال نے کہا کہ اچھی بات یہ ہوگی کہ ہم فیض کی یاد کو محفوظ رکھیں یہ ہم سب کا فرض ہو گیا ہے۔ یہ کمیٹی ہم مستقل طور پر بنا ڈالیں اور اس قسم کا انعام جاری کریں جس کا ذکر قمر رئیس نے کیا ہے میری زندگی کے کئی باب ان سے ملتے ہیں ۱۹۳۷ء میں میری پہلی ملاقات ان سے ہوئی ہم بھی ان کچھ سر پھرے لوگوں میں تھے جو آزادی کی تحریک سے وابستہ تھے لیلو گھوش بھی یہاں بیٹھی ہیں ہم لوگ اس وقت نوجوان تھے انگریزوں سے ٹکر بھی لی لیکن یہ خیال بھی نہیں تھا کہ اتنی بڑی ٹکر ہم لیں گے فیض صاحب ہمارے کالج میں انگریزی کے پروفیسر ہو کر آئے تھے پہلی ملاقات میں استادی شاگردی کے رشتے ٹوٹ گئے اور دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے انقلابی رشتے بھی تھے اور روحانی بھی فیض نے شاعری میں ان دونوں رشتوں کو ملایا ہے۔

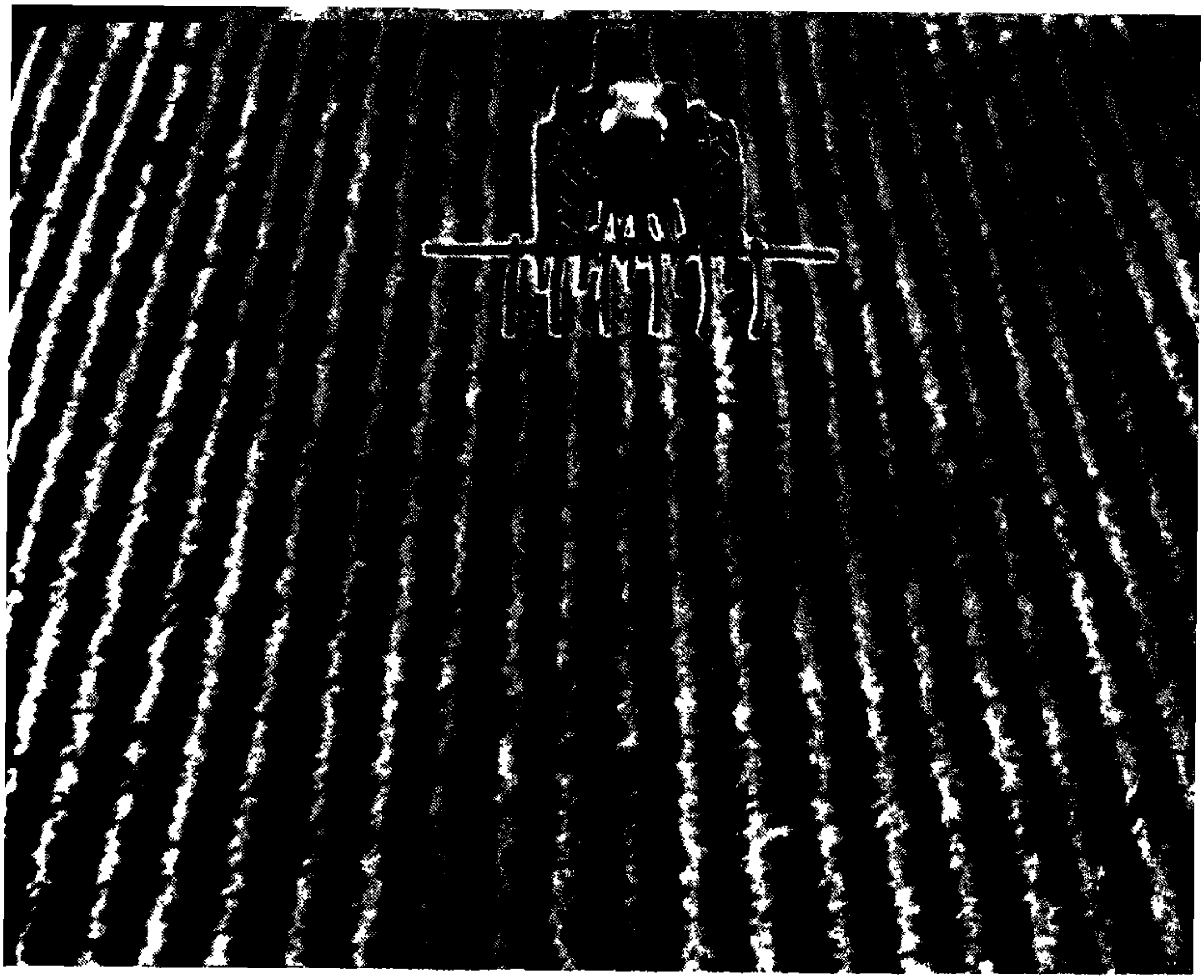
ان دنوں ہمیں یہ خبر عجیب سی لگی کہ فیض صاحب شادی کرنے انگلینڈ جا رہے ہیں خوبصورت بات یہ تھی کہ ایلس جو فیض کی بیوی بنی وہ ڈاکٹر تاثیر کی بیوی کی بہن تھی اور نکاح شیخ عبداللہ نے کروایا تھا ہم سب کی زندگی بٹی لیکن ایک چیز نہیں بٹی اور وہ تھی فیض کی ذات جس کا نقصان بھی دیتی ہے لیکن کئی فائدے بھی جن لوگوں نے جیل کاٹی ہے وہ محسوس کرتے ہیں، فیض کو جیل نے کیا کچھ بنا دیا ماسکو میں فیض نے یہ شعر مجھے سنایا تھا۔

ستم سکھائے گا راہ وفا ایسا نہیں ہوتا
صنم دکھلائیں گے راہ خدا ایسا نہیں ہوتا

ماسکو میں ہندوستانی سفیر کا گھر فیض صاحب کی بدولت علم و ادب کا گہوارہ سا ہوا تھا۔ پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش کے سارے ادیب اور روسی ادیب میرے عزت جانے پر اکٹھے ہوتے تھے، ہندوستان میں پاکستان کے سفیر ہمایوں کی پہلی ملاقات فیض سے میرے گھر میں ہوئی تھی بسمل کی نظم کی [illegible] سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے، فیض نے کہا ہے

سرفروشی کے انداز بدلے گئے فیض کیا جانئے

آخر میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر نے جملہ حضرات کا شکریہ ادا کیا اور یہ ماتمی جلسہ ختم ہوا



ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے...

صدیوں سے ہمارے وطن کی سرزمین غلّہ کی پیداوار کا گہوارہ رہی ہے۔ موجودہ زمانے میں بھی، آبادی میں بے انتہا اضافہ کے باوجود، ہماری زمین نہ صرف اپنے ملک کی آبادی کے لیئے خوراک مہیا کرسکتی ہے بلکہ ہم دوسرے ممالک کو بھی غلّہ برآمد کرنے کے اہل ہو سکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم زراعت کے قدیم طریقے ترک کرکے جدید طریقے اپنائیں۔ ہم

اب ٹیکنالوجی کے دَور کی دہلیز پر کھڑے ہیں!

زرعی ترقیاتی بینک ملک کی زرعی معیشت میں اہم تبدیلیاں لانے کے لئے ہمہ وقت کوشاں ہے۔ بینک کسانوں کو زراعت کے جدید ترین اصول اپنانے میں مدد دیتا ہے تاکہ ہم جلد از جلد اپنی زرعی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

زرعی ترقیاتی بینک

زرعی ٹیکنالوجی اپنایئے

مین ہٹن انٹرنیشنل



مرتب: [illegible] قریشی

فیض صاحب کے انتقال پر پاکستان اور بھارتی ٹیلیویژن پر ہونے والے تعزیتی پروگراموں کی تفصیل

فیض صاحب ۲۰ نومبر کو انتقال کر گئے۔ ۲۱ نومبر کی دوپہر کو ان کے ہزاروں مداحین ان کو سپردِ خاک کر آئے۔ فیض احمد فیض جو پاکستان کی شناخت تھے، پاکستان ثقافت کی شناخت تھے، تیسری دنیا کے مظلوموں کی شناخت تھے، افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ کے محبت اور نفرت کرنے والے عوام کے دلوں کی دھڑکن تھے، اپنے وطن کی، اپنی زمین کی مٹی کا حصہ بن گئے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہماری شناخت ایک بار پھر گم ہو گئی ہے، ہماری آواز بند ہو گئی ہے، ہمارے دلوں کی دھڑکن ہو گئی ہے لیکن ہمیں زندہ رہنا ہے، اس لئے نہیں کہ ہمیں زندگی دی گئی ہے، بلکہ اس لئے کہ ہم ان آدرشوں کے لئے جدوجہد کرنا ہے، جو فیض صاحب کو اپنی زندگی سے زیادہ عزیز تھے وہ آدرش جو انسانی زندگی اور محبت سے متفق ہیں

اس بین الاقوامی شاعر اور عظیم انسان کی یاد میں پاکستان اور ہندوستان کے ٹیلیویژنوں اور ریڈیو نے متعدد پروگرام کئے ۲۰ نومبر کی رات کو انڈیا ٹی وی نے چالیس منٹ کا ایک خوبصورت پروگرام کیا جب کہ پاکستان ٹیلی ویژن نے بہت سوچ و بچار کرنے کے بعد ۲۳ نومبر کی رات کو ایک تعزیتی پروگرام پیش کیا۔ یہ پروگرام کیسے تھے ان کی خوبیوں اور خامیوں میں جائے بغیر میں دونوں ٹیلیویژنوں کے پروگرام پیش کر رہا ہوں جو میں نے ریکارڈ کئے تھے۔

پہلے میں انڈیا ٹیلی ویژن پر ہونے والا تعزیتی پروگرام پیش کرتا ہوں جس کے کمپیئر جامعہ ملیہ دہلی کے اردو کے پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ تھے

گوپی چند نارنگ فیض صاحب کی شاعری پوری دنیا کے دل پر ہاتھ رکھتی ہے اور انسانیت کے دل کو اپنے ہاتھ میں لیتی ہے۔ ان کی پیدائش سیالکوٹ میں ہوئی اور لاہور میں تعلیم پانے کے بعد انھوں نے اپنی ملازمت کا آغاز انگریزی پڑھانے سے کیا امرتسر کے کالج میں کچھ مدت پڑھانے کے بعد وہ لاہور آگئے جہاں وہ پڑھاتے بھی رہے اور ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں حصہ بھی لیتے رہے آزادی سے تقریباً چھ مہینے پہلے وہ پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر مقرر ہوئے لیکن تین برس کے اندر اندر راولپنڈی سازش کیس کے نام سے مشہور مقدمے میں گرفتار کر لئے گئے انھوں نے چار برس جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارے نقشِ فریادی کے بعد ان کا دوسرا مجموعہ دستِ صبا اسی زمانے میں شائع ہوا پھر "زنداں نامہ"۔ پھر بہت سی دوسری نظمیں سامنے آئیں۔ ان دو مجموعوں کے سامنے فیض صاحب کی شہرت آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگی۔ فیض صاحب کی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز آئے، ایک دور، دوسرا دور، پھر اور تبدیلیاں پھر ایک وقت ایسا آیا کہ وہ ملک سے باہر چلے گئے اور بیروت میں افرو ایشین رائٹرز کے رسالے لوٹس (LOTUS) کے ایڈیٹر ہو گئے لیکن زمانہ بھی انتشار کا تھا اور جب جنگی حملوں کی وجہ سے بیروت برباد ہو گیا تو فیض وہاں سے واپس چلے گئے اور ابھی ان کا انتقال جیسا کہ میں نے کہا کل لاہور ہی میں ہوا ہندوستان میں بھی ان کے چاہنے والوں کا ایک بڑا وسیع حلقہ ہے ان کی موت کی خبر سن کر یہاں دکھ کی لہر دوڑ گئی۔ آج صبح دلی کے بہت سے ادیبوں، دانشوروں، آرٹسٹوں فیض صاحب کے ملنے والوں، ان کے چاہنے والوں سے اور ان لوگوں سے بات چیت کی ہے جنہوں نے اپنا بہت سا وقت فیض احمد فیض کے ساتھ گزارا تھا۔ ہم اس بات چیت کے کچھ حصے آپ کو دکھا رہے ہیں۔

فلور منیجر: ڈاکٹر ملک راج آنند صاحب آپ تو فیض صاحب کو سب سے





پہلے جاننے والے ہیں۔ جواہر لال نہرو اور فیض کے درمیان آپ کڑی بھی تھے۔

ڈاکٹر ملک راج آنند جی ہاں، فیض صاحب سے میری پہلی ملاقات کوئی ۱۹۳۹ء میں امرتسر میں ہوئی جب وہ ایم اے او کالج میں پڑھاتے تھے ان کے دوست محمد دین تاثیر ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر ان دنوں اسی کالج کے پرنسپل تھے اسی دور میں ہم نے پروگریسو رائٹرز کی تحریک چلائی تھی اس تنظیم کے پہلے پانچ ارکان میں فیض بھی تھے جنگ کے بعد ہم ملتے رہے اور ہماری دوستی قائم رہی۔ ان کی کتابوں کے ترجمے انٹرنیشنل فورم پر ہوتے تھے انہی دنوں دنیا بھر میں ان کا کلام مقبول ہوا۔ اسی دور میں یعنی آزادی کے بعد ہم نے کوشش کی کہ دنیا بھر کے ترقی پسند دانشوروں کو ہندوستان میں اکٹھا کیا جائے جواہر لال جی نے مجھ سے کہا کہ آپ پھر ایک کانفرنس آرگنائز کریں جو دہلی میں ہو۔ جواہر لال جی نے اس کانفرنس میں مدعو کرنے کے لئے پہلا نام جو لیا وہ فیض احمد فیض کا تھا۔ جواہر لال جی نے کہا کہ انہوں نے فیض احمد فیض کی شاعری پڑھی ہے اور فیض نے جیل میں جو شاعری کی ہے اس میں انہوں نے وہی بات کہی ہے جو میں نے کہنے کی کوشش کی تھی جیل میں۔ خیر تو ایشین رائٹرز کانفرنس کے بعد ہم نے تاشقند میں ایک افریشیائی رائٹرز کی کانفرنس کی فیض صاحب اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر اس کانفرنس میں آئے تھے فیض نے بس اس تحریک کو پکڑ لیا اور ہمارے ساتھ مل گئے اور یہ تحریک پھر انہوں نے بعد میں پوری دنیا میں چلائی پہلے ہم تھے، سجاد ظہیر تھے میرے ساتھ، ڈاکٹر وچل تھے۔ بعد میں فیض اور سجاد ظہیر نے دنیا بھر میں یہ تحریک چلائی۔ میرا خیال ہے کہ فیض کی شاعری کے دو اہم جزو تھے ایک ان کی romance (رومانس) (زندگی) اور دوسرا ان کی بلند حوصلگی (courage) اور بلند حوصلگی نے مل کر فیض کو بنایا ہے وہ ان دونوں کا مجموعہ تھے۔

اس طرح وہ پاکستان، ہندوستان اور تمام خطوں کے شاعر ہو جاتے ہیں، نمائندے بن جاتے ہیں، کائناتی سچائی بن جاتے ہیں ان کے دنیا سے اٹھ جانے سے مجھے اپنی زندگی پر شک ہونے لگا ہے اس طرح کہ وہ ہم سے جھوٹے تھے ان کی یاد ہمیشہ زندہ رہے گی ہماری کوشش رہے گی کہ جہاں تک ہو سکے ہم ان کے آدرش، ان کے خیالات اور ان کی فکر نوجوانوں کو دے دیں۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ گجرال صاحب، فیض کی شاعری میں ایسی کیا خوبی تھی جو سب کو اپیل کرتی ہے؟

اندر کمار گجرال (سابق سفیر متعینہ روس) فیض صاحب کے انتقال کا مجھے ذاتی طور پر بڑا رنج اور دکھ ہوا ہے۔ ہمارے رشتے اس وقت قائم ہوئے تھے جب میں لاہور میں پڑھتا تھا میں یونیورسٹی کے آخری سال میں تھا جب وہ پروفیسر ہو کر لاہور آئے تھے۔ انگریزی پڑھاتے تھے ہم سے زیادہ بڑے نہیں تھے بلکہ ان کے ساتھ کئی چیزوں میں ہمارا ساجھا تھا۔ اس لئے ان سے وہ رشتہ قائم ہو گیا جو ساری زندگی نبھا۔ ان کی شاعری کا حسن اس نوجوان طبقے کے من پر مہر لگا گیا جو اس زمانے میں آزادی کی جنگ لڑ رہا تھا۔ انگریز کا راج تھا، سختی کا زمانہ تھا، انگریز کے خلاف لڑائی زوروں پر تھی، ہم لوگ جو اپنے آپ کو ریڈیکل کہتے تھے، بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس جدوجہد میں مصروف تھے۔ یہ آورش ہمیں فیض نے دیا تھا۔ فیض پڑھاتے تھے لیکن پڑھانے کے ساتھ ساتھ وہ اس جنگ میں، اس جدوجہد میں پوری طرح شریک تھے۔ اسی زمانے میں انہوں نے ایک نظم کہی "مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ" ان کی یہ نظم اس وقت کی انقلابی صفوں میں ایک ترانہ سی گئی تھی خصوصاً درمیانے طبقے کے جدوجہد کرنے والے لوگوں کی امنگوں کی ترجمانی کرتی تھی یہ نظم۔ میں جب وہ جیل میں رہے۔ پھانسی کی کوٹھری میں تھے۔ لگتا تھا کہ اس دور کے حاکم ان کی جاں بخشی نہیں کریں گے فیض نے جیل میں لکھا اور یہ زمانہ ان کی پختگی میں ایک نیا موڑ تھا۔ جب میں نے ان کے انتقال کی خبر سنی تو اچانک ان کا یہ شعر میری زبان پر آگیا کہ ؎

مرے چارہ گر کو نوید ہو، صفِ دشمناں کو خبر کرو
وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب ہم نے چکا دیا

وہ تو اپنا حساب چکا کر چلے گئے لیکن ہمیں دکھ اور کرب میں مبتلا کر گئے ہمارے رشتے بڑے مضبوط تھے ایک دفعہ وہ دہلی آئے تو اس وقت پاکستان میں تبدیلی آ چکی تھی میں کہ جب کچھ دنوں کے لئے وہاں جمہوری نظام تھا تو فیض صاحب بہت کھلے ہوئے تھے اس وقت۔ میں یہاں سرکار میں تھا وہ ثقافتی رشتوں کے ساتھ ساتھ انسانی رشتوں کو بحال کرنا چاہتے تھے۔ فیض صاحب حدود کی تقسیم سے بلند ہو کر سوچتے تھے ہمیشہ۔ ماسکو میں جب ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے پوچھا "تا یئے کیا حال ہے؟" انہوں نے اپنی غزل کا وہ شعر سنایا جو ان کے اور میرے خیالات کی ترجمانی کرتے تھے کہ ؎

ستم سکھلائے گا رسمِ وفا ایسے نہیں ہوتا
صنم دکھلائیں گے راہِ خدا ایسے نہیں ہوتا

شبیلا بھاٹیہ سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے شروع کروں کل شام فیض صاحب کے انتقال کی خبر آئی تو ریہرسل میں تھی۔ آج کا منصوبہ یہ تھا کہ ڈرامہ "دیے پاؤں" کی ریہرسل ہم دوبارہ شروع کریں گے اس لئے جنوری میں فیض یہاں آنے والے تھے اور جنوری کے پہلے ہفتے میں اس کو لکھنؤ میں پروگرام (performance) کرنا تھا فیض صاحب جب ہندوستان آتے تھے لوگ ایسے پھولوں کی طرح ایک جگہ سے اٹھ کر دوسری جگہ دوسری سے تیسری جگہ لے جاتے جب وہ ہم سے ملنے کی چاہ کرتے تو ہمارے گھر رات کے بارہ بجے کے بعد آتے تھے اور رات رات ان کی شاعری ہوتی ان سے باتیں ہوتی تھیں، محبت کی، پیار کی، انسان کی یہ سب جانتے ہوتے اور دیکھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ ان کی شاعری پر میں ایک کھیل لکھوں ان کی شاعری پڑھنا شروع کی۔ ان کی شاعری سے میں نے اردو سیکھی۔ یہ میری خوش قسمتی ہے

کہ جب میں یہ سکرپٹ تیار کر رہی تھی تو فیض صاحب یہاں تھے، میں نے بار بار اس کا تذکرہ بتایا اور ان سے باتیں کیں اس پر انہوں نے کئی بار کہا کہ "یار میں کئی ملکوں میں گیا ہوں اور میں نے بڑے بڑے پوئٹری سمپوزیم دیکھے ہیں لیکن جس طرح تم نے اسے لکھا ہے، وہ بہت ہی اچھی چیز ہے۔" مجھے اب بھی اُن کی آواز سنائی دے رہی ہے اس کمرے میں بیٹھ کر انہوں نے یہ کہا تھا ہماری بھی تمنا تھی کہ ایک دن جب وہ آئیں یہاں پر تو ہم ان کو دکھائیں اور جب کہ جو ریہرسل ہم نے شروع کی تو اس کو سامنے رکھا تھا کیونکہ دس پندرہ روز پہلے ان کا خط آیا تھا۔ جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ وہ جنوری میں یہاں آ رہے ہیں۔

پروفیسر علی اشرف | فیض احمد فیض اردو کے عظیم ترقی پسند شاعر تھے وہ ایسے شاعر تھے جو ہندوستان اور پاکستان دونوں میں مقبول تھے میرا خیال ہے کہ آزادی کے بعد انقلابی شعرا میں جوش اور فیض سب سے آگے تھے یہ دونوں عظیم ترقی پسند شاعر ہم سے جدا ہو چکے ہیں یہ کسی ایک ملک کے نہیں بلکہ برصغیر اور دنیا کے مقبول ترین شاعر تھے فیض کی سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان کے کلام میں انسانیت کی آواز بلند ہوتی رہتی تھی آزادی کی آواز بلند ہوتی رہتی تھی فیض نے اپنی سیاسی حدود کو نظر انداز کر کے عالمگیر اقدار کی رہنمائی کی اور رہبری کی فیض تیسری دنیا کے علمبرداروں میں سے تھے برصغیر اور پوری دنیا میں جہاں جہاں اردو زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ فیض ہمیشہ زندہ رہیں گے پروفیسر نارنگ آپ کو یاد ہو گا کہ ابھی جب آپ لندن سے تشریف لائے تھے تو ہم لوگوں نے منصوبہ بنایا تھا کہ فیض صاحب کو جامعہ ملیہ میں وزٹنگ پروفیسر بننے کی دعوت دی جائے لیکن افسوس کہ ہمارا یہ منصوبہ دھرا ہی رہ گیا، ہمارا خواب پورا نہ ہو سکا۔ مجھے صدمہ ہے کہ ہم ایک بڑے موقع سے محروم رہ گئے۔ مجھے امید ہے کہ فیض کے کلام سے متاثر ہو کر اور اس سے تحریک لے کر ہم ان اقدار کو قائم رکھنے کی کوشش کریں گے جو انہوں نے اپنے شعروں اور اپنی صحافت کے ذریعے پیش کی تھیں ہم ان اقدار کو زندہ رکھنے کی کوشش کریں گے۔

پروفیسر کرتار سنگھ دگل | فیض سے میری ملاقات ۱۹۳۹ء سے ہے۔ جب میں لاہور میں پڑھتا تھا اور وہ ایم اے او کالج امرتسر میں پڑھاتے تھے ہم لوگ انہیں ملنے کے لیے امرتسر جایا کرتے تھے اس کے بعد وہ لاہور آ گئے اور لاہور میں ان سے ہماری ملاقاتیں بڑھتی گئیں۔ میرے ڈراموں کے پہلے مجموعے کا دیباچہ فیض صاحب نے لکھا تھا وہ بہت کم گو تھے انہوں نے لکھا بھی کم لیکن جو کچھ لکھا ہے وہ بہت بڑھیا ہے، اس کی حیثیت اردو کے کلاسکس کی ہے۔ ان کی کم گوئی کا ایک واقعہ مجھے یاد آتا ہے یہ ۱۹۶۶ء کی بات ہے میں ماسکو میں تھا۔ ماسکو سے باہر گھوم رہا تھا جس روز میں واپس ماسکو پہنچا تو مجھے ہماری مشترکہ دوست مریم سلگانیک نے بتایا کہ فیض تمہاری غیر موجودگی میں آئے تھے اور جب انہیں پتہ چلا کہ تم واپس آ رہے ہو تو انہوں نے اپنی فلائٹ منسوخ کرا دی اب وہ کل وطن واپس جائیں گے۔



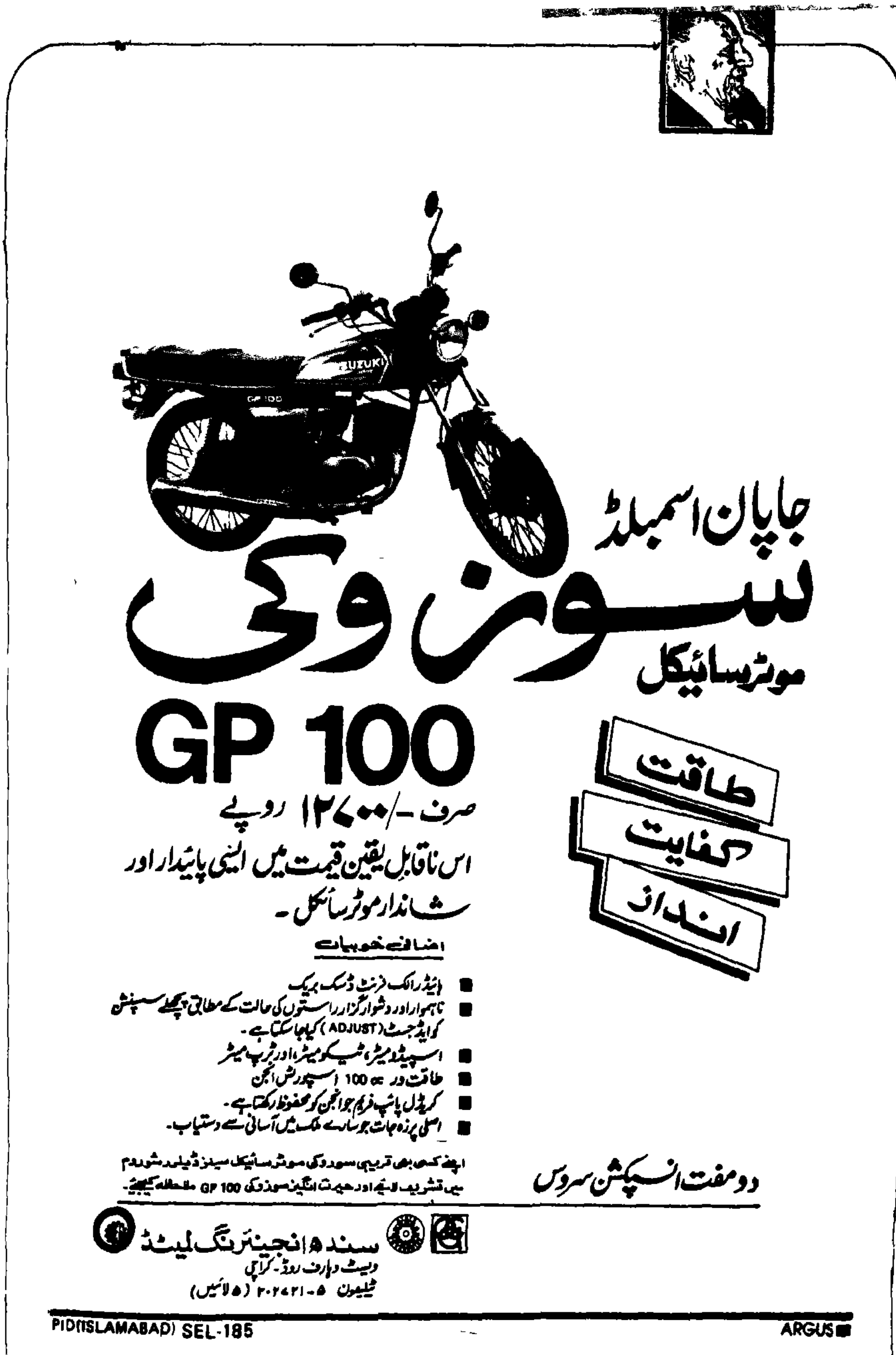
چنانچہ تم شام کو ہمارے ساتھ کھانا کھا رہے ہو، میں شام کو وہاں گیا۔ فیض سے ملاقات ہوئی ہم ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد مل رہے تھے ان کی آنکھوں میں آنسو تھے وہ دعوت میں سارا وقت میرے ہاتھ پکڑے بیٹھے رہے اور ہم نے آپس میں کوئی بات نہیں کی میں سوچ رہا تھا کہ جب محفل ختم ہو گی تو فیض بات کریں گے۔ محفل رات کو کوئی دو بجے ختم ہوئی۔ میں اپنے ہوٹل جانا تھا فیض نے بس اتنا کہا، "میں تمہیں اتار دوں گا" میرا خیال تھا کہ کار میں کوئی بات کریں گے مگر وہ میرا ہاتھ پکڑے خاموش بیٹھے رہے اب ہوٹل پہنچا تو کار سے اترا۔ فیض نے گلے لگایا ہاتھ ملایا اور چلے گئے انہوں نے کوئی بھی تو بات نہیں کی مجھ سے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ | فیض کا جیل کے زمانے کا مشہور قطعہ ہے

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو پھر کیا ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

یہ وہ عزم تھا جس نے زبانوں کے دائرے توڑ دیئے۔ کم سے کم برصغیر میں یہاں میرے ساتھ سٹوڈیو میں ہندی کے مشہور ادیب اور دانشور پروفیسر نامور سنگھ تشریف رکھتے ہیں اور ان سے ہم بات چیت کریں گے چونکہ فیض ہندی والوں میں بھی اتنے ہی مقبول تھے۔ ان کے ساتھ یہاں تشریف رکھتے ہیں پروفیسر ممتاز حسین جو پاکستان کے مشہور دانشور اور نقاد ہیں اور آج کل دہلی تشریف لائے ہوئے ہیں تو پروفیسر نامور سنگھ ہم کیوں نہ آپ سے بات چیت کا آغاز کریں۔ فیض کے تو سارے مجموعے ہندی میں بھی چھپ کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں فیض کی شاعری میں وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے ان کی اپیل تمام طبقوں کے تمام لوگوں کے دلوں میں اتر جاتی ہے۔

پروفیسر نامور سنگھ | ہندی ہی کیوں ہم تو یہ مانتے ہیں کہ فیض صرف اردو اور پاکستان ہی کے شاعر نہ تھے بلکہ پوری دنیا کی آزادی کی جدوجہد، ترقی پسند اور انقلابی آہنگ کے اہم ترین شاعر تھے خاص طور سے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ جسے ہم تیسری دنیا کہتے ہیں وہ تیسری دنیا کے عوام کے شاعر تھے ان کا نام اسی طرح لیا جاتا ہے تیسری دنیا میں جس طرح ناظم حکمت اور پابلو نرودا کا نام لیا جاتا ہے میرا خیال ہے کہ اردو شاعروں میں اقبال کے بعد غالباً فیض ہی کو یہ درجہ حاصل ہوا ہے فیض کی زندگی اگر انسانی حقوق کے لئے جدوجہد کی علامت ہے، گیت ہے تو ان کی شاعری اس جدوجہد کا سنگیت ہے۔ اسی لئے چاہے ہندی کے ہوں یا بھارت کی دوسری زبانوں کے لوگ ہوں، فیض کی شاعری میں اپنے دل کی دھڑکن سنتے ہیں ہم سمجھتے ہیں کہ فیض کی شاعری میں قفس یا دار و رسن صرف ایک علامت نہیں بلکہ حقیقت ہے اور ایسی حقیقت اس شاعری کو جنم دیتی ہے۔ جس میں نکھرا پن ابھرتا ہے، سچائی


جاپان اسمبلڈ
سوزوکی
موٹرسائیکل
GP 100
صرف -/12700 روپے
اس ناقابلِ یقین قیمت میں ایسی پائیدار اور شاندار موٹرسائکل۔
طاقت
کفایت
انداز
اضافی خوبیاں
■ ہائیڈرالک فرنٹ ڈسک بریک
■ ناہموار اور دشوار گزار راستوں کی حالت کے مطابق پچھلے سسپنشن کو ایڈجسٹ (ADJUST) کیا جا سکتا ہے۔
■ اسپیڈومیٹر، ٹیکومیٹر، اور ٹرپ میٹر
■ طاقت ور 100 cc اسپورٹس انجن
■ کریڈل پائپ فریم جو انجن کو محفوظ رکھتا ہے۔
■ اصلی پرزہ جات جو سارے ملک میں آسانی سے دستیاب۔
اپنے کسی بھی قریبی سوزوکی موٹرسائیکل سیلز ڈیلر شوروم میں تشریف لائیے اور حیرت انگیز سوزوکی GP 100 ملاحظہ کیجئے۔
دو مفت انسپکشن سروس
سندھ انجینئرنگ لمیٹڈ
ویسٹ وہارف روڈ۔ کراچی
ٹیلیفون ۵-۲۰۲۷۲۱ (۵ لائنیں)
PID(ISLAMABAD) SEL-185
ARGUS



ہوتی ہے، ایمانداری ہوتی ہے۔ ان کی شاعری میں یہ سب کچھ ہے، ان کی شاعری میں انسانیت کا درد ہے، اور یہ وہ چیز ہے جو ہر دل کو قریب ہے اور عام قاری نہیں بلکہ سب سے نیا شاعر بھی فیض کو اپنے دل کے قریب سے پاتا ہے۔

پروفیسر نارنگ | ایک جگہ انہوں نے کہا کہ

ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

ممتاز صاحب، یہ جو امنگ ہے، جو ذہن ہے فیض صاحب کا، جو ساخت ہے ان کے ذہن کی اور ان کی فکر کی، سوچ کی، یعنی جو کوالٹی آف مائنڈ ہے اُن کی شاعری سے جو انساں ابھر رہا ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسی آواز ہے اس اعلیٰ درجہ کا ذہن ہے جو کئی صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ان سے آپ کا ساتھ بہت پرانا رہا ہے آپ ترقی پسند تحریک میں ان کے ساتھ رہے ہیں کچھ ان کی فکر کے بارے میں بتائیں گے؟

پروفیسر ممتاز حسین | جی ہاں بالکل صحیح کہا آپ نے کہ ان کی فکر درحقیقت عالمی تحریک ہے، ترقی پسندی کی۔ ان کی فکر ایک نئے سماج کی تشکیل سے تعلق رکھتی ہے ایک ایسا سماج جس میں آزادی ہو، مساوات ہو، بھائی چارگی ہو اور جس میں ذات پات اور دولت کی تقسیم نہ ہو تو یہ فکر ان کی شاعری کا سنگ بنیاد ہے اور فیض اس خواب کے ساتھ رہے ہیں جو خواب یہاں کے ادیبوں نے نہ صرف ۱۹۳۶ء میں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے پہلے بھی دیکھا تھا یہ خواب غالب نے دیکھا ہے، اقبال نے دیکھا ہے، رومی نے دیکھا ہے اور ہند کے بہت سے دوسری زبانوں کے شاعروں نے بھی دیکھا ہے تو یہ شاعری ان کی انقلابی بھی ہے اور عشق و محبت کی شاعری بھی ہے۔ فیض نے اپنی ایک نظم "دو عشق" میں اس چیز کو واضح کیا ہے کہ ان کا عشق محبوب کے عشق سے مختلف نہیں ہے وہ اس زندگی میں محبت اور چاہت دیکھنا چاہتے تھے وہ غربت و افلاس کو بدصورتی سے تعبیر کرتے تھے اور حقیقت یہی ہے کہ یہ تہذیب تنگی دیتی ہے کہ معاشرے میں کچھ لوگ خوش حال ہوں، اور کچھ لوگ بدنصیب، سڑکوں پر سونے والے ہوں فیض نے ایک تہذیبی قوت کی حیثیت سے سفر کیے اور ہمارے ایسے جدید بات کی ترجمانی کی جو اس زمانے کی جو ہماری نوجوان کا رہا، ہمارا نسل کے نوجوانوں کے جذبات تھے

پروفیسر نارنگ | ممتاز صاحب آپ نے ابھی دو عشق اور سدا کی بات کہی تھی۔ پروفیسر نامور سنگھ صاحب اس آواز کی گونج فیض کی ساری شاعری میں ملتی ہے لیکن عشق و محبت اور پیار کے لہجے میں سماج کے درد کو اور انسان کے درد کو سمو دیا۔ تو یہ چیز ہر شاعر کے ہاں تو نہیں ملتی۔

پروفیسر نامور سنگھ | یہی نہیں بلکہ ان کی خاموشی بھی گویا ہے اور وہ خاموش رہ کر بھی بولتے ہیں ہے

پروفیسر نارنگ | اور ممتاز صاحب اگر بات آپ فرما رہے تھے کہ ان کے ہاں جو علامت ہے جو روایت ہے، تو انہوں نے غزل کی روایت سے جو قفس ہے، باغباں ہے اور منصور کی تلمیح ہے ان سب چیزوں میں انہوں نے جس طرح آج کے انسان کو اور آج کے چیلنجوں کو جس طرح شاعری میں سمویا ہے اس کے بارے میں آپ کچھ کہیں گے؟

پروفیسر ممتاز حسین | انہیں تو دورِ حاضر کا آخری شاعر کہنا چاہیئے جدید شاعروں میں ان کا نام سب سے ممتاز گنا جاتا ہے۔ اس معنی کہ انہوں نے پرانی تلمیحات استعاروں کو نئے معنی دیئے صیاد، قفس کو جن معنوں میں استعمال کیا، ان کی طرف جو اشارے کئے وہ سب جانتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دلوں میں اترنے والی کیفیت ان کی شاعری میں ہے وہ کچھ عروض کے استعمال سے نہیں بلکہ اس رجائیت کے باوجود جو ناقابل شکست ہے ان کی شاعری میں ایک احساس، اور ہمدردی ملتی ہے

پروفیسر نارنگ

بزمِ خیال میں تیرے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

تو درد کا چاند تو حضرات بجھ گیا لیکن اس کی چاندنی ہمیشہ باقی رہے گی جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ ہندوستان میں فیض کے چاہنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہے آج شام ہی ہمیں کچھ ریکارڈنگ ملی ہے بمبئی کے ادیبوں کی، اور شاعروں کے تاثرات پر جو مبنی ہے تو بمبئی کے ادیبوں اور شاعروں کے تاثرات کے چند حصے ہم بھی آپ کو دکھا رہے ہیں

عصمت چغتائی | آج چاروں طرف کیا ہو رہا ہے۔ موت کو کس نے چھوٹ دے دی میں بہت پریشان ہوں، میرا دل ڈوب رہا ہے۔ فیض کو ۱۹۳۶ء سے جانتی تھی میں ان کے شعر سنتے تھے۔ جہاں سے ان کے شعر نکل کر ہم تک پہنچے تھے ان کا پہلا شعر جس نے مجھے متاثر کیا تھا، یہ ہے کہ

ہم کہ تاریک راہوں میں مارے گئے
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے

یہ شعر ہمیں انقلابی ہے یا ایک عاشق مزاج انسان کے دل کی پکار ہے اور فیض نے کہا کہ لوگوں نے مجھے انقلابی شاعر کیوں بنا دیا ہے۔ مجھے انقلابی کیسے بنا دیا میں تو پیار اور محبت کا شاعر ہوں میں نے کہا کہ پیار بھی تو ایک بہت بڑا انقلاب ہوتا ہے پیار کے لئے لڑنا بھی تو ان کے حقوق کے لئے لڑنا ہے میں نے کہا فیض تمہارا فیض ہر موڑ پر ملتا ہے کتنا پیارا آدمی تھا، ابھی پچھلی دفعہ میری آخری ملاقات جو اس سے ہوئی کلکتہ میں، سردار جعفری اور فیض مجھے ہم تینوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑا، ہم تینوں قریب قریب ہم عمر تھے سردار جعفری ہم میں سب سے چھوٹے تھے اور تھوڑے سے فیض ہم سے



بڑے تھے میں نے کہا کہ ہم ایک ہی عمر کے ہیں، آج ہم قسم کھاتے ہیں، وعدہ کرتے ہیں کہ ہم ۹۸ (اٹھانوے) برس تک جیئیں گے تم دونوں بھی وعدہ کرو۔ تو دونوں نے کہا ہاں ہم دونوں کا ارادہ ہے کہ ہم ۹۸ برس کی عمر تک جیئیں گے۔ تو فیض کہنے لگا "ارے دو برس کیوں چھوڑتی ہو، پوری سنچری کر دو نا" اور میں نے کہا "دیئے ہم نے آپ کو اور دو سال" مذاق کی بات تھی خیال بھی نہیں تھا کہ فیض اتنی وعدہ خلافی کریں گے اور اس طرح بے ایمانی کریں گے کہ وعدہ کر کے ہم لوگوں کو چھوڑ کر چلے گئے۔

خواجہ احمد عباس

فیض احمد فیض نہ صرف ہندوستان کے بلکہ اس تمام برصغیر کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ آج کل کے زمانے میں جو زندہ شاعر ہیں ان میں سب سے بڑے تھے جوش اور فراق کا جانا ہی کچھ کم نہیں تھا کہ غم کا تکلیف کا ایک اور پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ غم اور تکلیف ابھی کم نہیں ہوئی تھی کہ فیض کی موت کا پتہ چلا وہ ترقی پسند تحریک سے شروع ہی سے وابستہ تھے۔ وہ بڑے رجائیت پسند اور پر امید شاعر تھے ہمیشہ تصویر کا روشن رخ دیکھتے تھے ایسے شاعر کو پڑھیں تو ہم یاس اور ماتم کے نہیں رہیں گے۔ بلکہ کچھ کرنے کی کچھ جینے کی دنیا کو کچھ اور بدلنے کی اس قسم کی اور انقلابی حرکتیں جو ہیں وہ ہم میں خود کر آئیں گی۔

مجروح سلطانپوری

یہ مہینہ ہمارے لئے غموں کا مہینہ ہے سیاست کی دنیا میں پہلے ہم نے اپنی رہبر اعظم کو کھویا ان کا جنازہ اٹھایا اس کے بعد طوفان کا رخ ہوا ادب کی طرف۔ تو بہت بڑا ستون گرا ادب کا۔ راجندر سنگھ بیدی، ان کا جنازہ اٹھایا۔ کل ہمارے بہت بڑے شاعر فیض احمد فیض بھی گئے۔ اب یہ تیسرا جنازہ اٹھانا پڑ رہا ہے۔ فیض ہمارے درمیان میں سے نہیں گئے بلکہ یوں کہئے کہ ایک پورا عہد، ایک پورا زمانہ گیا ہے شاعری کا۔ ہماری اردو شاعری میں چار بڑے شاعر ہیں میرؔ، غالبؔ، انیسؔ اور اقبالؔ، ان چاروں میں میر کا جو رویہ ہے کہ وہ فلسفہ ہو یا سماجی مسئلہ ہو اس کو وہ جذبہ بنا دیتے تھے۔ یہ بڑا مشکل کام ہے۔ فیض بھی ہم ترقی پسندوں میں کچھ اسی نہج کے تھے وہ ہمیشہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دماغوں سے بات نہیں کر رہے، دل سے بات کر رہے ہیں وہ انقلابی شاعر تھے مگر ان کے ہاں انقلابی گھن گرج نہیں تھی۔ ان کی شاعری میں ان کی گفتگو میں دل دھڑکتا تھا اور وہ دلوں سے گفتگو کرتے تھے۔ اپنی محبوبہ ہو ان کی یا کوئی شخص، ان کا مفہوم ہمیشہ دکھی انسان ہوا ہے گویا وہ خود اور خود ان کی محبوبہ دونوں سمبل یا علامت ہیں اس دکھی سماج یا دکھی انسان کی یا انسانیت کی۔ چنانچہ عام طور پر وہ اپنی نظموں میں اپنی محبوبہ سے خطاب کرتے ہیں گویا ان کا لہجہ لیڈرانہ نہیں ہے۔ بلکہ عاشقانہ ہے انہوں نے کہا کہ ؎

غم جہاں ہو، رخ یار ہو یا دست عدو
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا

گویا ان کا طرز جو تھا وہ نہ تھا کہ وہ اپنی دکھی مخلوق کے لیے لیڈر نہیں تھے بلکہ رفیق تھے۔ وہ عاشق تھے اور یہی چیز ان کو تمام شعراء میں ممتاز کرتی ہے۔ مجھے کہنے دیجئے کہ ہم ترقی پسند شاعروں میں فیض احمد فیض ہمارا سب سے بڑا شاعر ترقی پسندوں کا نہیں گیا۔ بلکہ ترقی پسندوں کا میر تقی میر چلا گیا ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ

اس دوران فیض صاحب کئی بار ہندوستان سے گزرے۔ یہاں ان کی ستر سالہ سالگرہ بھی بڑے پیمانے پر منائی گئی۔ کوئی سات آٹھ برس پہلے دہلی دوردرشن کے لئے ان کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا گیا تھا، اس میں انہوں نے نظریۂ شاعری کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا تھا۔ اب آخر میں ایک بار پھر فیض صاحب کی آواز میں انہی کے خیالات سنئے۔

فیض احمد فیض

۔۔ یہی کہنا ہے کہ جب اس وقت کے معنی ہوتے ہیں وہ شاعر جس کی کوئی اہمیت ہے تو وہ جو کچھ بھی کہتا ہے، اس میں روایت کا پہلو اور روایت کا رشتہ ناگزیر ہے کیونکہ اگر ایسا نہیں ہے تو معاف کیجئے کہ وہ ایک بہت ہی محدود اور بہت ہی چھوٹے پیمانے کو استعمال کر رہا ہے اور اس پیمانے میں جو وسعتیں ہیں جو کہ بزرگ چھوڑ گئے ہیں ان کو وہ کام میں نہیں لا رہا ہے تو یہ ایک طریقے سے آپ کو محدود کرنے کی اور اپنے ذریعۂ اظہار سے گریز کی بات ہے نا۔ یہ تو ایک بات ہے کہ روایت کے تسلسل کی وجہ سے آپ کو نئے تجربات جو آپ کے ہیں، جو سامنے آتے ہیں، ان کا سامنا کرنے کے لئے ان کا اظہار کرنے کے لئے آپ کو بہت سی سہولتیں ملتی ہیں اور اس میں جو گنجائشیں ہیں روایت میں تو وہ کبھی ختم ہونے میں آتی نہیں ہیں۔ اس وجہ سے کہ ان کے اظہار کے اتنے اسالیب ہر عہد میں دوبارہ پیدا ہو سکتے ہیں، ان کے بہت سے پہلو، جو اس وقت لکھی گئی تھیں، آجاگر نہیں تھے تو آج کل کے زمانے میں اس کے نئے معنی ابھرے ہیں اس سے نئے پہلو واضح ہوتے ہیں جو کہ اس وقت کے لکھنے والوں کے ذہن میں نہیں تھے۔ اور وہ دوسری بات ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ زندگی کی طرح شاعری بھی جو ہے، وہ ایک بہاؤ ہے۔ اس پر آپ روایت کا سد نہیں باندھ سکتے ورنہ تو شاعری کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے

تم آئے ہو نہ شب انتظار گزری ہے

اس غزل کی گائیکی کے ساتھ ہی بھارتی ٹیلیویژن کا فیض صاحب سے متعلق پروگرام ختم ہو گیا۔

قارئین کرام! اب پیش خدمت ہے پاکستان ٹیلی ویژن پر ہونے والے تعزیتی پروگرام کی رپورٹ اس پروگرام میں جناب احمد ندیم قاسمی، میاں ممتاز محمد خان دولتانہ، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، جناب ظہیر کاشمیری، جناب آفتاب احمد خان، جناب علی احمد خان، محترمہ بانو قدسیہ، ممتاز مفتی، جناب علی امام، میاں عارف افتخار، ڈاکٹر ایوب مرزا جناب ظہیر بابر، جناب احمد راہی نے مرحوم فیض احمد فیض کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس پروگرام کا آغاز فیض صاحب کی ایک غزل سے ہوا جو انہی کی آواز میں سنائی گئی



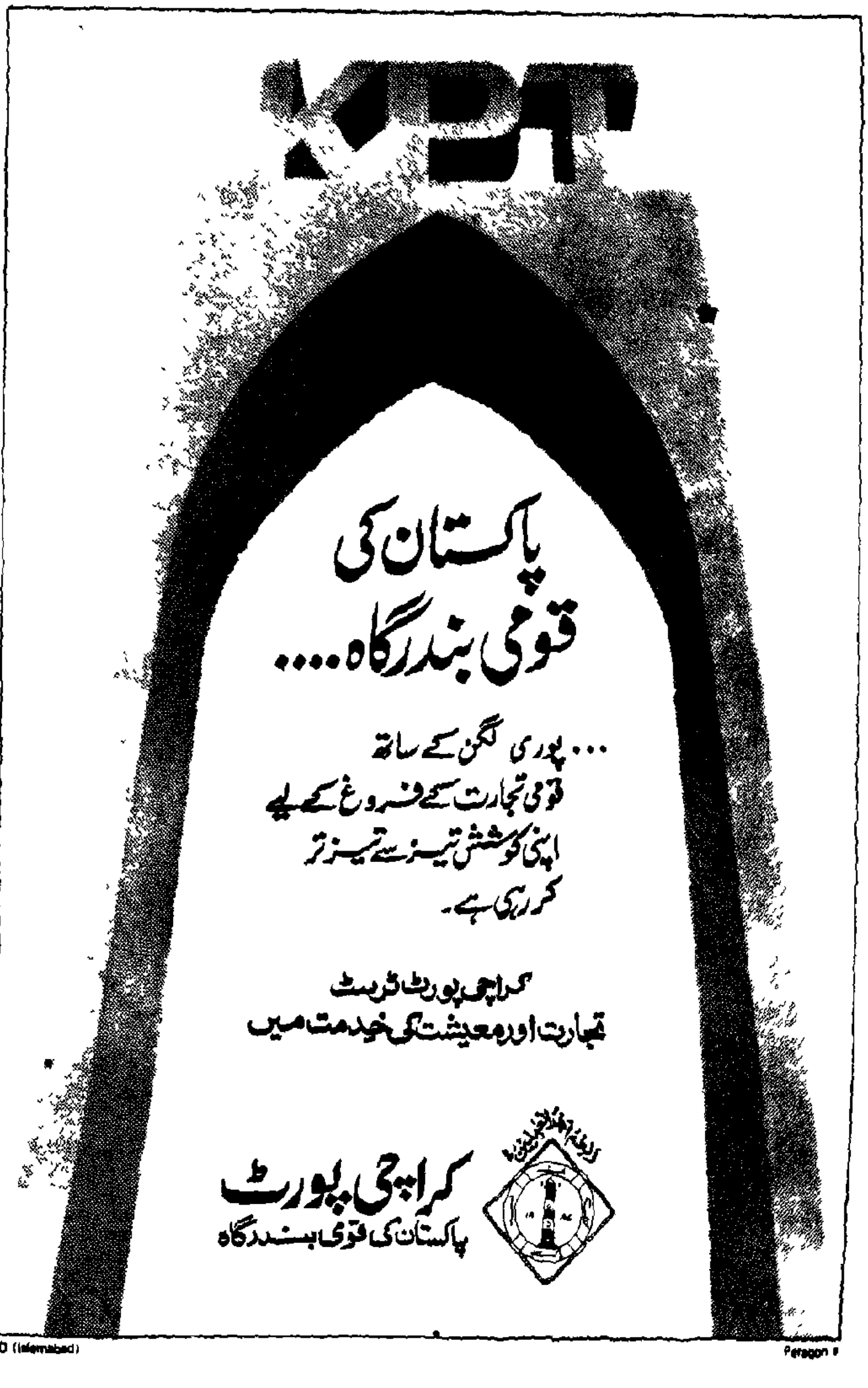


اس کے بعد فیض صاحب کی بچوں کے ساتھ ایک گفتگو سنائی گئی جو غالباً ۱۹۸۳ء میں پاکستان ٹیلی ویژن نے فلم بند کی تھی۔

فیض احمد فیض | بھئی ہم سیالکوٹ کے ایک گاؤں کے رہنے والے ہیں سیالکوٹ کا نام شاید آپ نے سنا ہوگا۔ چھوٹا سا شہر ہے لیکن ہے یہ بہت پرانا اور یہ بہت سی باتوں کے لیے مشہور ہے جب ہم آپ جتنے تھے تو ہمیں اسکول نہیں بھیجا گیا تھا۔ ابا نے کہا تھا کہ پہلے قرآن شریف حفظ کرو یعنی زبانی یاد کرو۔ اس کے بعد مسجد میں جاکر پڑھو۔ اور پھر جب فارسی اور عربی پڑھ لو گے تو اس کے بعد سکول بھیجیں گے۔ تو ہم نے ایک حافظ صاحب سے قرآن شریف حفظ کرنا شروع کیا۔ زبانی یاد کرنا شروع کیا ہمیں سپارے حفظ کئے تھے کہ ہماری آنکھیں آگئیں۔ اس کے بعد ہم نے اپنی اماں سے اردو پڑھی۔ پھر قریب کی مسجد میں مولوی ابراہیم صاحب تھے اردو زبان کا پہلا قاعدہ ان سے ختم کیا جب ہم چوتھی جماعت میں پہنچے تو پھر ہم کو بھیجا گیا اسکول۔ اچھا تو بھئی اس کا قصہ بھی سن لیں۔ اس لئے کہ اب بھی یاد آتا ہے تو مجھے اب بھی گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ ہوا یہ کہ جب پہلے دن ہمیں جانا تھا اسکول تو ہماری بڑی بہنوں نے ہم کو تیار کیا سکول جانے کے لئے مخمل کے کپڑے ہم کو پہنائے گئے سرخ رنگ کی واسکٹ تھی اور ویسی ہی نیکر۔ اور ریشمی موزے اور بہت بڑھیا قسم کے جوتے اور کڑھی ہوئی ٹوپی تو صاحب یہ پہنا کر ہم کو بھیجا گیا سکول ہم نے تو کبھی اسکول دیکھا نہیں تھا ہمیں کیا پتا کہ وہاں کیا تھا اب جب ہم سکول پہنچے تو وہ اسلامیہ سکول تھا پرائمری تک۔ اچھا وہاں پہ جاکر ہم نے دیکھا کہ بے چارے بچے جو ہیں تو کسی کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں کسی کے پاؤں میں جوتا نہیں ہے کسی کے سر پہ ٹوپی نہیں ہے اور جب ہم کلاس میں پہنچے تو سب نے ہماری طرف ایسے دیکھا جیسے کوئی عجیب قسم کا جانور آگیا ہو کلاس میں۔ اس لئے کہ وہ بے چارے سیدھے سادھے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ سب نیچے بیٹھے ہوئے اور فرش پر بیٹھے تھے اس زمانے میں ڈیسک ویسک نہیں ہوا کرتے تھے۔ چھوٹی جماعتوں میں۔ بڑی جماعتوں میں جاکر ڈیسک ملتے تھے اس وقت تو فرش پر ٹاٹ بچھا ہوتا تھا تو وہیں لوگ بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ اور اب ہم نے کہا کہ ہم پہلے فرش پہ کیسے بیٹھیں ٹاٹ پہ ہم کیسے بیٹھیں تو وہاں ہمیں بڑی گھبراہٹ ہوئی۔ اور بچوں نے ہمیں اس طرح دیکھا کچھ مذاق سے، اور کوئی تھوڑے سے غصے سے کہ یہ کون آگیا ہے۔ پھر اگلے دن انہی کی طرح کپڑے پہن کر گیا۔ اس کے بعد پھر ہم نے کبھی ایسے کپڑے نہیں پہنے۔ جیسے لوگ رہتے ہوں نا ویسے ہی رہنا چاہیئے ان سے الگ ہو کر امارت ظاہر کرنے کے لئے یا یہ بتانے کے لئے کہ ہمارے پاس بہت پیسے ہیں، ایسی حرکت نہیں کرنی چاہیئے کہ جسے لوگ دیکھ کر برا مانیں۔ پہلی بار شاعری ہم نے کی جب ہم ساتویں جماعت میں تھے۔ وہ ایسے کہ ہمارے بڑے بھائی مرحوم، جو کہ فوت ہو چکے ہیں، تو ان کے ایک دوست تھے جو بعد میں جج ہو گئے تھے ہائی کورٹ کے مدبر احمد محمود ان کا نام تھا۔ وہ دونوں پڑھتے تھے دسویں جماعت میں اور ہم پڑھتے تھے ساتویں جماعت میں۔ ان مدبر احمد صاحب نے ہم سے ایک روز کہا کہ بھئی تمہیں اردو وردو بہت آتی ہے، کبھی شعر بنایا ہے۔ میں نے کہا کہ جی شعر تو نہیں بنایا۔ کہنے لگے کہ بھئی اب بناؤ، میں نے کہا کہ کیا کروں، کہنے لگے کہ ایک لڑکا پڑھتا ہے ہماری کلاس میں، اس کا نام ہے چھجو رام۔ اس نے ہمیں بڑا تنگ کر رکھا ہے تم اُس کے خلاف ایک نظم بنا دو جس میں کچھ اس قسم کے شعر ہوں کہ اس کا جو سر ہے وہ ہانڈی جیسا ہے، اس کا پیٹ جو ہے، مٹکے جیسا ہے، اس کی ٹانگیں جو ہیں تنکوں جیسی ہیں اور اس کے ہاتھ جو ہیں ایسے ہیں اور آنکھیں جو ہیں ویسی ہیں، ناک ویسی ہے، چنانچہ ہم نے سات آٹھ دس لائنوں کی ایک نظم بنا کر دے دی۔ اچھا تو وہ انہوں نے کلاس میں جاکر پڑھ دی۔ اور وہ سارے سکول میں مشہور ہوگئی۔ پھر ہمیں خیال آیا کہ بھئی وہ چھجو رام جو ہے اس کو بہت برا لگا ہوگا کہ ہم نے اُس کے خلاف اتنی باتیں لکھیں تو اس سے جاکے معافی مانگنی چاہیئے۔ چنانچہ ہم نے جاکے بھائی سے کہا کہ دکھائیں چھجو رام کا چہرہ ہم گئے اس کے پاس اور کہا کہ دیکھو بھئی، ہمیں معاف کر دیجئے۔ ہم تو آپ کو جانتے بھی نہیں تھے ہم نے آپ کے خلاف اتنا کچھ لکھ دیا، وہ کہنے لگے واہ جی واہ ہم تو بہت خوش ہیں ہم تو آپ کی وجہ سے پورے سکول میں مشہور ہو گئے۔ تو معافی کیوں مانگتے ہو ہم تو بہت خوش ہیں آپ سے۔ تو بس اس طریقے سے ہم نے شعر کہنے شروع کئے بہت زمانے کے بعد

احمد ندیم قاسمی | فیض صاحب کی شخصیت کے اتنے پہلو ہیں اتنے جہات اور اتنے خوبصورت کہ ان کو چند الفاظ میں بیان کرنا میرے لئے بہت دشوار مرحلہ ہے میں ان کی شخصیت کے صرف دو ایک پہلوؤں پہ بات کروں گا میں نے چھ سات برس تک ان کے ساتھ کام کیا ہے اس کے علاوہ بے شمار مشاعروں میں ہم سفر رہے بیرون ملک بھی گئے تو اکٹھے تھے، اس تمام دوران میں نے دیکھا کہ فیض صاحب کو کسی بات پر غصہ ہی نہیں آتا وہ بڑی سی بڑی بات کو اسی خاموشی کے ساتھ، چہرے پہ کوئی تیوری لائے بغیر پی جاتے تھے کہ جیسے کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں کوئی حادثہ گزرا نہیں۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے کہ جو ان کے فن میں بھی منعکس ہوتی ہے اس لئے ان کے فن میں ندرت ہے، توانائی ہے، صلابت ہے اپنے عقیدے کی اور اپنے نکتہ نظر کی صلابت ہے لیکن شدت نہیں ہے، ان کی طبیعت شدت پسند نہیں تھی، انہوں نے اردو شاعری میں، نظم اور غزل دونوں اصناف میں اتنے پرشکوہ اضافے کئے ہیں کہ اس کا بہت ہی غیر جانبدارانہ اور غیر متعصبانہ مطالعہ ہی ہمیں فیض کی صحیح قدر و قیمت متعین کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہماری اردو شاعری کی ایک معین ڈکشن ہے، لفظیات ہیں، اس کی خاص علامتیں ہیں، خاص تشبیہیں ہیں، خاص استعارے ہیں خاص پیکر ہے، فیض صاحب نے





PIO (Islamabad)
Paragon

ان تمام الفاظ، علامتوں اور ان تمام پیکروں کو استعمال کیا ہے ان کے مفہوم ہی بدل دیے۔ قاتل کا مفہوم بدل گیا، زخم کا، بسمل کا، رسن و دار کا، اور ان معانیم میں اتنی وسعت پیدا ہو گئی کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ لفظ ان کے ہاتھ میں آ کر موم ہو جاتے ہیں۔

میاں ممتاز محمد خان دولتانہ | فیض صاحب کی اصل شہرت لوگوں کی نگاہ میں تو ان کی شاعری ہے اور یہ صحیح ہے۔ میں کوئی بڑا مفکر یا ادیب نہیں ہوں مگر مجھے ان چیزوں کا شوق ہے۔ میرے خیال میں اگر آپ بیسویں صدی کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیں اور پچھلی جنگ عظیم نے دو حصّوں میں تقسیم کر ہی دیا یعنی ۱۹۴۵ء سے پہلے اور ۱۹۴۵ء کے بعد، تو میں سمجھتا ہوں کہ ۱۹۴۵ء کے بعد دنیا بھر کے کسی ملک میں یا کسی زبان میں اس اہمیت کا اور اس کمال کا شاعر پیدا نہیں ہوا جو کہ فیض احمد فیض تھے۔

لوگ کہتے ہیں کہ فیض انقلابی تھے۔ اور صحیح کہتے ہیں فیض ایک انقلابی شخصیت تھے مگر جو بات سمجھنی چاہیے وہ یہ ہے کہ ان کے انقلاب کی، ان کے انقلابی ہونے کی ایک خاص حیثیت تھی، ان کا انقلاب کسی سے نفرت، کسی سے کدورت، کسی سے حسد کسی سے بغض، کسی سے عناد کی بنیاد پر نہیں تھا ان کے انقلاب کی بنیاد محبت تھی۔ بنی نوع آدم سے محبت، انسان کی عظمت سے محبت، انسان کی بے چارگی سے ہمدردی اور یہ خواہش کہ انسان کا جو اصل مقام ہونا چاہیے وہ اسے حاصل ہو، انقلابی ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی ایک اور خوبی بھی ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے اور وہ یہ کہ فیض سے زیادہ محب وطن شخص میں نے نہیں دیکھا۔ میں نے اپنی تمام زندگی تحریک پاکستان اور اس کے بعد اسے بنانے سنوارنے میں صرف کی ہے اس لئے میری حب الوطنی پر شک نہیں ہو سکتا اس لئے میں یہ کہوں گا کہ فیض میرے مقابلے میں کہیں زیادہ محب الوطن تھے وہ پاکستان کے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ پاکستان کے بغیر انہیں کہیں چین نہیں آتا تھا ان کی پوری شاعری اٹھا کر دیکھ لیجئے، اس میں آپ کو پاکستان سے اپنے وطن سے محبت نظر آئے گی کوئی سا ملک تھا جو بسند خیا بتا تھا کہ فیض وہاں کا شہری ہو مگر فیض نے اسے کبھی قبول نہ کیا انہیں صرف اور صرف اپنے وطن سے اپنے پاکستان سے محبت تھی، پاکستان جن بنیادوں پر قائم ہوا تھا فیض کو ان سے محبت تھی۔ فیض صاحب نے اپنے مجموعے "نقش فریادی" میں حکیم الامت علامہ اقبال کے متعلق کہا تھا کہ۔

آیا تھا اپنے شہر میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گزر گیا
اب دور جا چکا ہے وہ شاہ گدا نما
اب پھر سے اپنے دیس کی راہیں اداس ہیں

میں بھی فیض کے بارے میں انہی کی بات کہتا ہوں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ | فیض سے میرے تعلقات رہے ہیں ان تعلقات کی ابتدا اس زمانے میں ہوئی جب میں نے عربی کا ایم اے کیا اور دوسرے سال فیض صاحب اور خورشید انور دونوں عربی کے ایم اے میں داخل ہوئے اس کے بعد آج تک کبھی زیادہ اور کبھی کم ان سے ملاقات ہوتی رہی وہ بھی کم آمیز تھے اور میں بھی کم آمیز ہوں تو اس لحاظ سے سلسلہ ملاقات کا جاری رہا جہاں تک شاعری کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے شاعری کی ہیں شعرا کی تین نسلوں کو ایک جگہ جمع کیا غالب کو اور جدید شعرا کو، ان تینوں کا اسلوب بیان، ان کا ڈکشن فیض نے اپنایا اپنے انداز میں اور اپنے وقت میں اور سب کو اس طرح ملا کر دکھایا کہ ہر ایک نے یہ کہا کہ فیض ہمارا شاعر ہے، فیض ہمارا شاعر ہے

ڈاکٹر وحید قریشی | شاعروں میں جب فیض نے آنکھ کھولی ہے تو وہ زمانہ وہ تھا جب علامہ اقبال کا اثر معاشرے پہ چھایا ہوا تھا اور اس کے مقابلے میں کوئی آواز بھی زیادہ مضبوط نہیں تھی ایک رومانی شاعر کے طور پر انہوں نے آغاز کیا اور ایک مقصدی شاعر کے طور پر انہوں نے بعد میں شاعری کی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں جو روایت سرسیّد سے لے کر دورِ حاضر تک آئی ہے افادی ادب کی، اس میں فیض صاحب کا حصّہ ہے۔ اس اعتبار سے ہمارے ہاں فیض صاحب نے جس ادب کی اور جس شاعری کی بعد میں طرح ڈالی اس میں، میرا خیال ہے کہ فیض صاحب کا منفرد مقام ہے اس اعتبار سے کہ انہوں نے ہماری شاعری کو سیاد رجہ اور ایک نیا آہنگ عطا کیا اور یہ بھی بتایا کہ مقصدی شاعر جو بھی ہے وہ مقصد رکھتے ہوئے بھی، شاعری کے درجے سے کم نہیں ہوتی اس اعتبار سے میں سمجھتا ہوں کہ فیض کا نام اردو شاعری میں ہمیشہ زندہ رہے گا

ظہیر کاشمیری | شروع شروع میں فیض صاحب انگریزی رومانوی شاعروں سے بہت متاثر تھے اس زمانے میں ان کی مشہور نظمیں "میرے ندیم"، "مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ"، "تنہائی" ہوئی تھیں، جو استعارے، تلازمات استعمال کئے، ان میں ندرت تھی، اسلوب اپنا تھا اور وہ بالکل نئے انداز میں ایک بکھیر سحر رکھتے تھے۔

ظہیر کاشمیری | اس نام پر ورجہاں کی آواز میں فیض صاحب کی نظم "مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ" سنائی گئی،

فیض صاحب شاعروں کی اس صف سے تعلق رکھتے ہیں جن کا مطمع نظر آفاقی ہوتا ہے وہ لوگوں کے دکھ درد کے ترجمان ہوتے ہیں، ان کے آنسو پیاسوں کا خیال رکھتے ہیں اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ فیض صاحب نے جو تخلیق کاری کی ہے اس میں نیکی اور خیر کا عنصر بہت زیادہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ صرف اپنے فن کی وجہ سے اور اپنی فنی چابکدستی کی وجہ سے نادر تشبیہوں اور استعاروں کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ اعلیٰ خیالات کی وجہ سے اپنی فکر کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ وہ پاکستان میں سب قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ بلکہ عالمی سطح پر بھی ان کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔





آفتاب احمد خاں | بطور شاعر فیض صاحب کی یہ عجیب خصوصیت تھی کہ وہ اوّل و آخر شاعر تھے اگرچہ وہ زندگی کے بہت سے دوسرے شعبوں سے متعلق رہے، وہ بڑے صحافی تھے، انہوں نے ٹریڈ یونین ازم کی اور بہت سی باتیں کیں۔ آرٹس کونسلوں اور دوسرے اداروں کے سربراہ بھی رہے۔ ثقافت کے مشیر بھی رہے اور بڑی بڑی بین الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی بھی کی۔ یہ ان کی زندگی کا ایک پہلو ہے لیکن وہ اوّل و آخر بطور شاعری زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے شاعری میں ان کی خصوصیت اگر میں ایک لفظ میں بیان کرنا چاہوں تو وہ ہے ان کی ہیومنزم یعنی ان کی انسان دوستی، ان کو انسانوں سے، دلیس کے انسانوں سے، پردیس کے انسانوں سے محبت تھی انہیں اس کائنات سے محبت تھی وہ ایک زمانے کے شاعر نہیں تھے، بلکہ تین زمانوں کے شاعر تھے، ماضی سے ان کا تعلق یہ تھا کہ ہماری ادبی روایات، فارسی، اردو، عربی، یعنی ہماری مشرقی روایات کا بڑا تیز احساس ان کی رگوں میں سمایا ہوا تھا اس لئے آپ دیکھیں گے کہ ان کے ہاں کبھی میر کی گونج سنائی دیتی ہے، کبھی غالب کی گونج سنائی دیتی ہے، کبھی حافظ کی گونج سنائی دیتی ہے اقبال کی گونج سنائی دیتی ہے جسے انگریزی میں ایکوز (ECHOS) کہتے ہیں۔ تو ایک تو تعلق یہ تھا۔ غزل جسے عام طور پر فرسودہ صنف سخن کہا جاتا ہے، آخری دم تک فیض صاحب نے اسی کی صورت میں اشعار کہے انہوں نے غزل کو اس کی فرسودگی کو ایک نیا لہجہ دیا، ایک نیا نکھار بھی دیا

علی احمد خاں | فیض صاحب کا مقام بطور ایڈیٹر بڑا اہم تھا۔ وہ جب پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تو وہ پاکستانی صحافت کا ابتدائی دور تھا۔ اس میں ہماری قدریں بن رہی تھیں اور ہمارا صحافتی اسلوب اور انداز بن رہا تھا۔ فیض صاحب کی فکر کی بلندی اور متانت اور ان کے انداز کی سنجیدگی کی چھاپ اخبار پر پڑھنے اور دیکھنے والا محسوس کر سکتا تھا کہ پاکستان ٹائمز ایک نہایت سنجیدہ اور معقول اخبار ہے جس سے آپ سیاسی طور پر یا کسی اور طور پر اختلاف کر سکتے ہیں لیکن اسے پڑھ کر آپ اس حد تک متاثر بھی ہوں گے اور کہیں پیش کئے گئے نقطۂ نظر کو آپ غیر اہم نہیں سمجھیں گے تو ہماری صحافت کے اس ابتدائی دور میں فیض صاحب نے ہماری صحافت کو بہت کچھ دیا۔

بانو قدسیہ | فیض صاحب سے میں ان کی شاعری کی وجہ سے متعارف ہوئی لیکن بعد میں مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق بھی ہوا۔ ۱۹۶۷ء یا ۱۹۶۸ء کا واقعہ ہے کہ پاکستان میں یہ جاننے کے لئے ایک سروے کیا جائے کہ آرٹسٹ لوگ کیوں بدحال، تنگ دست اور معلوک الحال ہیں۔ لاہور کے آرٹسٹ ایک آندھی سی گونگی سی تحریک چلا رہے تھے کہ آرٹسٹوں کے لئے کچھ کرنا چاہیے۔ ان کے لئے مکانات ہونے چاہئیں ان کے لئے سر ڈھانپنے کے لئے کوئی جگہ ہونی چاہیے۔ ان کی بیماری کے وقت ان کی مدد ہونی چاہیے۔ تو فیض صاحب اس سلسلے میں دو تین بار لاہور تشریف لائے۔ پھر اپنی رپورٹ بنا کر اسلام آباد چلے گئے ہمارا خیال تھا کہ فیض صاحب اس سلسلے میں کچھ نہیں کریں گے۔ لیکن بہت جلد حکومت نے ایک سٹینڈنگ کمیٹی تیار کی جس کے فیض صاحب صدر تھے مجھے بھی ان کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا ہم لاہور گئے، لاہور سے حیدر آباد گئے، کراچی گئے، پشاور گئے، چٹاگانگ گئے، ڈھاکہ گئے اور تمام آرٹسٹوں پر، ان کے مسائل پہ ایک رپورٹ مرتب کی جو فیض صاحب نے بنائی تھی اس دوران میں فیض صاحب کی ایک سب سے بڑی خوبی جو مجھ پر کھلی وہ یہ تھی کہ وہ آپ کے ساتھ اتفاق نہیں کر رہے تھے پھر بھی آپ کی بات سن لیتے تھے اور مباحثے یا مناظرے کی شکل کبھی پیدا نہیں کر سکتے۔ آپ کو وہ اتنی اجازت ضرور دیتے تھے کہ جو کچھ آپ کے دل میں ہے وہ صاف صاف طور پر ان سے ڈسکس کیا جائے آج کے زمانے میں جب دیکھتی ہوں کہ اتفاق رائے کرنے والے لوگ ایک دوسرے سے اونچی اونچی لو لیتے ہیں اور اتنے استدلال اور اتنے مباحثے کرتے ہیں کہ یوں لگتا ہے جیسے یہ ایک دوسرے سے اتفاق نہیں کر رہے جھگڑا کر رہے فیض کے ساتھ ایسی کیفیت کبھی پیش نہیں آئی جب رپورٹ فیض صاحب نے لکھی تو میرا خیال تھا کہ فیض صاحب تمام باتیں نہیں لکھیں گے جو ہم نے ان سے اتفاق رائے نہ کرتے ہوئے کہی تھیں لیکن ان کی رپورٹ میں وہ تمام مسائل موجود تھے جن کی طرف ہم نے بڑی گرمجوشی سے اور بڑے استدلال کے ساتھ ان کے سامنے پیش کئے تھے وہ سبق آج تک میں یاد رکھتی ہوں اور جب اتفاق رائے ہو یا نہ ہو کسی سے تب بھی اس بات کو یاد رکھتی ہوں کہ فیض صاحب کی طرح ہمیں بات سننے کا ذوق ضرور پیدا کرنا چاہیئے۔

علی امام | میں فیض صاحب کے متعلق جو بات کرنا چاہتا ہوں اس کی ایک اہمیت ہے جس کی وجہ سے فیض صاحب کی فکر کا دائرہ بہت بلند اور وسیع ہو گیا وہ دنیا کے ان عظیم لوگوں کی طرح سوچتے تھے جن میں آندرے مارلو، آندرے ژیدا پولو شامل ہیں اور جن کا کام صرف ادب تخلیق کرنا اور شاعری کرنا ہی نہیں تھا بلکہ انہیں دوسرے فنون پر بھی مہارت حاصل تھی اور ان فنون کو اپنے آپ میں یوں سمو دیا تھا کہ اس کی وجہ سے ان کے سوچنے کا انداز، بیان کرنے کا انداز اور دنیا کی عکاسی کرنے کا انداز وہ رخ اختیار کر گیا تھا کہ جس سے یونیورسل پہلو اجاگر ہوتا تھا۔ جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں اس بات کی بڑی کمی ہے کہ جو موسیقار ہیں وہ صرف موسیقار ہی رہتے ہیں شاعر صرف شاعری کرتے ہیں۔ نقاد صرف تنقید لکھتے ہیں۔ حالانکہ زندگی کے پہلو مختلف ہوتے ہیں فیض صاحب نے ان تمام فنون کو نچوڑ کر ان کا رس اپنی ذات میں سمو لیا تھا اور پھر اپنی شخصیت کا وہ عنصر سامنے لائے جو یونیورسل اختیار کر گیا میں سمجھتا ہوں کہ فیض صاحب کی اس خوبی کو ہمارے موسیقار، شاعر اور آرٹسٹ بھی اپنائیں ایک دوسرے سے ملیں، ایک دوسرے کے اثرات لے کر اپنے فن کو ایسی سطح پہ پہنچائیں کہ جس سے ہمارے ملک میں ادب، ثقافت اور دوسرے فنون فروغ پائیں

Swiss Miss

Lipsticks
with matching
Nail Polishes

سوئس مس

لپ اسٹک اور نیل پالش



Over 100 matching shades

جس طرح سوئس مس
لپ اسٹک اور نیل پالش
ذاتی استعمال کے
لئے لاجواب ہیں
اسی طرح تحفہ تحائف دینے
کے لئے بھی بے مثال ہیں

ADMIRAL OF NEW YORK

10/82



میاں عارف افتخار ہمارے اخبارات یعنی پاکستان ٹائمز، امروز اور لیل و نہار جب نکلنا شروع ہوئے تو فیض صاحب ہی ان کے ایڈیٹر انچیف بنائے گئے۔ فیض صاحب نے اپنی دورِ ادارت میں کبھی کسی کو حتیٰ کہ میرے والد کو جو سیاستدان تھے، قومی اسمبلی کے رکن تھے اور ان اخبارات کے مالک تھے، بلاوجہ اخبارات میں تشہیر نہیں دی۔ انہیں مکمل آزادی تھی کہ وہ اپنے نظریہ کے مطابق انتہائی دیانتداری کے ساتھ اپنی بات کہیں، ایک دفعہ یہ ہوا کہ میاں افتخار الدین کراچی سے لاہور آئے اسمبلی کے اجلاس کے بعد وہ پاکستان ٹائمز کے دفتر گئے تمام ساتھیوں سے گپ شپ ہوئی میاں صاحب نے پوچھا کہ بار ایک بات سنا دو کہ ڈان، مارننگ نیوز اور دوسرے اخبارات تو میری پوری تقریریں چھاپ دیتے ہیں اور کبھی کبھی فرنٹ پیج لگا دیتے ہیں لیکن آپ لوگ یہ کبھی نہیں کرتے۔ تو فیض صاحب نے اپنے خاص مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ "جب آپ کوئی ایسی اہم بات کریں گے تو آپ کو بھی موقعہ ملے گا"۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا عقیدہ اتنا پختہ ہو اور اپنے اس عقیدے کو صرف ایک ملک کے لوگوں تک ہی نہ رکھے بلکہ افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ کے عوام کی جدوجہد کی حمایت میں اسے پیش کرے اور اس پر چٹان کی طرح ڈٹا رہے فیض صاحب نے فلسطین کی حمایت میں جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت کے خلاف بلکہ ہر جگہ حق کا علم بلند کیا۔

ڈاکٹر ایوب مرزا مجھے ولایت سے، جہاں میں ڈاکٹر تھا، وطن واپس لانے والے فیض تھے۔ وہاں ایک ملاقات میں مجھے انہوں نے کہا کہ "تمہارا ملک تمہیں واپس بلاتا ہے، تمہارے عوام واپس بلاتے ہیں، تم یہاں عیش کی زندگی گزار رہے ہو تم وقت ضائع کر رہے ہو، اپنے ملک سے اور اپنے عوام سے بڑا ملک اور عوام نہیں ہو سکتے آدمی اس ملک اور ان لوگوں کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے جہاں کا وہ ہو اور جن میں سے ہو" انہوں نے مجھے فوراً واپس جانے کے لئے کہا، میں نے ان کے کہنے پر اپنا بوریا باندھا اور پاکستان لوٹ آیا۔ انہوں نے مجھے جو راستہ دکھایا تھا میں اس کے لئے ان کا مشکور رہوں جہاں تک ان کی عظمت اور شاعری کا تعلق ہے تو میں عرض کروں گا کہ میں اپنے بیرونِ ملک قیام کے دوران بے شمار پروفیسروں سیاست دانوں اور بلند پایہ شاعروں اور ادیبوں سے ملا ہوں جن میں جیری برنارڈ پروفیسر فرتز، رالف رسل شامل ہیں، ان سب کا کہنا تھا کہ انہوں نے زندگی میں ایسا دانشور اور شاعر نہیں دیکھا کہ جس سے دوست اور دشمن ایک جیسی محبت کرتے ہوں اور اس کی عظمت میں یقین رکھتے ہوں۔

ظہیر بابر فیض صاحب گوناں گوں شخصیت کے مالک تھے سب سے پہلے وہ شاعر تھے شاعری ان کے مزاج میں اس طرح رچی بسی تھی کہ وہ خود بھی ایک خوبصورت شعر معلوم ہوتے تھے۔ شاعر ہونے کے علاوہ وہ صاحب نظر نقاد مفکر، تاریخ و تہذیب کے شارح، محترم استاد، خوش گفتار مقرر اور ایک بلند پایہ صحافی بھی تھے وہ ایک بحرانی دور میں قومی صحافت کو انہوں نے ایک معیار، متانت اور سنجیدگی سکھائی اور موضوعات و معاملات کا تجزیہ کرنے کا درس دیا سب سے بڑھ کر صحافت کو انسان اور انسانیت کی خدمت کرنے کا فرض بنایا۔

احمد راہی میں سمجھتا ہوں کہ فیض صاحب کی شاعری اور شخصیت بالکل ایک ہی چیز تھی وہ جو تھے وہی ان کے شعر میں آتا تھا وہ بہت اچھے شاعر تھے سچائی تھی ان کی شاعری میں فیض صاحب نظریاتی شاعر تھے۔ نظریاتی شاعری عام طور پر سطحی اور کھوکھلی ہو جاتی ہے مگر فیض صاحب کا نظریہ چونکہ ان کے خون میں رچا ہوا تھا بناوٹی نہیں تھا، دکھاوے کا نظریہ نہیں تھا اس لئے ان کی شاعری میں گہرائی تھی اور اس میں بے پناہ جذبات تھے۔

پروگرام کے درمیان میں فیض صاحب کے انٹرویو کا ایک مختصر سا حصہ وہ بھی دکھایا گیا جس میں انہوں نے پاکستان کلچر پر بڑی تفصیلی گفتگو کی تھی مگر یہ حصہ اتنا مختصر تھا کہ ایک بھی بات مکمل نہ ہو سکی۔

فیض احمد فیض ...... جب پاکستانی کلچر کو فروغ دینا ہے تو وہ ہم ایسے بیٹھ کر یہاں فروغ دے لیں گے۔ لیکن اس کے لئے آپ کو اپنے ماضی کو فروغ دینا ہوگا، اس میں جو خرابیاں ہیں وہ دور کیجئے تو اس کے بعد کلچر میں جو خرابیاں ہیں، اس میں جو پریشان خیالی ہے، وہ خود ہی دور ہو جائیں گی۔ لیکن فنون کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اس سے ذرا مختلف ہے۔ شعوری طور پر آپ اس کی صورتیں بھی متعین کر سکتے ہیں اور اسے فروغ بھی دے سکتے ہیں ......"

پروگرام کے آخر میں مہدی حسن کی آواز میں فیض صاحب کی یہ غزل سنائی گئی۔

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

پروگرام میں مادام نورجہاں، مہدی حسن، فریدہ خانم اور نیرہ نور کی گائی ہوئی فیض صاحب کی ادھوری غزلیں سنائی گئیں۔

••••••——


ایک عورت کی جلد کس حد تک تکلیف برداشت کر سکتی ہے ؟
WAX
شیونگ غیر نسوانی طریقہ ہے۔ جلد کو بدنما کرتا ہے۔ بالوں کی نمو میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔
ویکسنگ کا نتیجہ درد اور تکلیف۔ بالوں کو کھینچ کر نکالنے سے جلد ڈھیل پڑ جاتی ہے۔
تھریڈنگ تکلیف دہ ہے اور بال نوچنے سے جلد کو نقصان بھی پہنچتا ہے۔
غیر ضروری بالوں کو صاف کرنے کا نسوانی انداز۔ این فرینچ
خواتین کی نازک جلد کو نرم برتاؤ کی ضرورت ہوتی ہے اور این فرینچ نرمی کے ساتھ جلد کو صاف و ملائم کر دیتی ہے۔
پُر اثر این فرینچ جلد کی تہہ تک پہنچ کر بالوں کو نفاست سے صاف کرتی ہے۔
این فرینچ کا استعمال نہایت آسان ہے کریم لگا کر کچھ دیر انتظار کیجیے اور پھر صاف کر دیجیے۔
Anne French creams away hair
FACIAL QUALITY Anne French lotion
Anne French cream hair remover
CREAMS AWAY HAIR FROM FACE LEGS ARMS AND UNDERARMS
25 gms
تین خوشبوؤں میں دستیاب۔
گلاب۔ لیمن۔ ہربل۔

نیشنل بینک
آف
پاکستان

کے

نفع ونقصان کے کھاتوں میں
جمع شدہ امانتوں کا استعمال
محفوظ اور منفعت بخش ہے

نیشنل بینک کے شراکتی کھاتوں پر منافع کی شرح میں
ہمیشہ استحکام رہا ہے۔

نفع ونقصان میں شرکت کے بچت کھاتوں نیز میعادی کھاتوں پر منافع کی شرح بابت جنوری تا جون ۸۴ء (فیصد سالانہ)						
بچت کھاتہ	میعاد ۶ ماہ	میعاد ایک سال	میعاد ۲ سال	میعاد ۳ سال	میعاد ۴ سال	میعاد ۵ سال
۷٫۵۰ فیصد سالانہ	۹٫۵۰	۱۰٫۵۰	۱۱٫۰۰	۱۱٫۷۵	۱۲٫۵۰	۱۳٫۵۰

عام بچت کھاتوں کے برعکس شراکتی کھاتوں پر ۱۰ فیصد
ٹیکس بھی عائد نہیں ہوتا۔

نیشنل بینک آف پاکستان قومی ترقی قومی بینک

Monthly "OMANG" Karachi NO:S. 5255
69/5-D, Nursery PECHS Karachi - 29